ستمبر 2023 قیمت ₹15

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

Azadi Ka Amrit Mahotsav

G20 भारत 2023 INDIA

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا چشمہ ہے

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

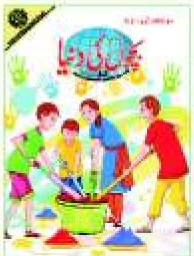

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات

نحویات کیا ہے؟ — سید یحییٰ نشیط 7

وبائیں اور اردو ادب — رئیس انور 12

ہندوستان میں نسائی نظم کے متنوع موضوعات — سفینہ بیگم 15

'خواب باقی ہیں' ایک تجزیاتی مطالعہ — سید وجاہت مظہر 18

پت جھڑ کی آواز — معراج احمد معراج 22

ادبی متن کی قرأت اور غزل کے تفہیمی مسائل — محمد ریحان 24

تدوین متن میں قرأت کے مسائل — عبدالباری 27

زبان و تعلیم

اختراعی تدریس و اکتساب — فرحت علی 31

لعل و گہر

آسمان ادب کا روشن ستارہ گیان چند جین — ایم اے کنول جعفری 33

مخطوطہ شناس: محی الدین قادری زور — محمد اکمل شاداب 35

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی حیات و ادبی خدمات — ندیم احمد انصاری 38

مظفر صدیقی — محمد شاہد پٹھان 41

منوہن تلخ اور یاس یگانہ چنگیزی — فیضان الحق 43

یاد رفتگاں

اعظم اثر کی غزل گوئی — مقبول احمد مقبول 48

احمد حسن دانش — نعمان قیصر 50

'میلان کنڈیرا' — اویس احمد 53

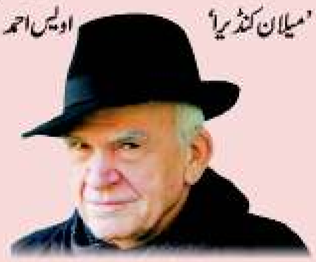

عربی ادبیات

عربی ادب میں سفرنامہ نگاری کی روایت — ثمامہ فیصل 56

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے متاثر کیا — ہما کوثر 58

زبان اور زمینی صورت حال

زبانوں کے نصاب میں سائنسی علوم وفنون کی شمولیت ضروری ہے — افتخار احمد 60

یادیں باتیں

عرفان صدیقی: کچھ یادیں کچھ باتیں — شعیب نظام 62

نیا آسماں نئے ستارے

مابعد جدیدیت اور اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا — پیرزادہ محمد زاہد 67

منفرد لب ولہجے کا شاعر: شجاع خاور — صدام حسین مضطر 70

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ 74

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:9، ستمبر 2023

مدیر : پروفیسر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر : عبدالباری

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے   سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون:040-24415194

ہماری بات

جانچ اور پرکھ کے عمل کو تنقید سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگر یہ کام ادب میں ہو تو اسے ادبی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ ادبی تنقید سے مراد ادبی شہ پاروں کو جانچ کر ان کے معائب و محاسن کی نشاندہی کر کے ان کا درجہ متعین کرنا ہے۔ ادیب و شاعر جب سے تخلیق کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے اسی وقت سے تنقیدی عمل کی بھی شروعات ہو جاتی ہے۔ ہر شاعر و ادیب اور تخلیق کار کا اپنا نظریہ ہوتا ہے اسی نظریہ کے تحت وہ فن پارہ کو پرکھتا ہے اور حذف و اضافہ اور قطع و برید سے کام لیتا ہے، جب تخلیق کار فن پارے کو مکمل کر لیتا ہے تو لوگ اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اس فن پارے سے استفادہ کرتے ہیں اور اس پر اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔

تنقید ادب کے لیے ضروری ہے تخلیق کار کی تنقیدی بصیرت جس قدر ہوگی اسی قدر اس کا ادب پارہ مستحکم و مضبوط ہوگا۔ معلوم ہوا کہ تنقید اور تخلیق دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جس طرح تخلیق کار کے لیے مطالعہ و مشاہدہ کی وسعت بے حد ضروری ہے اسی طرح تنقید نگار کے لیے بھی ضروری ہے۔

تنقید کو ادب کا علم اور فلسفہ کہا جاتا ہے، جب بھی معاشی، معاشرتی اور سماجی سطح پر کچھ تبدیلی ہوتی ہے اس کے واضح اثرات ادب میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادب اور زندگی دونوں میں فطری طور پر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ تنقید کی بنیاد چوں کہ ادب پر ہے اس لیے وہ بھی کبھی کسی ایک نظریے کے تابع اور ماتحت نہیں رہتی۔ ہمیشہ زمانے کی ترقی اور منظرنامے کی تبدیلی کے ساتھ نئے نئے تنقیدی نظریات سامنے آتے رہتے ہیں۔

اردو زبان میں باضابطہ تنقید کی شروعات الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہوئی، وہاں ہمیں مشرقی اور مغربی دونوں نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں، اس کے بعد اردو تنقید نے رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، جمالیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات، تشکیل، رد تشکیل، نوآبادیات اور پس نوآبادیات وغیرہ تحریکات و رجحانات کے اثرات کو قبول کیا۔

اگر ہم ان رجحانات و نظریات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں جتنے بھی نظریات و رجحانات متعارف ہوئے۔ ان میں سے بیشتر یا کہہ لیجیے تقریباً سبھی مغرب سے ہی آئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے لوگ نئی تھیوری اور نئی جہات تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں اور ہمارے یہاں جمود و تعطل ہے یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں نئے تنقیدی زاویے اور جہات کی جستجو و دریافت پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ اس پر ہمیں توجہ دینے کی ضرورت ہے، اسی طرح ہمیں ان نظریات کی معنویت و مقصدیت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے طرز معاشرت اور طریقہ بود و باش میں بھی تبدیلی آئی ہے تو ادب میں کتنی اور کس طرح کی تبدیلیاں ہوئیں یہ بھی قابل غور ہے۔

آج اردو کے ادارے پہلے سے زیادہ ہیں، جامعات میں پہلے سے زیادہ تحقیقی کام ہو رہے ہیں، اگر ہم نمائندہ یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو کا ہی جائزہ لیں تو پی ایچ ڈی کی کئی سو ڈگریاں اور سندیں تفویض کی جاتی ہیں، مگر ان میں سے کتنے اسکالرز نے ادب کو نئی جہت یا نیا نظریہ دیا۔ یہ سوچنا چاہیے۔

آج ادب اور تنقید کے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے تقریباً سبھی صدائے بازگشت یا پرانے نظریات و افکار کا اعادہ و تکرار ہے۔

جب کہ ہماری تنقید میں علمیت اور باخبری کا عنصر عام ہونا چاہیے جس کے لیے غیر معمولی محنت، مطالعہ و مشاہدہ کی قوت و گیرائی اور ذہنی و فکری وسعت و بیداری کی ضرورت ہے۔ بنے بنائے اصولوں کو دہرانے اور مغربی تنقیدی نظریات کو مشرقی فن پاروں پر منطبق کرنے کے بجائے انھیں ان کے اصل تناظر میں دیکھنا چاہیے اور اسی کی روشنی میں فن پاروں کو پرکھنا چاہیے، تبھی ہماری تنقید ہماری تخلیقات کے ساتھ انصاف کر سکتی ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنہیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

☜ ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست 2023 کا شمارہ دستیاب ہوا۔ مدیر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور نائب مدیر محترم عبدالباری نے اس رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔

رسالے کا سرورق 'بھارت پیارا دیش ہمارا' کے حوالے سے بے حد خوش رنگ اور خوبصورت ہے جس میں بہت سادگی کے ساتھ جشن آزادی کا پیغام قارئین تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'لعل و گہر' کالم میں 'پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب' کا مضمون 'علامہ سحر عشق آبادی' میرٹھ کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ جشن آزادی کے کالم میں 'محترم عبدالسلام صاحب' کا مضمون 'مسلم رہنماؤں کا کردار' بے حد دلچسپ اور معلوماتی لگا۔ اس شمارے کے بقیہ مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں رسالے کی عمدہ ترتیب کے لیے ادارتی عملے کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

سیدہ مریم الٰہی: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، یوپی

☜ ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی 2023 ملا۔ ماشاء اللہ ایک سو صفحات کے اس رسالے میں آپ سیکڑوں صفحات کا مواد پیش کرتے ہیں۔ آرٹ پیپر پر شائع ہونے والا یہ رسالہ صرف پندرہ روپے میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ جناب خلیق الزماں نصرت کی تگ و دو قابلِ داد ہے کہ وہ مشہور و معروف اشعار کو ان کے حقیقی شاعروں سے منسوب کرنے کے جتن کرتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں درآئے اشعار کا جائزہ بڑی محنت سے لیا گیا ہے۔

واجد علی شاہ کی زندگی میں شائع ہونے والے ان کے دیوان 'سخنِ اشرف' کو جناب نیر مسعود نے 2006 میں دوبارہ شائع کیا۔ یہاں عرض کرنا یہ ہے کہ سخن اشرف تاریخی نام ہے جس سے 1281ھ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

ارشاد سیانوی نے اردو نثر کا ارتقا بڑی محنت سے تو لکھا ہے مگر لگتا ہے بعض حقائق تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ انھوں نے لکھا کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف خواجہ گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے دیگر تصانیف میں شکارنامہ، ہدایت نامہ وغیرہ۔ حالانکہ پچاس سال پہلے ڈاکٹر حفیظ قتیل (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی) نے یہ انکشاف کیا کہ معراج العاشقین کا خواجہ گیسو دراز سے کوئی تعلق نہیں ان کے دو سو برس بعد یہ لکھی گئی تھی اور اس کے مصنف مخدوم شاہ حسینی ہیں جن کا تعلق کرناٹک کے ضلع رائچور کے قصبے اگالور سے تھا۔ بنگلور یونیورسٹی کے پروفیسر م ن سعید کی تحقیقی کتاب 'حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل' سے ثابت ہو چکا ہے کہ خواجہ گیسو دراز نے اردو میں کوئی کتاب ہی نہیں لکھی۔ مزے کی بات یہ کہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے خواجہ گیسو دراز سے منسوب شکارنامہ مرتب کیا جو جموں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھا جسے گیان چند جین پڑھایا بھی کرتے تھے۔ حالانکہ یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ نہ معراج العاشقین نہ شکارنامہ نہ کوئی اور کتاب خواجہ گیسو دراز کی تصنیف ہے۔ نئے مضمون نگاروں کو ان ساری تحقیقات سے باخبر ہونا چاہیے۔ تب قلم اٹھانا چاہیے۔

انجمن ترقی اردو ہند کرناٹک نے چھے اور سات اگست 2022 کو بنگلور میں ایک سمینار 'جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا، ارتقا اور مسائل' کے عنوان سے منعقد کیا جس کا کلیدی خطبہ پروفیسر م ن سعید نے دیا تھا جس میں انھوں نے دوٹوک انداز میں لکھا کہ خواجہ گیسو دراز کی وفات 1421 میں ہوئی اُن سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے امیر خسرو (1253-1325) نے دہلی میں اردو میں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، انملیاں، اور ایک مصرع فارسی دوسرا مصرع دکنی اردو والی غزلیں لکھ چکے تھے۔ ہزار بات کی ایک بات کہ خواجہ گیسو دراز نے اردو میں کوئی کتاب ہی نہیں لکھی۔

ڈاکٹر رؤف خیر: موتی محل، گولکنڈا، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل: 9440945645

☜ جولائی کے شمارے میں جناب خلیق الزماں نصرت نے 'فرہنگِ آصفیہ' میں درج متعدد اشعار کے اغلاط کی خط کشی کی ہے۔ ان کی مشہور و معروف تحقیقی کتاب 'برمحل اشعار

اور ان کے ماخذ سنہ 2011 میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہوئی تھی۔

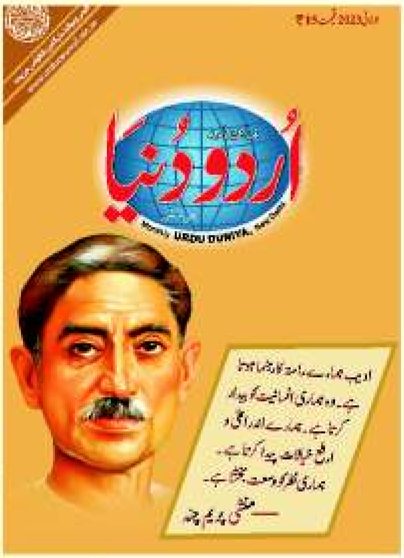

مضمون میں خلیق الزماں نصرت کی اول الذکر کتاب کے پشت والے سرورق پر ایک لفظ کی غلطی کی جانب میں نے توجہ دلائی تھی عربی زبان کا ایک مذکر لفظ ہے 'ماخذ'، جس کا معنی ہے، وہ جگہ یا کتاب وغیرہ، جہاں سے کوئی حوالہ لیا گیا ہے۔ پشت والے سرورق پر انگریزی میں Makhiz لفظ چھپا تھا، جبکہ صحیح املا Makhaz ہے۔ اس کے بعد تمام ایڈیشنوں میں یہی غلطی شائع ہوتی رہی ہے۔ کتاب میں بھی صفحہ 258 پر وائے نادانی...' والے شعر کے شاعر کا نام درد درج کیا گیا تھا، لیکن صفحہ 261 پر اس کے شاعر کا نام سودا ہی چھپتا رہا ہے۔

اسی طرح جناب اٹل بہاری واجپئی کے شعر کا دوم مصرعہ 'نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے لیے' شائع ہوا تھا، جب کہ صحیح مصرعہ ہے۔ 'نہ اُدھر کے رہے۔' اس مضمون میں صفحہ 9 پر اقبال کے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'بات بھی کوئی ('گئی' لفظ درکار تھا) التجا کر کے۔'' سید محمد خان رند کا یہ شعر ہونے کی تحقیق خلیق الزماں نصرت نے صحیح کی ہے اور متعدد اشعار کی بابت ان کا ردِ عمل مناسب ہے۔

اس شمارے کے دیگر مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ جریدے کا معیار بلند ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ اردو دنیا باصرہ نواز ہوا۔ اردو ادب کی دنیا کا درخشندہ رسالہ عمدہ و معیاری مشمولات سے مزین ہے اس پر آپ کا اداریہ عجب لطف دے رہا ہے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ووَمنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................. بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

سید یحییٰ نشیط

نحویات کیا ہے؟

انسان کو حیوان ناطق کہا گیا ہے۔ یعنی اسے قوت گویائی بخشی گئی۔ وہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنے کے لیے زبان کو بطور آلہ (Tool) استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ زبان انسانی تہذیب کے دور اول میں صرف اشاروں اور آوازوں کا باربط و بامعنی مجموعہ تھی۔ رفتہ رفتہ اشاروں کے بغیر آواز الفاظ میں ڈھلی اور اسے معنی کا ملبوس عطا ہوا۔ پھر ان بامعنی الفاظ سے جملے بنے اور زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا۔ اس طرح آواز (صوت) کی نمو سے جملے (تکمیل خیال) کی وسعت تک زبان کے ادراکِ معنی کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ زبان کے ماہرین نے زبان کے اس موضوع کو علم کا درجہ دیا اور تحلیل و تجزیے اور اصول وضوابط کے سہارے علم زبان کی مختلف شاخیں وجود میں آئیں۔ ان میں لسانیات (Linguistic) اور قواعد (Grammer) دو اہم شاخیں ہیں۔ لسانیات کی ایک شاخ علم الصوت (صوتیات۔ Phonology) بھی ہے۔ اس کے ذریعے منہ سے نکلنے والی آوازوں کے مخارج اور دہن کے مستعمل اجزائے نطق پر غور کیا جاتا ہے۔ یہاں آواز کی معنویت پر توجہ نہیں دی جاتی۔ قواعد کی ابتدا تفہیم لفظ سے ہوتی ہے۔ اس میں آواز کے بامعنی ٹکڑوں پر غور کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ صرف الفاظ کی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اسے علم الصرف (صرفیات۔ Morphology) کہتے ہیں۔ قواعد کی دوسری شاخ علم النحو (نحویات۔ syntactic) ہے۔ اس میں بامعنی الفاظ، ان کے جوڑ سے بنے فقرے اور جملے کی ساخت نیز ان کے معنویاتی نظام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

قواعد میں زبان کو تشکیل دینے والی آوازوں کے جوڑ سے بنے بامعنی الفاظ کی جملوی نشست کے اصول وضوابط طے کیے جاتے ہیں۔

نحویات کیا ہے؟

کسی بھی تحریری یا تکلمی زبان کی قواعد کا خاص مقصد اس کے لسانی اظہار کی مکمل اکائی یعنی جملے کی معنوی وضاحت ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے لیے جملے کی بامعنی اکائیاں (الفاظ) جنھیں قواعد میں اجزائے کلام کہا جاتا ہے، ان کا صرف استعمال ہی نہیں ان کے باہمی انسلاکات کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اجزائے کلام کی بحث صرف کہلاتی ہے اور اس کے علم کو صرفیات کہا جاتا ہے۔ ان اجزائے کلام کی جملے میں محل اوقاف کے مطابق صحیح بامعنی خطی Linear ترتیبی نشست، دیگر صرفی اجزا سے ان کی ہم رشتگی یا انسلاک اور ان کے تعاون سے تشکیل پانے والے بامعنی جملے کی ہیئت رساخت کا تجزیہ نحو کا موضوع ہوتا ہے۔ نحو کے اس علم کو نحویات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جملے میں الفاظ کا باہم تعلق سمجھنے کے لیے ان کا باہمی ربط، تنظیم اور ترکیب کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

(الف) باہمی ربط: باہمی ربط سے مراد جملے میں جنس (تذکیر وتانیث) تعداد (واحد، جمع) صیغۂ شخصی (متکلم، حاضر، غائب) اور زمانہ (ماضی، حال، مستقبل) کے اظہار کے لیے فعل اور فاعل میں مطابقت کا پایا جانا ہے۔ مثلاً ''چھوٹا لڑکا ضد کر رہا ہے''۔ 'چھوٹا' اس لفظ کا ربط 'لڑکے' کی جنس اور تعداد سے ہے نیز 'رو رہا ہے' یہ فقرہ لڑکے کی جنس، تعداد، صیغۂ شخصی اور زمانے کا مظہر ہے۔ چھوٹی لڑکی ضد کر رہی ہے۔ چھوٹے لڑکے ضد کر رہے ہیں۔ لڑکا ضد کرے گا۔ لڑکے نے ضد کی۔ ان مثالوں میں فاعل (لڑکا) اور فعل (ضد کرنا) کے صرفیوں میں جنس، تعداد اور زمانے کے مطابق فعلی توافق پایا جاتا ہے۔ یعنی 'لڑکا (ضد) کر رہا ہے' میں فاعل کا صرفیہ 'ا' ہے تو فعل کا صرفیہ بھی 'ا' ہی ہوگا۔ اگر فاعل کا صرفیہ 'ی' ہے تو فعل کا صرفیہ بھی 'ی' ہی ہوگا۔ اسے ہی فعلی توافق کہا جاتا ہے۔ یہ توافق، ربط کلام کی بامعنی اکائی کی لسانی ساخت سے لے کر جملے کے تمام تر ساختی تعملات کے منسلکات اور ان کی جزئیات میں پایا جاتا ہے۔ نحویات ان روابط کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نثر میں اجزائے کلام کا مربوط رشتہ تلاش کرتے وقت لے و آہنگ اور سر تال پر توجہ نہیں دی جاتی لیکن شاعری میں الفاظ کے مرکباتی روابط میں ان باریکیوں کا بالخصوص خیال رکھا جاتا ہے ورنہ شعر، عروضی قواعد سے ہٹ جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعری نحویات میں عروضی نکات پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ ذیل میں اردو اشعار میں استعمال ہوئے چند نحوی مرکبات کا شعری (عروضی) ضابطوں کے تابع ہونا واضح کیا گیا ہے۔

ع: سردیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک (سردی ءِ حنا)
ع: کرے گر عرض سنگینیِ کہسار اپنی بے تابی (سنگینی ءِ کہسار)
ع: سرخیِ رنگ رخ سے چمک اور بڑھ گئی (سرخی ءِ رنگ)

یہاں تینوں مصارع کے مرکبات کا تجزیہ قوسین میں کر دیا گیا ہے۔ ان تینوں الفاظ کے مضاف رموصوف (سردی، سنگینی اور سرخی) کے آخری حروف یائے مجہول ہیں۔ نثر میں ان کی اضافی ترکیب بالترتیب سردیِ حنا، سنگینیِ کہسار اور سرخیِ رنگ زیرِ اضافت

کے ساتھ درست سمجھی جاتی ہے لیکن اشعار میں ان مرکبات کا غیر مشدد استعمال کر دیا جائے تو شعر بحر سے خارج ہو جائے گا کیونکہ یہ تینوں مضاف (سروِ، سرّی اور سکینی) بلا تشدید، اوزان عروض کا حق ادا نہیں کر سکتے۔اس لیے شعری نحویات میں مذکورہ مرکبات کو مندرجۂ بالا مثالوں کے مطابق مشدد کرنا لازمی و لابدی ہوتا ہے۔ غالب نے اس ضمن میں تفتہ کو لکھے اپنے خط میں کہا تھا:

''یادر کھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے:

جزوِکلمہ: (مصرع) ہمائے برسر مرغاں ازآں شرف دارد

(مصرع) اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشای را

دوسری تحتانی مضاف ہے۔صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم

تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی، جیسے 'آشنائی' یہاں ہمزہ ضرور بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور

یائے توحیدی: جیسے: 'آشنائے' یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہاؤ گے۔

نحوی ترکیب کے مطالعے کے دوران جملے کے اجزائے متصلہ (Immediate Constituents) پر غور کیا جاتا ہے،یعنی ایک جملے میں کتنے جزو ایک دوسرے سے متصل ہیں،ان اجزائے متصلہ سے ترکیب بنتی ہے اور ایک بامعنی جملہ وجود میں آتا ہے۔

(غالب [مرتبہ: خلیق انجم] 'غالب کے خطوط' غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1993، جلد اول: ص 247)

غالب نے یائے تحتانی کو ان تین طرح سے لکھنے کی سفارش کی ہے وہاں اپنے اشعار میں یائے معروف سے بنی اضافت کو مشدد بھی کیا ہے۔اوپر کے اشعار میں یائے مشدد کی مثالیں دی جا چکی ہیں۔ظاہر ہے کہ اس نوع کے مرکبات، جن کا تعلق نحو سے ہے عروضی ضوابط کی پابندی کی وجہ سے شعری نحویات کا حصہ بھی بن جاتے ہیں۔صفت۔ موصوف، مضاف۔مضاف الیہ وغیرہ جتنے بھی مرکبات کے دائرے میں آتے ہیں (جیسے اضافتِ مطلق، اضافتِ تملیکی، اضافتِ نسبی، اضافتِ ظرفی، اضافتِ مصدری، اضافتِ سببی، اضافتِ بیانی، اضافتِ مقلوب، اضافتِ تخصیصی وغیرہ) ان دو یا تین الفاظ کی باہمی مربوط نسبت کا رشتہ نحویاتی نظام کی سب سے چھوٹی اکائی سے جڑ جاتا ہے۔یاد رہے کہ دو تین سے زیادہ اضافی تراکیب بیک مقام تواتر کے ساتھ نثر و نظم میں مستحسن سمجھی نہیں جاتیں۔ نحویات میں ان تراکیب کی باہمی نسبت پر بھی غور کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ جملے میں اجزائے کلام کے مابین پائی جانے والی نسبتوں اور ان کے قواعدی روابط کا تجزیہ بھی نحو میں کیا جاتا ہے۔ گویا دو بامعنی الفاظ کے معنوی ربط سے لے کر لسانی اظہار کے طویل بامعنی ساختی تعملات کے مابین پائے جانے والے ربط پر نحویات غور کرتا ہے۔

(ب) تنظیم: جملے میں الفاظ کی بامعنی خطی ترتیب کو تنظیم کہا جاتا ہے۔'' چھوٹا لڑکا ضد کرتا ہے''۔ یہ مکمل جملہ الفاظ کی صحیح محلی رمقامی نشستوں کا خیال رکھنے کی وجہ سے بامعنی بنا ہے۔اگر ان کی نشستی تنظیم بگڑ جاتی تو یہ جملہ الفاظ کا مجموعہ تو ہوتا لیکن اس کے کوئی معنی نہ ہوتے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ جملے یا شعر میں معنویت صرف مجرد الفاظ کے مجموعے کی بدولت پیدا نہیں ہوتی ان الفاظ کی بہترین تنظیم بھی اس کی متقاضی ہوتی ہے۔یوں بھی کہا جاتا ہے کہ معنی الفاظ کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں،ان میں انفصال، انفشار یا بد نشستگی پیدا ہو جائے تو معنی خبط ہو جاتے ہیں اور ترسیل خیال میں رکاوٹ آجاتی ہے۔ اس لیے جملے یا شعر میں لفظی تنظیم بہت ضروری ہوتی ہے۔ نحویات میں جملے کی اس طرح کی خطی تنظیمی نشست کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

(ج) ترکیب: اضافی مرکبات سے ہٹ کر ترکیب میں باہمی ربط کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔یہاں صرف درمیانی ربط ہی ملحوظ نہیں رہتا بلکہ ساختی تعملات کے آگے اور پیچھے کے ربط پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ان کے معنی اور مفہوم کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔سب سے اعلیٰ و ارفع امر یہ ہے کہ نحویات میں الفاظ کی بامعنی ترکیب یعنی الفاظ کی نشست و برخاست کا برمحل تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس ترکیب کا چھوٹا سانچا مبتدا اور خبر سے بنتا ہے، جیسے زید آیا۔اس جملے میں زید مبتدا ہے اور آیا خبر ہے۔ان دونوں الفاظ کو جوڑ کر معنی تک پہنچا جاتا ہے اور انھیں توڑ کر ان کے لسانی انسلاکات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔جملے میں معنی کی توسیع کے امکانات طویل ساختی تعملات پر منحصر ہوتے ہیں۔کبھی کبھی الفاظ کئی فقروں سے منسلک ہو کر جملہ بنتے ہیں۔یہ مفرد جملہ بھی ہو سکتے ہیں یا مرکب یا پھر مخلوط بھی ہو سکتے ہیں۔ان میں فقروں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی نحویاتی مطالعہ اتنا وسیع ہوگا اور ان کی معنویاتی توسیع میں اضافہ ہوگا۔الفاظ کے انسلاکات کا انحصار ترکیبی ضابطوں اور قواعدی اصولوں پر ہوتا ہے۔ان کی بنیاد پر جملے کی کئی قسم کی ترکیبیں بنتی ہیں، جیسے: اسمی ترکیب، توصیفی ترکیب، اضافی ترکیب، فعلی ترکیب، متعلق فعلی ترکیب وغیرہ۔ جملوں میں ان کے استعمال سے ان کی قسم پہچانی جا سکتی ہے، جیسے زید لڑکا ہے۔(اسمی ترکیب) وہ کرسی پر بیٹھا ہے۔ (فعلی ترکیب) زید کالا ہے۔(توصیفی ترکیب) زید کی کتاب (اضافی ترکیب) تیز دوڑتا گھوڑا (متعلق فعلی ترکیب) زید اور گھوڑا (عطفی ترکیب) ان تمام تراکیب میں متعلقہ اجزائے کلام کی مختلف فروعات استعمال ہو سکتی ہیں۔نحویات میں تراکیب کی ان باریکیوں پر بحث کی جاتی ہے۔

نحوی ترکیب کے مطالعے کے دوران جملے کے اجزائے متصلہ (Immediate Constituents) پر غور کیا جاتا ہے۔یعنی ایک جملے میں کتنے جزو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ان اجزائے متصلہ سے ترکیب بنتی ہے اور ایک بامعنی جملہ وجود میں آتا ہے۔مثلاً'' وہ کتاب جو کل گم ہو گئی تھی، دیوانِ غالب تھی۔''اس جملے میں دو اجزائے متصلہ ہیں: '' وہ کتاب جو کل گم ہو گئی تھی'' اور'' دیوانِ غالب تھی۔'' اس کے علاوہ،'' وہ کتاب'' بھی '' جو کل گم ہو گئی تھی'' کا جزو متصل ہے۔اب اس جملے کی جتنی بھی ترکیبی توسیع کی جائے گی، اجزائے متصلہ میں اضافہ ہوتا جائے گا اور نئی نئی تراکیب کے استعمال سے ان کی اقسام وجود میں آئیں گی۔

نحویات اور معنیات

نحویات Syntactic اور معنیات Semantacs میں چولی دامن کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔شعر یا جملے کی تفہیم اسی رشتے پر منحصر ہوتی ہے۔نوم چامسکی نے اپنی کتاب Syntactic Structures کے آٹھویں اور نویں باب میں ان دونوں کے رشتے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ 'کیا معنی کے تصور کے بغیر قواعد Grammer تیار کیا جا سکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں۔

''میں گرامیٹیکل ڈھانچے کے نظریہ کو جزوی طور پر سیمنٹک اصطلاحات میں تیار کرنے کی کسی تفصیلی کوشش یا گرامر کی تعمیر یا تشخیص میں معنوی معلومات کے استعمال کے لیے کسی خاص اور سخت تجویز سے واقف نہیں ہوں۔'' (ص 93)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گرامر جس سے زبان کے اصول وضوابط بنائے جاتے ہیں، معنیاتی نظام کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ نحوی تجزیے میں جملے کے تمام لسانی ساختی تعملات کی قوت معنوی کو آنکتے وقت بے معنی حروف (ربط، عطف، تخصیص، فجائیہ وغیرہ) کو ان کے اجزائے متصلہ کے سہارے معنی فراہم کیے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ناقص لسانی مرکبات کے سہارے بنے فقرے جو عرف عام میں محاورہ کہلاتے ہیں، سماجی روزمرہ اور سماجی لسانیات کے زیر اثر اپنے ان معنی کے متحمل نہیں ہوتے جو نحویاتی تجزیے سے برآمد ہوسکتے ہیں، جیسے: ''جان میں جان آنا''، ''گل کھلانا''۔ ان دونوں محاوروں کے نحوی اور روایتی معنی میں فرق ہے۔ ایسے ناقص مرکبات سے بنے فقروں میں ضرب المثل کا بھی شمار ہوتا ہے کہ اس میں فقرے کے ساختی تعملات کے نحوی معنی کچھ اور ہوتے ہیں اور روایتی معنی علاحدہ۔ اس سے نوآموز افراد ترسیل معنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض وقت شعر اور جملے کچھ اس طرح بھی لکھے جاتے ہیں جو ذومعنی ہوتے ہیں اور مبہم معنی بہم پہنچاتے ہیں۔ شاعری میں یہ بطور صنعتِ ایہام کافی مشہور ہے، لیکن نثر میں اس کی وجہ سے نحوی تجزیہ دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں لسانی اظہار کی جملوی ترکیب اور اس کے ساختی تعملات کے اجزائے متصل پر ایک طرف غور کیا جانا لازمی ہے تو دوسری جانب اس کے معنیاتی پہلو پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے۔ چامسکی نے اپنی کتاب میں صنائع لفظی

علم النحو الفاظ کے سلسلوں سے تشکیل پانے والے فقرے اور جملے کے تجزیے پر منتج ہوتا ہے۔ اس تجزیے میں الفاظ کی تمام اقسام، ان کے انسلاک کی وجہ سے معنوی توسیع، ان کا خطی دروبست Linear order اور ان کی تفہیم و ترسیل کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہاں الفاظ سے مراد اجزائے کلام سے ہے جو اسم، فعل اور حروف کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ان کے صحیح دروبست اور مناسب ربط سے فقرہ / جملہ تشکیل پاتا ہے جو کسی مُظہرِ خیال کا لفظی پیکر ہوتا ہے۔

والے ایہام پر نہیں بلکہ فقرے اور جملے میں در آئی ذومعنوی نحوی تراکیب پر بحث کی ہے جن سے تفہیم میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''میں روزی سے زیادہ برفی پسند کرتا ہوں۔'' اس جملے کے دو معنی برآمد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ روزی کے مقابلے میں مجھے برفی زیادہ پسند ہے اور دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ میں اور روزی دونوں برفی پسند کرتے ہیں مگر اس کی پسند سے بھی زیادہ مجھے برفی پسند ہے۔ دراصل ابہام پیدا ہونے کا سارا فتور جملے کی فہمائش پر انحصار کرتا ہے وگرنہ جملے کی نحوی ساخت اپنی جگہ درست ہوتی ہے۔ البتہ ولیم امپسن کے نزدیک اظہار کے طریق کار کی وجہ سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں ذومعنی الفاظ کے علاوہ مکمل مصارع میں بھی ابہام کی مثالیں مل جاتی ہیں، مثلاً ایک شعر کی تفہیم کچھ اس طرح ہوسکتی ہے محبوب نے بیمار کو دیکھا تو بیمار کے چہرے پر رونق آگئی دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں بیمار نے جیسے ہی محبوب کو دیکھا، اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ ظاہر ہے کہ پہلے مفہوم میں محبوب فاعل (دیکھنے والا) اور بیمار مفعول (جسے دیکھا گیا) ہے اور دوسرے مفہوم میں بیمار فاعل (دیکھنے والا) اور محبوب (ان) مفعول (جسے دیکھا گیا) ہے۔ نثر میں اظہار کا یہ طریق کار نحویات میں مبہم ساخت Constructional Ambiguity (تعمیراتی ابہام) کہلاتا ہے۔

نحویات میں تنظیم، ترتیب اور ترکیب کے بعد نشان گر Markers پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ عرف عام میں یہ حروف کہلاتے ہیں۔ بالعموم وہ اپنے کوئی انفرادی معنی نہیں رکھتے مگر جملے میں اجزائے کلام کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً ''زید اور اکرم'' ''آدمی اور عورت''۔ ان دونوں فقروں میں ''اور'' عطفی نشان گر ہے۔ اس کے علاوہ ''کا، کی کے'' اضافی نشان گر، ''پر، لیکن، مگر'' استدراکی نشان گر وغیرہ۔ یہ نشان گر اپنے ذاتی معنی نہیں رکھتے مگر اجزائے کلام سے جڑ کر فقرے کو بامعنی بننے میں معاونت ضرور کرتے ہیں، گویا الفاظ کے منظم سلاسل میں معنی کی رو دوڑانے کا کام نشان گر بخوبی کرتے ہیں۔

علم النحو الفاظ کے سلسلوں سے تشکیل پانے والے فقرے اور جملے کے تجزیے پر منتج ہوتا ہے۔ اس تجزیے میں الفاظ کی تمام اقسام، ان کے انسلاک کی وجہ سے معنوی توسیع، ان کا خطی دروبست Linear order اور ان کی تفہیم و ترسیل کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہاں الفاظ سے مراد اجزائے کلام سے ہے جو اسم، فعل اور حروف کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ان کے صحیح دروبست اور مناسب ربط سے فقرہ / جملہ تشکیل پاتا ہے جو کسی مُظہرِ خیال کا لفظی پیکر ہوتا ہے۔ نحویات میں لفظ سے جملہ بننے تک الفاظ کی کارگذاری کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان میں انسلاکِ معنی کو تلاش کیا جاتا ہے۔ قواعدِ زبان کے اعتبار سے ان کے جزئیاتی عناصر کے اثرات سے الفاظ میں ہونے والی معنوی تبدیلیوں کا تجزیہ بھی نحویات کا موضوع ہوتا ہے۔ الفاظ کے جزئیاتی عناصر سے الفاظ پر ہونے والی تبدیلیاں ذیل کی طرح ہوتی ہیں:

	الفاظ/ اجزائے کلام	جزئیاتی عناصر	ہونے والی تبدیلیاں
1	اسم 2 ضمیر	جنس (مذکر، مونث) تعداد (واحد جمع)	وہ لڑکا ہے (مذکر، واحد) وہ لڑکی ہے (مونث، واحد) وہ لڑکے / لڑکیاں ہیں (مذکر، مونث، جمع)
3	صفت	""""	وہ اچھا لڑکا ہے، وہ اچھی لڑکی ہے، وہ اچھے لڑکے ہیں، وہ اچھی لڑکیاں ہیں۔
4	فعل	زمانہ، حالت، شخص (متکلم، حاضر، غائب)	ان تینوں عناصر کی وجہ سے فعل کی مبدّلہ صورتوں کا تجزیہ گردان کے ذریعے کیا جاتا ہے۔
		امدادی افعال / مرکب افعال، طور	شیر، بکری کو کھا رہا تھا، بکری کھائی جا رہی تھی۔
5	متعلقِ فعل		فعل کی کیفیتوں کو واضح کرتے ہیں۔ جیسے تیز رفتار، دھیمی رفتار
6	حروف	ربط، عطف، تخصیص، فجائیہ وغیرہ	بالعموم اجزائے کلام پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

الفاظ سے جملہ بننے تک کے عمل میں مارفیم / الفاظ کے درمیان باہمی روابط کا جو سلسلہ پایا جاتا ہے اس کا تجزیہ مختلف انداز میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب جملے میں فاعل کا ربط فعل کے ساتھ ہوتا ہے تب فاعل کے جنس، تعداد اور شخص کے مطابق فعل کی جنس،

تعداد اور شخص میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، جیسے لڑکا گاتا ہے۔ لڑکی گاتی ہے۔ لڑکے گاتے ہیں۔ لڑکیاں گاتی ہیں۔ تعظیم وتکریم والے جملے میں البتہ فعل جمع کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے، جیسے بھائی آئے ہیں۔ یہاں بھائی فاعل اور واحد ہے لیکن ان کے آنے کے عمل کو جمع کے صیغے میں لایا گیا۔ بعض اوقات اسمائے جمع فاعل ہوں تو ان کا فعل واحد ہی رکھا جاتا ہے، جیسے فوج آرہی ہے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

فاعل ایک سے زیادہ ہم جنس اسما ہوں تو ان کا فعل جمع کے صیغے میں درج ہوگا، جیسے لڑکا اور اس کا کتا ایک ساتھ کھیل رہے ہیں۔ کسی جنگل میں ہرن اور خرگوش رہتے تھے۔ لیکن ایک ہی جنس کے دو یا دو سے زیادہ اسمائے کیفیت یا اسمائے ظرف واحد کے صیغے میں آئے تو فعل بالعموم صیغۂ واحد ہی میں ہوگا، جیسے زید کی باتیں سن اکرم کو خوشی اور حیرت ہوئی۔ کنویں سے گھڑا اور لوٹا نکلا۔

اگر متضاد جنس و تعداد کے ایک سے زیادہ اسما فاعل ہوں تو فعل کی تعداد و جنس، آخر کے فاعل کے مطابق ہوگا، جیسے غصے میں منہ، آنکھ اور رخسار سرخ نظر آتے ہیں۔ اگر ضمیر شخصی کے فاعل متکلم اور حاضر ہوں تو فعل متکلم کے مطابق ہوگا، جیسے ہم اور تم ساتھ چلیں گے۔ اور اگر فاعل حاضر اور غائب ہوں تو فعل حاضر کے مطابق رہے گا، جیسے تم اور وہ کل آنا۔ تو اور وہ گیا تھا۔

نحویات میں رموزاوقاف اور اعراب پر بھی غور کیا جاتا ہے۔عبارت/ شعر میں پائے جانے والے ابہام کو دور کرکے متن کے معنی تک صحیح و سریع رسائی حاصل کرنے میں رموز اوقاف نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ولیم ایمپسن نے اپنی کتاب میں ابہام کی سات قسمیں بیان کرتے ہوئے اوقاف کی علامتوں کے غیر قطعی استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والے ابہام کی وضاحت کی ہے۔

اگر مضارع کے ساتھ فاعل ومفعول دونوں آتے ہیں تو مفعول کی جنس، تعداد اور شخص کے مطابق فعل کی جنس بدل جاتی ہے، جیسے لڑکے نے کتاب پڑھی۔ لڑکی نے تصویریں بنائیں۔ لیکن دو یا زائد مفعول اگر الگ الگ ہوں تو ان کا فعل اسی جنس کے صیغۂ واحد میں آئے گا، جیسے میں نے ایک گائے اور ایک بیل خریدا۔ میں نے ایک بیل اور ایک گائے خریدی۔ وغیرہ۔

یہ ساری مثالیں جملے میں جزو متصل کے نحوی عمل کی مظہر ہیں۔ یہی اجزائے متصلہ سے الفاظ سے فقرے اور فقروں سے بامعنی جملے تشکیل پاتے ہیں۔ شاعری میں بعض جگہ اجزائے متصلہ کے درمیان میں شعری ضرورت کے تحت انفصال پیدا کیا جاتا ہے نحوی ترتیب کے مطابق اگرچہ یہ غیر قواعدی عمل ہے لیکن شاعری میں اسے اباحت کے دائرے میں رکھا جاتا ہے۔ مثلاً: نثری جملہ: نقش، کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے؟

ع: نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا (سوالیہ مصرع)

یہاں جملے کا نثری تصریفی عمل کچھ اس طرح ہوگا: نقش (اسم مجرد، فاعل) کس (ضمیرِ استفہام) کی (حرف ربط، اضافی واحد) شوخی (صفت) ـِ (کسرئ اضافت) تحریر (اسم مجرد مفعول، واحد) کا (حرف ربط، اضافی، مذکر، واحد) فریادی (صفتِ ذاتی، واحد) ہے (فعل ناقص) اس جملے میں نحوی ترکیب کے مطابق 'نقش' مبتدا ہے اور باقی الفاظ استفہامیہ خبر ہیں۔ اس استفہامیہ فقرے کے لفظی ارتباط سے جو معنی نکل کر آتے ہیں وہ قاری کے لیے محولہ مصرع کے باوصف سریع الفہم ہیں، کیونکہ مصرع میں شعری ضرورت کے مطابق اجزائے کلام کے قواعدی نظام کو بدلنے کی وجہ سے قاری کی قوت مدرکہ متاثر ہوجاتی ہے اور اس کے سمجھنے کی رفتار کسی حد تک سست ہو جاتی ہے۔

ساخت کے اعتبار سے جملہ دو جزو سے بنتا ہے۔ (1) مبتدا اور (2) خبر۔ خبر کی لفظی وسعت کی بنیاد پر جملہ مفرد، مرکب اور مخلوط جملے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جملے میں فعل کی عملی شکل بھی مختلف ہو کر جملے کی ہیئت متبدل کر دیتی ہے اسے طور کہا جاتا ہے۔ طوری اعتبار سے جملے طور معروف، طور مجہول اور طور معدولہ کہلاتے ہیں۔ رہا لہجے کے اعتبار سے جملے کی اقسام، تو اس کی گیارہ اقسام تسلیم کی گئی ہیں۔ (1) ایجابی یا اقراری (2) توثیقی (3) انکاری یا منفی (4) استعجابی یا فجائیہ (5) استفہامی (6) تعارفی یا تمہیدی (7) دشنام آمیز (8) خوشامدانہ (9) استبعادی (10) استہزائیہ اور (11) امریہ۔ لہجے کے اس طور طریقے سے جملے کی نحوی ساخت معنیاتی نظام کو متاثر کرتی ہے۔ شاعری میں تو ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں کہ نحوی ساخت تو جوں کا توں رہتی ہے مگر لہجے سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق؟ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب خود اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے پہلے مصرع کو دو مختلف لہجوں میں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ حالی یادگار غالب میں رقم طراز ہیں:

''اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ پہلا مصرع ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں۔ اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے، '' کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق، یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے، اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے، فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔'' (حالی: یادگار غالب ص 126-27)

غالب کا ایک اور شعر اسی نوع کا ہے۔ اسے بھی اگر تبدیلی لہجے کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی میں فرق واقع ہوتا ہے۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

شاداں بلگرامی نے مصرع اولی کو استفہام انکاری کے طور پر پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔ جیسے 'تو اور پاسخ مکتوب؟ اس طرح کے لہجے میں ایک طرح کا طنز چھپا ہوتا ہے، کہ تو ایسا کر ہی نہیں سکتا یعنی یہ بات مستبعد ہے۔ اس شعر کا بیانیہ انداز تو یہ ہے کہ ''میں جانتا ہوں کہ تو خط کا جواب نہیں دے گا لیکن شوق تحریر مجھے خط لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ شاداں بلگرامی کے مشورے کے مطابق شعر کی قرأت کی جائے تو مصرع میں طنز و استبعاد کا پہلو نکل آتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ لہجہ نحوی ساخت کے جملے کے معنوی پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نحویات میں رموز اوقاف اور اعراب پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ عبارت/شعر میں پائے جانے والے ابہام کو دور کر کے متن کے معنی تک صحیح وسریع رسائی حاصل کرنے میں رموز اوقاف نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ولیم ایمپسن نے اپنی کتاب میں ابہام کی سات قسمیں بیان کرتے ہوئے اوقاف کی علامتوں کے غیر قطعی استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والے ابہام کی وضاحت کی ہے۔ نثر میں ان کے استعمال سے متن کا مفہوم بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور ابہامی کیفیت ختم ہو سکتی ہے لیکن شاعری میں رموز اوقاف کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی صرف فہم و ادراک کی قوت ہی معنی تک پہنچانے میں معاونت کرتی

ہے۔ایسی حالت میں اوقاف کے عدم استعمال سے ابہام کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔اوقاف کے استعمال کی اسی اہمیت کے پیش نظر قواعد کے ماہرین نے متن کی تفہیم کے لیے اوقاف کے استعمال پر زور دیا ہے۔ان کے استعمال سے الفاظ اور جملوں کے درمیان کے انسلاک اور انقطاع کے ذریعے معنی تک پہنچنے میں سہولت ہوتی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کے مصرع 'لافِ تمکیں فریب سادہ دلی' کو اعراب و اوقاف کے ساتھ، آٹھ طریقوں سے پڑھا ہے، جیسے:

1	ع: لافِ تمکیں،فریب،سادہ دلی	2	ع: لافِ تمکیں،فریب،سادہ دلی
3	ع: لافِ تمکیں،فریبِ سادہ دلی	4	ع: لاف، تمکیں فریب سادہ دلی
5	ع: لاف، تمکیں فریب سادہ دلی	6	ع: لافِ تمکیں فریب سادہ دلی
7	ع: لافِ تمکیں،فریب سادہ دلی	8	ع: لافِ تمکیں فریب،سادہ دلی

اس ایک مصرع میں اوقاف کے مقام بدلنے کی وجہ سے معنی میں خاصا فرق آگیا ہے لیکن اس سے بھی پیشتر لہجے کی تبدیلی معنی پر اثر انداز ہوتی دکھائی دیتی ہے۔اوقاف کے استعمال کے بعد فاروقی کے بتائے ہوئے معنی طباطبائی، سہا مجددی اور حسرت کے

نحویات میں تنظیم،ترتیب اور ترکیب کے بعد نشان گر Markers پر بھی غور کیا جاتا ہے،عرف عام میں یہ حروف کہلاتے ہیں،بالعموم وہ اپنے کوئی انفرادی معنی نہیں رکھتے مگر جملے میں اجزائے کلام کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔

یہاں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔طباطبائی اس مصرع کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''اے لافِ سادہ دلی تیرا وصف تو یہ مشہور ہے کہ تو تمکیں فریب ہے۔''

سہا کہتے ہیں:''ہمارے ضبط و خودداری کے دعوے،سادہ دلی کے فریب پرمبنی تھے۔''

حسرت اس مصرع کی تشریح یوں کرتے ہیں:''ہم بربنائے سادہ دلی ابھی تک یہی سمجھے جاتے ہیں کہ عشق میں دعوائے صبر و تمکین کا نباہنا ممکن ہے۔''

یہاں طباطبائی کی تشریح فاروقی کی قرأت نمبر 6 سے لگا کھاتی ہے۔ان کی قرأت نمبر 7 کی تشریح سہا کی شرح میں نظر آتی ہے اور حسرت کی تشریح فاروقی کی قرأت نمبر 7 اور 8 کی . . وضاحت کرتی ہے۔اس وضاحت سے منکشف ہوتا ہے کہ اوقاف و اعراب کا استعمال شعر یا متن کے ابہام سے بچنے میں معاونت کرتا ہے اور جملے کی نحوی ساخت کی معنیاتی تفہیم میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

شاعری میں اعراب کے استعمال کی غلطی سے بھی معنوی استقام پیدا ہو سکتے ہیں۔ گیان چند جین نے اپنی کتاب 'رموزِ غالب' میں اوقاف و اعراب ہی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔مثلاً نسخۂ عرشی کے درج ذیل مصارع میں انھیں بعض جگہ زیر اضافت کی غلطیاں نظر آئیں، جیسے ع:

ع: 'مرگِ شیریں ہوگئی تھی کوہ کن کی فکر میں' اس مصرع میں جین صاحب 'مرگ شیریں' کو بلا اضافت پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ع: ''مجھ میں اور مجنوں میں وحشت، سازِ دعوا ہے اسد'' اس مصرع میں وہ وقف اور اضافت دونوں کے استعمال کو مباح نہیں سمجھتے۔

ع ''زلفِ سیہ،افعی نظر بد قلمی ہے ہر چند خطِ سبز زمرد رقمی ہے

دیوانِ عرشی کے اس شعر میں اوقاف و کسرۂ اضافت کے متعلق عرشی اور گیان چند جین کے یہاں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔دونوں کی قرأت کے اختلاف کی وجہ سے شعر کی معنوی حیثیت بھی مجروح ہوئی ہے۔عرشی افعی نظر اور بد قلمی (ٹیڑھی میڑھی تحریر) زلفِ سیہ کے دو اوصاف مانتے ہیں جبکہ جین صاحب لفظ 'نظر' کو کسرۂ اضافت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔دوسرے مصرع میں دونوں 'سبز اور زمرد کے درمیان واو عطف یعنی 'سبز و زمرد' کو موزوں گردانتے ہیں۔دراں حالیکہ واو عطف کے بغیر شعر کے معنی بالکل صاف ہیں۔

معشوق کی کالی زلفیں (کان اور رخسار کے قریب والی بالوں کی لٹ) سانپ اور ٹیڑھی میڑھی تحریر کی طرح ہیں۔

اگر چہ اس کے رخسار پر خطِ سبز،زمرد کی طرح رقم ہو گیا ہے یعنی اُگ آیا ہے مگر اس زمرد کا اثر ان زلفوں کے سانپ پر مطلق نہیں ہوا۔مانا کہ زمرد دیکھتے ہی سانپ اندھا ہو جاتا ہے لیکن یہ خطِ سبز تو معشوق کی زلفوں کا کچھ بگاڑ نہیں پا رہا ہے۔

غالب کے ایک اور شعر میں اس کی وضاحت مل جائے گی۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نحویات میں اوقاف و اعراب کی ان باریکیوں پر بھی غور کیا جاتا ہے۔اگر اوپر کی مثال والے 'زلفِ سیہ' والے شعر کے دوسرے مصرع میں 'سبز و زمرد رقمی' کی ترکیب کو واو عطف کے ساتھ پڑھا جائے تو رقمی کی صفت معدوم ہو جائے گی۔اس لیے یہاں واو عطف کے بغیر بلکہ کاما کے ساتھ اسے پڑھنا ہی درست ٹھہرے گا۔بعض جگہ اضافی تراکیب میں کسرۂ اضافت ایک سے زیادہ ہوں اور درمیان میں اوقاف بھی موجود ہوں تو مضاف و مضاف الیہ کی نحوی ساخت کو درست کرنے کا کام نحویات کے اصولوں کے تحت کیا جاتا ہے۔جیسے

ع: صدرہ آہنگِ زمیں،بوسِ قدم ہے ہم کو (غالب)

اس مصرع کو نحوی اعتبار سے دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔(1) آہنگِ زمیں بوس،یعنی کاما کے بغیر [قدم چومنے کا ارادہ] اور (2) بوسِ قدم [یعنی قدم چومنا] نسخۂ عرشی کے ایک اور شعر میں اوقاف و اعراب کے استعمال سے پیدا ہونے والے ابہام کا نحوی تجزیہ کیا گیا ہے۔

کھنچوں ہوں آئنے پر خندۂ دل سے مسطر نامہ،عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں

شعر کے مصرع ثانی کی قرأت گیان چند جین نے یوں کی ہے، ع: نامہ عنوان،بیانِ دلِ آزردہ نہیں۔ان کے مطابق 'نامہ عنوان' کی ترکیب میں اضافتِ مقلوب ہے،یعنی عنوانِ نامہ۔جین کے مطابق،''میرے نامے کا عنوان دل آزردہ کا بیان نہیں بلکہ دل شگفتہ کا بیان ہے''اس ترکیب کے اعتبار سے بیانِ دل آزار کی مراجعت 'نامہ عنوان' کی طرف ہوتی ہے۔اس کے علی الرغم عرشی کے مطابق 'بیان دل آزردہ کا مرجع ''نامہ'' قرار پاتا ہے۔

اس طرح نحویات میں اجزائے کلام کی تصریفی درجہ بندی، اجزائے متصلہ یا الفاظ کے عمل سے لے کر فقرے کی تشکیل، جملے میں تکمیل خیال کی معنیاتی قوت اور جملے کی ہیئت، مواد کی تنظیم اور اس کے Syntactic Structures کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

■

Dr. Syed Yahya Nasheet
24, Kashana KALGAON
Dist. Yavatmal 445203 (MS)

وبائیں اور اردو ادب

رئیس انور

اجتماعی سطح پر پھیلنے والے ان سب امراض کے لیے اردو میں ایک ہی لفظ 'وبا' استعمال کیا جاتا ہے۔ 'وبا' کی قسموں، ان کے دائرہ کار اور اختصاصات کی زیادہ وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ اس ضمن میں انگریزی میں بہتر تصریحات و توجیہات موجود ہیں۔ 'وبا' کو اس کے دائرہ اثر یا پھیلاؤ کے لحاظ سے Classifyکیا گیا ہے اور الگ الگ نام دیے گئے ہیں۔

زندگی ایک نامیاتی اور سیال حقیقت ہے۔ یہ ہر لمحہ تغیر پذیر ہے۔ اس میں ٹھہراؤ نام کو نہیں۔ کائنات سے ہر لمحہ مختلف النوع لہریں اٹھ اٹھ کر اس کا رخ بدلتی رہتی ہیں اور بسا اوقات اس میں بھونچال بھی لے آتی ہیں۔ انسان اپنی عقل و حکمت سے ان لہروں اور بھونچال کا سامنا کرنے کی کوششیں کرتا ہے مگر کبھی کبھی اس کی ساری دور اندیشی اور منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ وہ قدرت کے آگے بے بس اور مجبور محض بن جاتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ایسی ناگفتہ بہ صورت حال کو آفات ارضی یا آفات سماوی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ وبا بھی ایک طرح کی آفت ہے جس کے شکار بلا کسی امتیاز کے حاکم و محکوم اور امیر و غریب سب ہی ہوتے ہیں۔

علما، صوفیہ اور اطبا نے اپنے اپنے طور پر وبائی بیماریوں کی تشریح و تعبیر کی ہے اور احتیاطی تدبیریں بتائی ہیں۔ گھر کے اندر کی صفائی ستھرائی، مخصوص غذا کا استعمال اور بعض چیزوں سے پرہیز یا چودہ دن کا قرنطینہ ان ہی کے حصے ہیں۔ بعض علمائے اسلام نے اجتماعی مصائب اور وبا کے جلد خاتمے کے لیے اوقات متعینہ کے علاوہ اذان دینے کو مستحب قرار دیا ہے۔ سائنسدانوں نے مادی وسائل سے کھوج لگانے کی کوشش کی ہے کہ وبائی امراض کی وجہ کیا ہے؟ کون سا وائرس یا بیکٹیریا اسے سرعت کے ساتھ پھیلاتا ہے؟ انسانی جسم کی قوت مدافعت اسے روکنے سے قاصر کیوں ہے؟ کس کیمیائی مرکب سے اس کا زور توڑا جا سکتا ہے؟ اس کے اثرات ختم کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی کھوج بین کے کچھ نتائج بھی سامنے آئے ہیں پھر بھی کچھ نکات اب تک مبہم ہیں۔ سائنس داں ان کا حل تلاش کرنے میں مشغول ہیں۔

بہرحال عام طور پر اچانک پھیل جانے والی کسی بیماری کی چپیٹ میں جب لوگوں کی بڑی تعداد آ جاتی ہے تو اسے وبا کہا جاتا ہے۔ طاعون، ہیضہ، چیچک، ٹائیفائڈ، ڈینگو، فلو، سوائن فلو، ایڈز اور کووڈ 19 سب کو اس زمرے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کئی بیماریوں مثلاً ہیضہ اور طاعون کی طویل تاریخ ہے اور سماجی تاریخ کے قدیم پنوں میں وقفے وقفے سے ان کے پھیلنے، خوف و ہراس کا ماحول بنانے اور گاؤں کے گاؤں کو ویران کر دینے کا مفصل تذکرہ ملتا ہے۔ بعد میں دوسری بیماریاں بھی ان میں شامل ہو کر وبا کا سلسلہ دراز کرتی گئیں۔

اجتماعی سطح پر پھیلنے والے ان سب امراض کے لیے اردو میں ایک ہی لفظ 'وبا' استعمال کیا جاتا ہے۔ 'وبا' کی قسموں، ان کے دائرہ کار اور اختصاصات کی زیادہ وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ اس ضمن میں انگریزی میں بہتر

تصریحات و توجیہات موجود ہیں۔ 'وبا' کو اس کے دائرہ اثر یا پھیلاؤ کے لحاظ سے Classify کیا گیا ہے اور الگ الگ نام دیے گئے ہیں۔

کسی مخصوص علاقے یا موسم میں تیزی سے پھیلنے والی خاص بیماری کو علاقائی وبا (Endemic) کہتے ہیں جیسے ایک زمانے میں شہر کلکتہ کی خاص بیماری ملیریا تھی جو عموماً برسات کے بعد پھیلتی تھی۔ اسی طرح ان دنوں ڈینگو دہلی کے کئی علاقوں میں وبائی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہی اینڈیمک (Endemic) جب اپنے پنکھ زیادہ پسارتا ہے اور تیزی سے کسی ملک کے مختلف شہروں اور علاقوں کی بڑی آبادی کو متاثر کرتا ہے تو اسے ملکی وبا (Epidemic) کہتے ہیں۔ جیسے کئی برس قبل ایڈس کی وبا افریقہ کو گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔

ان دونوں بیماریوں کے برعکس جب کوئی ملکی وبا یعنی مختلف ملکوں اور براعظم میں پھیل کر بین الاقوامی صورت اختیار کر لے تو اسے عالمی وبا قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ جگ ظاہر ہے کہ 2009 میں سوائن فلو ایک عالمی وبا کے طور ابھرا تھا اور حالیہ برسوں میں کرونا وائرس یا کووڈ 19 عالمی وبا بن گیا ہے۔

جب تک کووڈ چین کے شہر 'ووہان' تک محدود تھا تو علاقائی وبا (Endemic) تھا پھر چین کے طول و عرض میں پھیلا تو ملکی وبا (Epidemic) بن گیا مگر اسے چین میں روکا نہیں جا سکا۔ مختلف ملکوں کے لوگوں کے تجارتی سفر یا سیاحتی آمد و رفت کے سبب اس کے جراثیم چاروں طرف پہنچ گئے اور ساری دنیا اس کی چپیٹ میں آ گئی۔ سارے نظام کو درہم برہم کرتے ہوئے اور لاکھوں لوگوں کو پلک جھپکتے ہی لقمۂ اجل بناتے ہوئے یہ ملکی وبا عالمی وبا میں بدل گئی۔

یہاں یہ دہرانا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ، ترجمان اور ناقد ہوتا ہے۔ زندگی کی ساری جلوہ سامانیوں، رنگینیوں اور پرفریب نظاروں کے ساتھ ساتھ اس کے کھرے، کھردرے، کریہہ اور ہولناک مناظر بھی ادب کا مواد اور موضوع بنتے رہے ہیں۔ دوسری آفات سماوی و ارضی کی طرح وبائی امراض اور اس کے تباہ کن اثرات کے تذکرے ادب میں ہوتے رہے ہیں۔ اردو ادب میں پرانی وباؤں یعنی طاعون، ہیضہ اور چیچک کی لرزہ خیزی کا بیان ناول، افسانہ اور شاعری میں ہلکے پھلکے طور پر ملتا ہے مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' میں ہیضہ جیسے اینڈیمک پر اخلاقی دائرے میں کسی قدر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کے ناول 'بستی' کے ابتدائی حصے میں طاعون کے ایپیڈیمک کا بیان ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ 'کوارنٹین' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں بیدی نے وبائی حالات میں انسانی نفسیات کا بڑی باریکی سے جائزہ لیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ طاعون کے مریضوں کو جب کوارنٹین کیا جاتا ہے تو ان کے ذہن میں خوف و دہشت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ ادھ مرے ہو جاتے ہیں۔ احساس تنہائی اور منفی خدشات سے شدید نروس ہو کر جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ یہ بالکل اچھوتا پہلو ہے جسے بیدی نے اپنے افسانے میں فنکارانہ سطح پر پیش کیا ہے۔

اردو شاعری میں بھی ضمنی طور پر کبھی کبھار وباؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ طاعون ایک پرانا وبائی مرض ہے اور ہندوستان میں 19 ویں صدی کے آخر میں بڑی آبادی اس کی زد میں آئی تھی۔ اکبر الہ آبادی اپنے مخصوص انداز میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

بچ رہے طاعون سے تو اہل غفلت بول اٹھے
اب تو مہلت ہے پھر اگلے سال دیکھا جائے گا

چیچک بھی ایک زمانے تک متحدہ ہندوستان میں وبائی مرض (Epidemic) بنا رہا۔ گوگل پر کئی جید شاعروں کے شعر ملتے ہیں جن میں انسانی چہرے پر اس مرض کے منفی اثرات کی عکاسی ہوئی ہے۔

داغ چیچک نہ اس افراط سے تھے مکھڑے پر
کن نے گاڑی ہیں نگاہیں ترے رخسار کے بیچ
(میر)

داغ چیچک کے ہیں زیبا ذقن یار کے گرد
لطف رکھتا ہے لب چاہ چراغاں ہونا
(آتش)

تپ آئی تھی بچپن میں مجھے یاد ہے خوب
بن کے چیچک ہمہ تن آبلے تن پر نکلے
(امیر)

کلاسیکی عہد کی ایسی کوئی شعری تخلیق راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ جس میں مذکورہ وباؤں کی تباہکاریوں اور ہولناکیوں کا آنکھوں دیکھا حال یا خیالی تصویر پیش کی گئی ہو۔ 20 ویں صدی میں وبائی چیچک کے سنگین نتائج پر کئی افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں خواجہ احمد عباس (بھولی)، بیدی (چیچک کے داغ)، مشتاق احمد نوری (وردان) وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اختر الایمان کی نظم 'کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام' خاصے وسیع اور گمبھیر معنوی تناظر کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں ذیلی طور پر یہ لائین ملتی ہے۔

'چیچک کا ٹیکا بیماری کو روکے رکھتا ہے۔'

20 ویں صدی کے اوائل میں کلکتہ اور بنگال کے بعض علاقوں میں ایک ہلاکت خیز اینڈیمک 'سوکھیا' (Ricket) پھیلی تھی جس میں سیکڑوں افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ کرشن چندر نے اپنے افسانے 'ان داتا' میں اس کا تذکرہ کیا ہے:

''آج ہمارے سفارت خانے کے باہر دو عورتوں کی لاشیں پائی گئی ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ شاید 'سوکھیا' کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ ادھر بنگال میں اور غالباً سارے ہندوستان میں 'سوکھیا' کی بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ اس عارضے میں انسان گھلتا جاتا ہے اور آخر میں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر مر جاتا ہے...

'سوکھیا' کی بیماری کے مریضوں کو اب ہسپتال میں داخل کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف کلکتہ میں روز دو ڈھائی سو آدمی اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں اور اب یہ بیماری ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔''

اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں بالخصوص انگریزی اور فرانسیسی زبان میں طاعون، ہیضہ اور ایڈز پر ادبیات موجود ہیں جن میں مریضوں کے دلخراش حالات اور آخری لمحات کا جذباتی اظہار ملتا ہے۔ فرانسیسی مصنف البیر کامیو کا نوبل انعام یافتہ ناول 'طاعون' (1958) مترجمہ انیس ناگی (1993) اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ ان موضوعات سے متعلق چند نظموں کے اردو ترجمے بھی کیے گئے ہیں۔ 'ایڈز' پر اودن شیرابیر کی نظم کا اردو ترجمہ 'موت کی وادی' کے عنوان سے کیا گیا ہے جو اس طرح ہے۔

اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں بالخصوص انگریزی اور فرانسیسی زبان میں طاعون، ہیضہ اور ایڈز پر ادبیات موجود ہیں جن میں مریضوں کے دلخراش حالات اور آخری لمحات کا جذباتی اظہار ملتا ہے۔ فرانسیسی مصنف البیر کامیو کا نوبل انعام یافتہ ناول 'طاعون' (1958) مترجمہ انیس ناگی (1993) اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

جون مرا نہیں ہے/وہ ابھی مرا نہیں ہے/لیکن/وہ کبھی کبھار ہی ہوش میں آتا ہے/اگر وہ مسکرا دے تو/ہم کتنے خوش ہوتے ہیں/جب وہ چیختا ہے کہ گھر چلے جاؤ تو/ہم شکرگزار ہوتے ہیں کہ/وہ بول سکتا ہے/جب وہ انگلیاں ہلاتا ہے تو/ہم جان لیتے ہیں کہ/ابھی اس میں جان باقی ہے/کسی لمحے وہ بہتر لگتا ہے کسی لمحے بدتر/اب وہ زندگی کے اس مقام پر آگیا ہے جہاں/ہر دن، ہر گھنٹہ، ہر لمحہ غیر یقینی ہوگیا ہے/کون جانے کب/اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ دے!　　(ترجمہ خالد سہیل)

اردو کے قلمکاروں نے عموماً 'ایڈز' جیسے کریہہ مرض اور اس کے گھناؤنے اسباب پر خیال آرائی سے گریز کیا ہے۔

بہرکیف حالیہ عالمی مہاماری کورونا وائرس (کووڈ 19) کے دوران اردو کے قلمکاروں نے لاک ڈاون کا مثبت استعمال کیا ہے اور زیادہ باشعور ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

کووڈ کی تباہ کاریوں، نظام حیات کے بکھراو، سماجی اتھل پتھل، انسانیت کے فقدان، لاک ڈاون اور قرنطینہ کی نفسیاتی اذیتوں پر خاص توجہ دی گئی۔ ناولوں، افسانوں، انشائیوں، شاعری اور مضامین کا ایک نگار خانہ پیش کر دیا ہے۔ نظموں اور منتخب نگارشات کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ شعری و نثری ادب پاروں میں سسکتے بلکتے مردوں عورتوں اور بچوں کی بے بسی، خوف سے بھاگتے غریبوں، بھوکے مزدوروں کی بدحالی، تڑپتے سسکتے لوگوں کی لاچاری، دوا اور آکسیجن کے لیے دوڑتے بھاگتے رشتے داروں، بے یار و مددگار پڑے مریضوں، چوک چوراہوں پر آخری رسومات کی منتظر بے کفن لاشوں اور ندی نالوں میں تیرتے مسخ شدہ جسموں کے دل دہلا دینے والے مناظر کی نہایت موثر عکاسی کی گئی ہے۔ اس طرح کے ادب کی تخلیق پچھلے دو برسوں یعنی 2020 اور 2021 میں ہوئی اور قارئین کے ذہن و شعور میں اس کی گونج اب بھی موجود ہے۔ معروف فکشن نگار عبدالصمد نے اپنے ناول 'مشکول' میں اس وبا کے ایک تاریک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول 'شہر خالی، کوچہ خالی' کا نام اور موضوع مشہور فارسی نظم سے مستعار ہے۔ یہ ناول کووڈ سے شہروں میں پھیلنے والی دہشت اور ویرانی کا عمدہ اشاریہ ہے۔ اس پس منظر میں ناول نگار نے بڑی ہنرمندی سے پرندوں کی چہچہاہٹ سے حیات کی امید جگائی ہے اور وبا کے منفی اثرات میں اثباتیت کا پہلو نمایاں کیا ہے۔ اس کے اختتامی حصے میں وبا میں مبتلا مریض کے نزدیک فاختہ کا پھدکنا زندگی کا ایک نفسیاتی پیغام دیتا ہے۔

یہاں پروفیسر شاداب رضی مرحوم (شعبہ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی) کی نظم 'کووڈ 19' کا ذکر بھی لازمی ہے۔ اس میں انھوں نے کووڈ کی پراسرار وبا اور اس کے جراثیم کے متعلق اپنے قیاسات اور جذبات کی بالکل منفرد اور موثر ترجمانی کی ہے۔

بلاکت خیز جرثومہ 'کورونا'/زمیں زادوں کی دانش کا کرشمہ ہے/کہ اک قہر سماوی ہے/بلائے بے دعا کہ اک وبائے بے مداوا ہے/کسی صورت یقینی طور پر کہنا نہیں ممکن،/وجود اس کا ہو جیسے/حل طلب کوئی معما/حقیر اتنا/مثال غیر مرئی نقطۂ فرضی/نہ اس کی شکل و صورت،/قد نہ قامت اور کوئی رنگت/یہ ہے ذی روح یا اس میں سرے سے

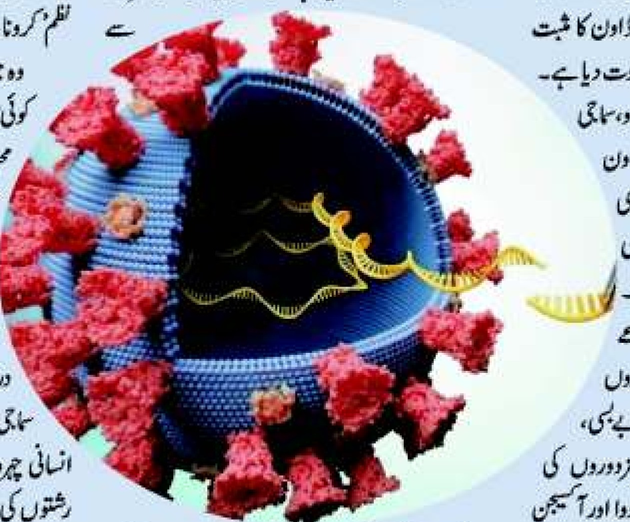

جاں نہیں ہوتی/ابھی تک کچھ نہیں واضح/جسارت دیکھیے اس کی/لیا ہے پنگا اس نے اشرف المخلوق سے،/جو ہے خود ہی خلیفہ بحر و بر کا/مگر اس پر بھی طاری کر رکھا ہے/خوف مرگ اس نے،/سراسیمہ سی ہے اب نوع انساں/ساری دھرتی پر/کہ جیسے ساری دھرتی اک وطن ہو/اور ساری قوم میں اک شہری/حریفانہ 'کورونا' آدم و حوا کے بیٹوں بیٹیوں کو/موت کی نیندیں سلاتا جا رہا ہے/نسل انسانی مٹاتا جا رہا ہے/ہم گھروں میں بیٹھے بیٹھے/شیخ سعدی کی دعا میں ہوں شریک/اک ذرا سے فرق سے/کریما بہ بخشائے بر حال ما/کہ ہستم اسیر کمند 'وبا'

ان ایام میں اردو ادب کا بڑا خسارہ ہوا، کئی نامور ادیب و شاعر اس وبائی لہر کے شکار ہو گئے اور کئی قلمکاروں پر ماحول کی ہیبت ناکیوں کے منفی اثرات مرتب ہوئے کہ وہ مختلف النوع ذہنی و قلبی الجھنوں اور بیماریوں میں مبتلا ہونے لگے۔ پروفیسر شاداب رضی بھی غالباً ذہنی تناؤ کے سبب ہارٹ اٹیک سے ستمبر 2020 میں ابدی نیند سو گئے۔ المیہ ہے کہ ان کی مذکورہ بالا نظم اسی سال 'آج کل' نئی دہلی، دسمبر میں شائع ہوئی۔

اس تناظر میں معمر شاعر ضیا فاروقی کی نظم 'یا خدا رحم کر دیکھیے۔ اس میں وبائی سانحات کا درد بھرے لہجے میں اثر انگیز اظہار کیا گیا ہے۔

کس کا ماتم کریں/کس کو روئیں یہاں/روز اک حادثہ/روز اک سانحہ/کتنے اپنے گئے/کتنے پیارے گئے/عشق والے گئے/حسن والے گئے/کتنے عالم گئے/کتنے فاضل گئے/کتنے شعر و ادب کے شناور گئے/خانقاہوں کے مجاور گئے/ہر طرف سنسنی/ہر طرف بے بسی

کووڈ کی ہلاکت خیزی میں کمی آنے کے بعد کے حالات کی بڑی اشاراتی ترجمانی ستیہ پال آنند نے اپنی نظم 'کرونا وائرس کے بعد' میں کی ہے۔

وہ جو ہر روز اپنی کھڑکی سے/دیکھتا ہے کہ دور سے کوئی/راہرو آئے اور وہ اس کو/گھر میں مدعو کرے محبت سے/بیٹھ کر گفتگو کرے اس کو/اس حقیقت کا کوئی علم نہیں؟/شہر کی موت ہو چکی اور وہ/اپنی کھڑکی سے جھانکنے والا/اک اکیلا ہے ساری دنیا میں/نسل کا آخری نمائندہ!

مزید مثالوں سے اجتناب کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ کووڈ 19 کے دور میں ذاتی، معاشی، سماجی اور سیاسی حالات میں جو اتار چڑھاؤ ہوا، انسانی چہروں کے جو خوشنما و بدنما رنگ سامنے آئے، رشتوں کی پامالی کی جو بھیانک نظیر ملی، پرنٹ میڈیا سے دوری اور الیکٹرونک میڈیا سے قربت کا جو رجحان ابھرا، وہ سب مل ملا کر ایک طرف ہر سوچنے والے اور حساس آدمی کو جھنجوڑ رہا تھا، اسے ذہنی سطح پر کچوکے لگا رہا تھا تاہم دوسری طرف نئے حربوں سے صارفیت بھی عروج پذیر ہو رہی تھی۔ صارفین کے لیے نیا دروازہ کھولا جا رہا تھا اور آن لائن کاروبار کا فروغ ہو رہا تھا۔ ان سب عوامل کا ادبیات عالم پر گہرا اثر ہوا۔ بدلے ہوئے نظام حیات اور ماحول میں شعر و ادب کے لیے نہ صرف وافر خام مواد فراہم ہوا اور موضوعات میں تازہ کاری ہوئی بلکہ نفسیاتی تجزیے کے نئے دروازے وا ہوئے۔ تخئیل کے تازہ کار زاویے ابھرے نیز ادبی اظہار و بیان کے جدید ابعاد اور امکانات پیدا ہوئے۔

■

Prof. Rais Anwer
Maheshpatti
Rajtoli Lane
Darbhanga-846004 (Bihar)
Cell: 7903767402 , 9471642697

ہندوستان میں نسائی نظم کے متنوع موضوعات

سفینہ بیگم

اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح، اردو نظم میں بھی خواتین نے اپنی تخلیقی استعداد کی بنیاد پر قابل قدر اضافے کیے اور یہ اضافے روایتی یا تقلیدی قسم کے نہیں ہیں بلکہ ان میں جہاں ایک طرف موضوع کی بوقلمونی ہے وہیں دوسری طرف لب و لہجے کی رنگارنگی بھی ہے۔ کبھی ان کی نظموں کے سبک اور مدھم لہجے قارئین کو ایسے ماحول اور فضا سے متعارف کرواتے ہیں جن میں ایک قسم کی کاٹ اور پوشیدہ طنز موجود ہوتا ہے، تو کبھی گرجدار آواز میں بالواسطہ تنبیہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ نظم نگار شاعرات کی نظموں میں مختلف رویوں کو برتنے کے نئے نئے انداز دیکھنے کو ملتے ہیں، جن میں یکسانیت نہیں ہے۔ ابتدائی نظم نگار خواتین کے یہاں نسائی معاملات اور معروضات کا بیان ایک احتجاجی منظر پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے جن میں عورتوں کے مسائل ان کی بے بسی، مرد اساس معاشرے کے ذریعے کیے جانے والے بے جا ستم اور پابندیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ ان کی نوعیت محض عورت اور مرد کے ظاہری احوال و کوائف ہی نہیں ہیں بلکہ داخلی کیفیت کی ان زنجیروں کو بھی ہلایا گیا ہے جو عرصہ دراز سے روح کے رین بسیرے میں زنگ آلود پڑی تھیں۔ خواتین شاعرات نے ان کیفیات کو لفظوں کا تخلیقی پیرایہ کمال ہنرمندی سے پہنایا ہے جس سے جذبے کی شدت تو ظاہر ہوتی ہی ہے۔ ساتھ ہی یہ تمام نظمیں قاری کی فکر کو بھی انگیز کرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ خواتین اپنی نظموں میں مظلومیت، سماجی آلودگی، تشخص کی پامالی اور پدرسری نظام کی نام نہاد ناموس کے بیان میں، جھنجھوڑنے والے سوال بھی قائم کرتی ہیں۔ ہندوستانی نظم نگار خواتین میں شفیق فاطمہ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، بلقیس ظفیر الحسن، شہناز نبی، شائستہ یوسف، تبسم نکہت، شبنم عشائی، فوزیہ فاروقی، اسنیٰ بدر، عاتکہ ماہین وغیرہ قابل ذکر ہیں جب کہ پاکستانی خواتین میں سارا شگفتہ، عذرا عباس، کشور ناہید، تنویر انجم، فہمیدہ ریاض، ادا جعفری، سدرہ سحر عمران، فاطمہ مہرو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ دیگر تخلیق کار خواتین بھی نظم کو اپنا پیرایہ اظہار بنا کر خیالات و معاملات کو مختلف انداز سے پیش کرنے میں کوشاں ہیں۔

نظم میں بھی چند دیگر اصناف کی طرح اظہار و بیان کے امکانات زیادہ ہیں۔ حالانکہ یہ صنف اوزان کی پابندی سے آزاد، خیال کی جس تہہ داری اور دبازت کا تقاضا کرتی ہے وہ آسان نہیں ہے، کیونکہ یہ محض لفظی گورکھ دھندا نہیں، بلکہ فکر و خیال کے معنوی عمق کا ایک ایسا کولاژ ہے جس میں مختلف رنگوں اور تصویروں کے کٹ پیسٹ سے، حقیقت کا رخ پیش کیا جاتا ہے۔ ان عوامل کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظم نگار خواتین نے، مرکزی خیال کو اپنے فکر و احساس اور الفاظ کے تخلیقی استعمال سے ایسی کہکشاں میں پرویا ہے جس سے اظہار و بیان کی کئی سطحیں سامنے آتی ہیں اور یہ صنف بیان کی وسعت کے حوالے سے مزید زرخیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں تو خواتین نظم نگاروں کے یہاں عالمی سطح کے یکساں موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ان موضوعات کو پیرایہ بیان کی مختلف صورتوں اور لب و لہجے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں جن نظم نگار خواتین کی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا ان میں شبنم عشائی، شہناز نبی، اسنیٰ بدر کو شامل کیا گیا

ہے۔ان شاعرات نے اپنے تخلیقی تجربات کے پیش نظر، موضوعات کے دائرے کو بھی وسیع کیا ہے۔ ساتھ ہی، نظم کی تشکیل میں، اس کے کرافٹ کے عمل میں بھی توسیع واقع ہوئی ہے۔ان کے یہاں تخلیقی وفور مختلف صورتوں میں اجاگر ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے ان کی نظموں کو موضوعات کی سطح پر پرکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

شبنم عشائی کا شمار اس عہد کی اہم نظم نگار خواتین میں ہوتا ہے۔ان کی نظموں کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آکر قبول خاص وعام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔شبنم عشائی کی نظموں میں محبت کے معنی محدود نہیں ہیں بلکہ وہ محبوب کے علاوہ بھی دیگر رشتوں میں محبت اور توجہ کی متمنی نظر آتی ہیں جہاں قربت اور اپنے پن کی تلاش میں ہجر اور تنہائی کی کیفیت کا بیان حاوی نظر آتا ہے۔ان کی نظموں میں جذبات کی رنگا رنگی اور رشتوں کی اہمیت کا ذکر قوی ہے خواہ وہ محبوب سے ہو یا باپ سے۔شکوے شکایت کے انداز

سے دکھ اور نارسائی کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔لیکن ان کی اکثر نظموں میں عورت اور مرد کا کردار موجود ہے۔شبنم عشائی کے یہاں خیالات سراسر ذاتی نوعیت کے محسوس ہوتے ہیں جو خود سے جڑی اشیا اور افراد سے لگاؤ کی خاطر اکثر کرب میں مبتلا نظر آتی ہیں۔عورت کو اپنے شوہر کی جانب سے کس نوعیت کے خدشات لاحق ہوتے ہیں، دوسری عورت کا غم، یا پھر مرد کی طرف سے دی جانے والی اذیتیں خواہ وہ غصے کی شکل میں ہو یا عورت کے جذبات و احساسات کی ناقدری کی صورت میں، تمام تر درد خیال کے بہاؤ میں پرودیے گئے ہیں۔ان کی نظموں میں وفا، امید، اعتبار، وعدہ، دغا، جھوٹ، سچ، عزت، دکھاوا جیسے معاملات کی بنیاد پر وجودی ٹوٹ پھوٹ کا عمل نمایاں ہے۔نظم۔

شک وشبہ کی کھرونچوں سے/ وفا کا چہرہ/ برباد نہ کرو/ وفا خدا کے صحن کا پھول ہے/ تم نے ویرانوں میں/ بے اعتباری کے ناخن/ بہت بڑھائے ہیں/ معلوم ہے/ درد کی شبنم/ ہر صبح/ اعتبار کا مصلی بچھاتی ہے/......ایک لمحہ/ مقدس جی لو/ وفا کا سجدہ کرلو

شبنم عشائی کی نظموں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ متکلم کسی خیال میں محو، اپنے مخاطب سے کلام کررہا ہے، جس میں مکالمے کی نوعیت یک طرفہ ہے۔ان کے یہاں عورت کا کردار مظلوم ومقہور کے طور پر ابھرتا ہے، جو حالات کی ستم ظریفی سے نالاں، زندگی سے بے زار ہو چکی ہے۔جذبات واحساسات کے متواتر کچلے جانے سے مایوسی کی کیفیت پائداری اختیار کر چکی ہے۔لیکن اس بے بسی اور درد میں بھی وہ اپنی بات کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے، اپنا حق طلب کرنا جانتی ہے۔ جہاں کھوجانے کا خوف ہر پل موجود ہے لیکن اس خوف میں ایک عزم اور پختگی کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔اس قسم کے حساس معاملات ومعروضات کا بیان شبنم عشائی نے اپنی نظموں میں نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے، جس سے معنی کی گہرائی کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے ساتھ ہی نسائی شعور وفکر کے ان نازک گوشوں تک بھی رسائی ہوتی ہے جو مجموعی طور پر عورت کی داخلی کیفیات کو منعکس کرتے ہیں ان میں بعض دفعہ سوال وجواب قائم کرنے کے مختلف انداز بھی ملتے ہیں۔ایک نہایت عمدہ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

میں نے انگلی نہیں/ من سونپا تھا/ تم نے رشتہ/ انگلی کو پہنایا/ من کا سناٹا/ انگلی کا ہاتھ پکڑے/ پرچھائیاں چنتا ہے/ آوازیں بجھنے پر بھی/ من کیوں رشتے بنتا ہے؟/ کیا تمھارے من کے ہاتھ نہیں/ جو دل کے سناٹے/ کھول دیں

شبنم عشائی کی نظموں کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ عورت ہر مقام پر مفعولی حیثیت رکھنے کے باوجود مضبوط فاعل کردار کے طور پر موجود رہتی ہے۔ اظہار وبیان کی نوعیت میں وہ ایک آبجیکٹ صورت میں اپنی ذات کا اظہار کرتی ہے لیکن مرد معاشرے کی نظر میں خود کو ایک سبجیکٹ کی حیثیت سے پیش کرتی نظر آتی ہے۔

شہناز نبی کی نظمیں بھی باشعور نسائی فکر اور سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل ومعاملات کی حامل منفرد شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔'اگلے پڑاؤ سے پہلے' اور 'پسِ دیوارِ گریہ' ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔ان کی بعض نظموں کا وصف یہ ہے کہ وہ اپنی آواز میں سماج کی آواز اور ان کی ترجیحات کو بھی شامل کرتی دکھائی دیتی ہیں جس سے ان کے یہاں پیش کردہ مسائل ذاتی نہ ہو کر اجتماعی بن جاتے ہیں۔تاریخی اور مذہبی واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے خیال کو، موجودہ صورت حال کے تناظر میں پیش کرنے نیز عورت کے تئیں پسماندہ خیالات رکھنے والوں پر طنز کا رویہ بھی ان کے یہاں ملتا ہے اس ضمن میں نظم 'حسینؓ! قوی کو تھائے' اور 'تاریخ کے مردہ خانے سے' اہم ہیں۔ جن میں بیان کو استعاراتی طرز پر تشکیل دیا ہے۔ ان کے یہاں عورت روتی بسورتی، کم ہمت اور لاچار نہیں ہے بلکہ باہمت اور پرعزم ہے۔ان کی نظموں میں موضوعات کا تنوع ہے جن میں خود آگاہی کا عمل نمایاں ہے۔ دو نظریوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم نے اپنے پیچھے جس بھائی چارہ، رواداری، اخوت ومحبت جیسے انسانی عناصر کو خیرآباد کہہ دیا تھا جہاں لکیر نے صرف سرحد ہی نہیں بنائی بلکہ دلوں میں بھی لکیریں کھینچ دیں، اس کو حوالہ بناتے ہوئے شہناز نبی نے کمال فنی ہنرمندی سے خیالات کو تشکیل دیا ہے جس میں آپسی برابری کو اہمیت دی ہے۔ان کی نظم 'پاپ' اس ضمن میں قابلِ تحسین ہے۔ نظم اس طرح ہے۔

برا نہ مانو/ نمازیں اب بھی یہیں پڑی ہیں/ یہ سجدہ گاہیں اٹھا کے جانے کدھر چلے تھے/ وہ صبح تم کو بھی یاد ہوگی/ الگ تھے گھر اور علیحدہ چولہے/ تمھارے پرچم کا رنگ الگ تھا/ وطن تمھارا نیا نیا تھا/ ابھی تو بانٹا تھا آدھا آدھا/ مگر پڑی ہے وہاں پہ اب تک/ ہماری رادھا کی ایک پائل/ ہمارے کرشنا کی ایک بنسی/ پہ ہیر کیسے اٹھا کے دے دیں/ کہاں سے لائیں تمہارا رانجھا

اس کا آخری حصہ یوں ہے۔

جنھیں تھا سود وزیاں سے مطلب/ وہ کاروبار جہاں سے رخصت/ یہ آگ اب بھی بھڑک رہی ہے/ چلو بزرگوں کا پاپ دھوئیں/ ہمارے مندر سنبھالو تم سب/ تمھاری مسجد کے ہم نگہباں

ان کی نظموں کا لب ولہجہ کرخت اور تلخ آمیز ہے جو ہر مسئلے پر آواز اٹھاتا ہے۔نظموں میں لفظیات کا انتخاب خوب ہے جو نظم کو پیچیدہ بنانے کے ساتھ اس میں زور پیدا کرتا ہے۔ان کی اکثر وبیشتر نظموں میں ابہام ہے۔لیکن

یہ ابہام نظم کو معمہ نہیں بناتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض نظموں کی کئی قرأت کے بعد ہی اس کی معنوی جہات آشکار ہو پاتی ہیں۔

اسنیٰ بدر (1971) کی نظموں کا مجموعہ 'منظر نامہ' کے عنوان سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اسنیٰ بدر کی نظموں میں خانگی اور معاشرتی زندگی کے معاملات کا بیان، ایک اجتماعی ثقافتی تجربے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کی نظموں میں وہ کیسی عورتیں تھیں، مارہرہ، ہم ایسے قصبے والے تھے، خواب نگر، بہت جی چاہتا ہے، اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ بچپن کی وہ یادیں جنھیں ہم سب اکثر کسی نہ کسی حوالے سے یاد کرتے ہیں ان کے یہاں تصویروں کی شکل میں ڈھل گئی ہیں۔ ایسی تصویریں جو پل بھر میں ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی نظم 'سب بھول گئی ہوں میں' میں فراموشی کی جس متضاد کیفیت کو پیش کیا ہے وہ کسی دوسری شاعرہ کے یہاں نہیں ملتی۔ بھول جانے کا یہ عمل، دراصل سماج کو گذشتہ طرز حیات، یاد دلانے کی ایک کوشش محسوس ہوتا ہے جس میں جدید طرز زندگی کو اپنا کر، ہم قدیم معمولات زیست کی سحر آفرینیوں کو فراموش کر بیٹھے ہیں، جو حقیقت میں خواب بن کر رہ گئیں ہیں۔ نظم یوں ہے۔

کچھ یاد نہیں مجھ کو/ سب بھول گئی ہوں میں/ دل جیسا کھلا آنگن/ گرتے ہیں جہاں جامن/ ہر اینٹ میں ایک درپن/ وہ میرا رخ روشن/ کچھ یاد نہیں مجھ کو/ سب بھول گئی ہوں میں

اس نظم کا آخری حصہ پوری نظم کی معنوی سطح کو اجاگر کر دیتا ہے کہ۔

اے بادِ صبا جاؤ/ مجھ کو نہ یوں چونکاؤ/ میں نیند سے بے پرواہ/ تم خواب نہ دکھلاؤ/ کچھ یاد نہیں مجھ کو/ سب بھول گئی ہوں میں

اس میں نیند سے بے پرواہ، خواب نہ دکھلانا، یاد نہیں ہونا، بھول جانا، یہ تمام تراکیب خیال کی فکری جہت کے ایسے متضاد تصورات کی بازیابی کا عمل بھی ہیں جو ہماری اجتماعی سائکی کا حصہ ہیں۔ ہمیں نیند اس وقت نہیں آتی ہے جب ہم کسی بات یا کسی چیز کو یاد کر رہے ہوتے ہیں اور یہاں نیند سے بے پرواہی کا عمل، مسلسل یادیں ہیں، لیکن پھر یہ کہنا کہ کچھ یاد نہیں مجھ کو، اسنیٰ بدر کے تخلیقی وفور کو پیش کرتا ہے۔ یہاں لفظ خواب کا تخلیقی استعمال کمال خوبی سے کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے نیند نہ آنے کی صورت میں خواب بھی کوسوں دور ہوتے ہیں لیکن یہاں خواب سے مراد، وہی گزرے ہوئے واقعات ہیں، جن کو متکلم نے پوری نظم میں یاد کیا ہے۔ جس کو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اب ان کی حیثیت محض خواب کی ہے۔ اسنیٰ بدر کی نظمیں بظاہر گزرے ہوئے واقعات کا منظر نامہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں یہ تہذیب وثقافت کا وہ سرمایہ ہیں جہاں سماجی اقدار پروان چڑھتی تھیں، جہاں رشتوں کی اہمیت کا احساس جاگزیں تھا، جہاں سیکھنے کا عمل ہر گام پر جاری رہتا تھا۔ دراصل یہ نظمیں تفریح گاہ نہیں بلکہ ماضی کا نوحہ ہیں۔ ایسا ماضی جس سے ہم مکمل طور پر کٹ چکے ہیں۔ قرابت داریاں ختم ہو چکی ہیں، سب اپنے خول میں بند ہیں۔ جدید طرز زندگی نے جن مصنوعی ترجیحات کو ہماری ذات کا حصہ بنا دیا ہے، یہ نظمیں بالواسطہ اس پر ضرب کاری کرتی نظر آتی ہیں۔ نظم خواب نگر ملاحظہ ہو۔

موجودہ تانیثی شاعری میں ہندوستانی نظم نگار خواتین نے فکروخیال کو جن معنوی جہات پر تشکیل دیا ہے گرچہ وہ اردو ادب میں بہت نئے نہیں، مگر نسائی حوالے کے طور پر اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے محض تانیثی معاملات کو ہی اپنا محور ومرکز نہیں بنایا، بلکہ دیگر مضامین و معاملات کو جس عدسے سے دنیا کو دیکھنے اور دکھانے کی جہد ان کی نظموں میں ملتی ہے اس کو نسائی نقطہ نظر کے وسیع فہم کی ایک صورت پر محمول کیا جا سکتا ہے جس میں تعبیر کے کئی پہلو پوشیدہ نظر آتے ہیں۔

جب چہرے پر شادابی تھی/ کرنوں کی آنکھ گلابی تھی/ جب لُو اور دھوپ میں پھرتے تھے/ املی کے بوٹے گرتے تھے/ چوٹی بندھ کر کھل جاتی تھی/ امی کے ہاتھ نہ آتی تھی/ چھجے پر چڑیا رہتی تھی/ اور جمنا پاس ہی بہتی تھی/ دورے سے ہنسی کے پڑتے تھے/ غم سے مل جل کر لڑتے تھے/ وہ وقت بڑا البیلا تھا/ سب ساتھ تھے کون اکیلا تھا

اور نظم کا آخری حصہ

یادوں کے وطن سو بار گئے/ بوجھل لوٹے، لاچار گئے/ سب ساتھی پربت پار گئے/ اس دوڑ میں ہم سب ہار گئے

اسنیٰ بدر کے یہاں ماں کا کردار بھی جا بجا ملتا ہے اس کے علاوہ عورت کے حوالے سے بھی نظمیں کہی ہیں۔ عورت کے تئیں جو رویہ ان کی نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے وہ یہ کہ عورت مرد کی خوشنودی کے لیے بہت سے کام کرتی ہے، وہ باورچی خانے سے جڑی ہوتی ہے اور ایک مرد کے لیے خود کو سجاتی سنوارتی ہے۔ لیکن اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی خواہشیں، مرد کو سمجھ میں نہیں آتیں اور آخر کار وہ سوال کر بیٹھتی ہے۔ نظم 'تمھیں کیا چاہیے' ملاحظہ ہو۔

نعمتوں سے سجی ہوئی میز/ خوشبوؤں میں بسا سنگھار دان/ لذتوں سے مہکتا ہوا باورچی خانہ/ رنگوں سے ڈھکی ہوئی الماری/ موجودگی سے بولتا ہوا کمرہ/ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں... /تمھیں کیا چاہیے؟/ بولو/ تمھیں کیا چاہیے؟

مذکورہ نظم کا یہ جملہ 'آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں' اپنے اندر بے انتہا کرب لیے ہوئے ایک ایسا سوال ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت مرد کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسی لیے یہ سوال بھی جس میں جواب از خود موجود ہے، مرد کی روایتی ترجیحات میں شامل نظر آتا ہے، جس میں عورت کے احساسات وکیفیات سے صرف نظر کرنے کا رویہ واضح ہے۔ نظم 'عجلت' اور 'میرا خط' میں خارجی رویوں اور داخلی کیفیات کا بیان کہیں بے بسی لیے ہوئے ہے تو کہیں اس میں انکشاف ذات کا عمل نمایاں ہے۔ اسنیٰ بدر کی نظموں کا لہجہ، احتجاجی اور انداز بلند بانگ نہیں ہے۔ ایک بہاؤ کی کیفیت ہے۔ نیز سبک اور نرم لہجے میں بھی، ترسیل کا عمل قوی معلوم ہوتا ہے اور ان کی نظموں کی فکری جہات قاری پر آشکار ہو جاتی ہیں۔

موجودہ تانیثی شاعری میں ہندوستانی نظم نگار خواتین نے فکروخیال کو جن معنوی جہات پر تشکیل دیا ہے گرچہ وہ اردو ادب میں بہت نئے نہیں، مگر نسائی حوالے کے طور پر اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے محض تانیثی معاملات کو ہی اپنا محور ومرکز نہیں بنایا۔ بلکہ دیگر مضامین و معاملات کو جس عدسے سے دنیا کو دیکھنے اور دکھانے کی جہد ان کی نظموں میں ملتی ہے اس کو نسائی نقطہ نظر کے وسیع فہم کی ایک صورت پر محمول کیا جا سکتا ہے جس میں تعبیر کے کئی پہلو پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ مذکورہ نظموں کے مطالعے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیال کے تخلیقی استعمال اور اس کے بنیادی سروکار کو نظموں میں جن پیرایوں سے ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور فکری گہرائی سے، معنوی تعمق کی جو فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس حوالے سے تجربات کے مزید امکانات نظر آتے ہیں جو مایوس کن نہیں ہیں۔

■

Safeena Begum
Flat No.: 407, Tower B-17
Supertch Ecovillage-1
Greater Noida - 201306 (UP)
Mob.:8171986935

سید وجاہت مظہر

خواب باقی ہیں
ایک تجزیاتی مطالعہ

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ''سوانح نگاری کسی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے۔'' اردو زبان میں اس صنف ادب کا چلن انگریزی ادب کے توسط سے عام ہوا۔ حالی، سرسید احمد خاں، شبلی، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی نے جدید معنوں میں سوانح نگاری کے فن کو پروان چڑھایا۔ سوانحی ادب میں اصطلاح خود نوشت سوانح عمری کا استعمال 1809 میں شروع ہوا۔ فرہنگِ آصفیہ میں خودنوشت سوانح کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''سوانح عمری، اسم مذکر، سرگزشت کسی شخص کی زندگی کا حال، تذکرہ، کسی عالم خواہ فاضل خواہ بڑے بڑے کام کرنے والے یا بہادر یا حاکم کے وہ واقعات جو اس کی عمر میں گزرے ہیں۔''

وہاج الدین علوی نے اپنی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ'' میں خودنوشت سوانح نگاری کی مبسوط تعریف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''1. خودنوشت کسی فردِ واحد کی داستان ہوتی ہے جسے اس نے خود اپنے قلم سے تحریر کیا ہو۔
2. خودنوشت سوانح نگاری کا محور مصنف کی ذات ہوتی ہے، دوسرے اشخاص یا واقعات کا ذکر محض ذیلی و ضمنی طور پر ہوتا ہے۔
3. خودنوشت سوانح میں سچائی کا عنصر ہوتا ہے۔
4. خودنوشت میں اس فردِ واحد کے تجربات، مشاہدات اور جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیات کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔
5. خودنوشت سوانح زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے۔ یعنی اس میں صاحبِ سوانح کی اپنی زندگی کے ہر دور کے نمائندہ واقعات ہوتے ہیں۔ اُس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے نیز اُس کے عروج و زوال اور نشاط و غم کی داستان ہوتی ہے۔
6. خودنوشت کا فن ایک انتخابی فن ہے۔ زندگی کے عریض و بسیط تجربات سے اہم اور نمائندہ نیز نتیجہ خیز واقعات کا انتخاب کر کے انھیں ایک تخلیقی مرقع میں سجایا جاتا ہے۔

(وہاج الدین علوی، اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1989، ص 41-40)

خودنوشت سوانح نگار کے یہاں اپنے معاشرے کے مسائل سے واقفیت لازمی خصوصیات میں شامل ہے۔ اپنے معاشرے اور سماج سے مصنف کی گہری وابستگی اور اپنے ماحول اور زمانے سے اس کی آگہی اس کے قلم میں جھلکتی ہے اور وہ اپنے دور کی تہذیب و تمدن کی تصویر کشی کے ذریعے اپنی عصری آگہی کا ثبوت دیتا ہے کیونکہ مصنف اپنے عہد کے حالات و واقعات سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی تحریر کے توسط سے اس کا جا بجا اظہار کرتا ہے۔

اردو میں ابتدا ہی سے خودنوشت نگاروں نے اس ضمن میں گہرے عصری شعور کا ثبوت دیا اور یہ سلسلہ عصرِ حاضر میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ عصری آگہی کے تحت لکھی گئی اردو خودنوشتوں کی بہترین مثالیں مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت 'کالا پانی'، سید ظہیر الدین دہلوی کی خودنوشت 'داستانِ غدر'، نواب سلطان جہاں بیگم کی خودنوشت 'تزکِ سلطانی'، خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت 'آپ بیتی'، سرسید رضا علی کی خودنوشت 'اعمال نامہ'، سردار دیوان سنگھ مفتون کی خود نوشت 'ناقابلِ فراموش'، ملا واحدی کی خودنوشت 'میرے زمانے کی دلی'، عبدالماجد دریا بادی کی خودنوشت 'آپ بیتی'، زہرا داؤدی کی خود نوشت 'گرداب کی شناوری'، قدرت اللہ شہاب کی خود نوشت 'شہاب نامہ'، گوپال متل کی خودنوشت 'لاہور کا جو ذکر کیا'، پروفیسر کلیم الدین احمد کی خودنوشت 'اپنی تلاش میں'، مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت 'زرگزشت'، وارث کرمانی کی خودنوشت 'گھومتی ندی'، کشور ناہید کی خودنوشت 'بری عورت کی کتھا'، رام لعل کی خودنوشت 'کوچۂ قاتل'، رفعت سروش کی خودنوشت 'بمبئی کی بزم آرائیاں' وغیرہ ہیں۔

اگر کسی مصنف کی زندگی کا بیشتر حصہ ادبی کاموں میں گزرا ہو تو جا بجا وہ ادبی مسائل کو حل کرتے ہوئے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں سے اپنے باہمی رشتوں اور ادبی نوعیت کی معرکہ آرائیوں کا بھی ذکر کر سکتا ہے اور درجہ بندی کے لحاظ سے ایسی خود نوشت سوانح حیات 'ادبی خودنوشت سوانح عمری' کہی جا سکتی ہے۔ اردو میں ادبی خودنوشت سوانح عمریوں کی بہترین مثالیں جگر بریلوی کی کتاب 'حدیثِ خودی'، پروفیسر اعجاز حسین کی 'میری دنیا'، جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات'، ڈاکٹر کلیم الدین احمد کی 'اپنی تلاش میں'، رشید احمد صدیقی کی 'آپ بیتی'، عبدالماجد دریابادی کی 'آپ بیتی'، مرزا ادیب کی 'مٹی کا دیا'، قرۃ العین حیدر کی 'کارِ جہاں دراز ہے' اور پروفیسر آل احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں' تسلیم کی جاتی ہیں۔

جگر بریلوی کی خودنوشت 'حدیثِ خودی' 1959 میں شائع ہوئی۔ جگر بریلوی کی شاعری اور شخصیت درمیانی درجے کی مانی جاتی ہے۔ مگر انھوں نے اپنی خودنوشت میں اپنے داخلی اور خارجی رجحانات کو بخوبی پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے احساسات اور کیفیات کو پیش کرنے

کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کا بھی خود تجزیہ کیا ہے۔خود نوشت 'میری دنیا' میں پروفیسر اعجاز حسین نے اپنے ذاتی حالات کے ساتھ میدانِ ادب میں اپنے کارہائے نمایاں کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔یہ آپ بیتی انھوں نے اپنے شاگردوں کے نام معنون کی ہے۔یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شاگردوں سے ان کا گہرا لگاؤ تھا۔آپ بیتی 'یادوں کی دنیا' میں ڈاکٹر یوسف خاں نے اپنے ادبی اور سیاسی تجربات و مشاہدات کو بیان کیا ہے۔انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قلمبند کرنے کے ساتھ اپنے ادبی کاموں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے اہم سیاسی واقعات کو بھی ضبطِ تحریر کیا ہے۔ 'یادوں کی برات' میں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنی نجی اور ادبی زندگی کی کشمکش اور سیاسی حالات کے علاوہ اپنی شاعری اور مختلف اصنافِ ادب پر اپنے افکار پیش کیے ہیں۔انھوں نے اس آپ بیتی میں بڑی راست گوئی سے کام لیا ہے۔اپنی شخصیت کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ اپنی خامیوں کو بھی بلا کم و کاست قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔اردو زبان و ادب میں جوش کی خودنوشت سوانح عمری 'یادوں کی برات' کا اہم اور مستقل مقام ہے۔ڈاکٹر کلیم الدین احمد کی آپ بیتی 'اپنی تلاش میں' کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جتنے کامیاب ناقد رہے ہیں اتنے کامیاب خودنوشت نگار نہیں تھے۔ان کی آپ بیتی میں عجیب انتشار جھلکتا ہے۔ انھوں نے جابجا غیر ضروری واقعات قلمبند کیے ہیں۔انھوں نے اپنے والد کی ایک نظم کو بھی اس میں شامل کیا ہے جس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ان تمام خامیوں کے باوجود یہ آپ بیتی مصنف کی ادبی زندگی کو سمجھنے میں کسی حد تک مدد ضرور کرتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تصنیف 'آپ بیتی' دراصل ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مصنف کے خودنوشت سوانحی عناصر پر مبنی مضامین اور کتابوں سے اخذ کر کے ترتیب دی ہے۔ مرتب نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔اس مرتبہ خودنوشت سوانح حیات میں رشید احمد صدیقی کی زندگی کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت سوانح حیات کا عنوان بھی 'آپ بیتی' ہی ہے۔عبدالماجد دریابادی ایک بڑے ادیب، صحافی اور مفسرِ قرآن تھے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو دیانتداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کتاب کا بنیادی عنصر اس کا اسلوب اور اس میں پائی جانے والی ادبیت ہے۔ان کی شخصیت ہی کی طرح ان کا اندازِ بیان بھی سچا، پاکیزہ اور شائستہ ہے۔اس خودنوشت سوانح حیات کا شمار اردو کی بہترین آپ بیتیوں میں کیا جاتا ہے۔'مٹی کا دیا' مرزا ادیب کی خودنوشت ہے۔ یہاں مرزا ادیب نے اپنی خانگی اور ادبی زندگی کو بڑی صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کا اسلوب صاف ستھرا اور اچھوتا ہے۔اس میں انھوں نے بچوں کی نفسیات کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔سیکڑوں صفحات پر مبنی قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی 'کارِ جہاں دراز ہے' کا اردو زبان و ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔اس میں انھوں نے اپنے حسب و نسب، عزیز و اقارب اور اسلاف کا بڑا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے۔اس آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کو بھی فنی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔آپ بیتی کا بنیادی اسلوب افسانوی ہے۔اپنے اسلوب کی بنا پر اسے سوانحی ناول کے قریب تر مانا جاتا ہے۔ بیشک 'کارِ جہاں دراز ہے' مصنفہ کا ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ یہ سب آپ بیتیاں ادبی خودنوشت سوانح عمریوں کے زمرے میں آتی ہیں۔

ہر خودنوشت نگار خودنوشت سوانح عمری تحریر کرنے سے پہلے ہی سے اچھی طرح یہ جانتا ہے کہ اسے اس فن کے تقاضے کے تحت صداقت و دیانتداری سے کام لینا چاہیے، کیونکہ وہ خود ہی تصنیف کا ہیرو بھی ہوتا ہے اور راوی بھی تو اپنے آپ سے محبت اور سماج کا خوف اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ بعض سچائیوں پر نقاب ڈال دے اور بعض حقائق کی ہو بہو تصویر کشی کے بجائے ایک متوازی تخیلی، تخلیقی پیکر تراشی کا مرتکب بنے جو دلچسپ بھی ہو اور اس کے خیالات و افکار کی توضیح و ترجمانی بھی کرتی ہو۔یہ متوازی پیکر تراشی یقیناً اصل زندگی سے کسی حد تک جدا ہوتی ہے اور آپ بیتی کو صداقت و دیانتداری کے میزان پر کھرا نہیں اترنے دیتی ہے۔لہٰذا، اکثر خودنوشت نگار اپنے ظاہری و باطنی حقائق کو پیش کرتے وقت سچائی و صداقت پر مبنی اصول و ضوابط کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔شہرت طلبی کا جذبہ معمولی صلاحیت کے ادیبوں اور مصنفوں کو خودنوشت نگاری کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ نتیجتاً ہر کوئی ادیب و شاعر ایک عدد خودنوشت لکھ کر اپنی شخصیت سازی کی تگ و دو میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صنفِ ادب کو اپنا تختۂ مشق بنانے پر آمادہ ہونے لگتا ہے۔ اسی صورتِ حال نے شورش کاشمیری کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ ''بین الاقوامی ادب سے قطع نظر اردو میں جس قدر خود نوشت سوانح عمریاں ہیں، ان میں شاعری زیادہ اور اصلیت کم ہے۔'' شورش کاشمیری سے پہلے گوئٹے نے اپنی زندگی کی روداد کو 'شاعری اور سچائی کا مرکب' قرار دیا تھا۔غالباً لفظ 'شاعری' کا استعمال شورش کاشمیری اور گوئٹے دونوں نے اندازِ بیان کے معنوں میں کیا ہے۔اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش میں دونوں میں تخلیقیت اور کشش تو مصنف حسبِ توفیق اور حسبِ صلاحیت فطرتاً شامل کرے گا ہی، طرزِ نگارش کی انفرادیت کا کوئی بھی اہلِ نظر معترض کیوں کر ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر مہدی حسین خودنوشت نگاری کو مصنف کی ظاہری و باطنی زندگی کی کشمکش کی تخلیقی اظہار کا وسیلہ قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ حقیقت و تخیل کی آمیزش ہی سے خودنوشت سوانح حیات معرضِ وجود میں آتی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''خودنوشت سوانح میں مصنف کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس کی زندگی کے وہ مختلف واقعات جو اس کی ظاہری اور باطنی زندگی کے درمیان کشمکش کا باعث ہوتے ہیں، اس کا موضوع ہوتے ہیں اور جن کا تخلیقی اظہار کر کے جن میں حقیقت اور تخیل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے، مصنف خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر مظہر مہدی حسین، مشمولہ 'بیسویں صدی میں اردو ادب' دہلی، ساہتیہ اکادمی 2002 ص 335-336)

آل احمد سرور نے اپنی خودنوشت 'خواب باقی ہیں' کے دیباچے میں اس صنفِ ادب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''خودنوشت سوانح عمری کا فن چونکہ محض نظارے نہیں، نظر کا بھی فن ہے۔ اس لیے سائنسی صحت اور واقعیت کے بجائے ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کی اہمیت شاید یہاں زیادہ ہے۔خودنوشت تاریخ نہیں ہے مگر اس میں تاریخی حقائق ضروری ہیں۔ یہ واقعات کا خشک بیان بھی نہیں ہے۔ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے۔''

(خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، گلشن ہاؤس، لاہور، 1994، ص 3)

پروفیسر گیان چند جین کا مقولہ ہے کہ آپ بیتی لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے۔ سوانح عمری بیانیہ صنف ہے جو تاریخ کی طرح مکمل غیر جانب داری اور صحت مانگتی ہے۔ انھوں نے بالکل درست فرمایا تھا کہ ''خودنوشت سوانح لکھنا بڑے آدمیوں کو ہی زیب دیتا ہے۔'خواب باقی ہیں' کو پڑھ کر پہلا تاثر یہی ہوتا ہے کہ ایک بڑے آدمی کی سوانح ہے جو اپنے زمرے میں بالیقین ممتاز ہے۔'' یقیناً ''خواب باقی ہیں'' ہر لحاظ سے اردو زبان و ادب کے ایک بڑے آدمی کی سوانح حیات ہے،

جس کی شخصیت اور فن کی تحریکی و ترغیبی اہمیت مسلم ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار ملک کے ممتاز و معتبر ادیبوں، نقادوں اور شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں وہ ادبی تنقید کے حوالے سے اپنی خصوصی پہچان رکھتے ہیں۔ آل احمد سرور 1911 میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال 9 فروری 2002 میں ہوا۔ انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1974) اور پدم بھوشن (1991) سے نوازا گیا۔ ان کے آبا و اجداد مصر کے فرشور نامی قصبے سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے والد محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔ والد کے مختلف مقامات پر تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا وہ زمانۂ طالب علمی میں سیتا پور، بجنور، گونڈہ، غازی پور اور آگرہ وغیرہ میں رہے۔ اس طرح ان کی تعلیم مختلف شہروں میں ہوئی۔ انھوں نے آگرہ کے سینٹ جونسن کالج سے سائنسی مضامین سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور وہیں 1934 میں لیکچرر کے منصب پر

علی گڑھ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے کچھ عرصے بعد آل احمد سرور نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کا عہدہ سنبھالا۔ یہاں کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو آل احمد سرور نے بڑے موثر پیرائے میں اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔

فائز ہوگئے۔ آل احمد سرور کی آپ بیتی 'خواب باقی ہیں' 1990 میں شائع ہوئی۔ انھوں نے اس میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ اس خودنوشت میں انھوں نے مختلف ممالک کے دوروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور احتشام حسین جیسی شخصیات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ کہ آل احمد سرور ایک منفرد طرز تحریر کے مالک تھے۔ مگر اس آپ بیتی میں اکثر جگہ ربط و تسلسل کا فقدان پایا جاتا ہے۔ آل احمد سرور کی ریاست رامپور سے بھی گہری وابستگی رہی تھی۔ انھوں نے وہاں رضا انٹر کالج میں پرنسپل کے طور پر کام کیا تھا۔ یہاں ان کے خواجہ غلام السیدین، کرنل بشیر حسین زیدی، مولانا امتیاز علی عرشی، وجد علی خاں رشک، مولوی عبدالسلام، کرنل عطاالرحمٰن اور بیگم قدسیہ زیدی سے گہرے روابط رہے۔ وہ رامپور کے لوگوں کی سرشت سے متعلق بڑے دلچسپ کلمات تحریر کرتے ہیں:

''رام پور کے پٹھان بڑے مخلص ہوتے ہیں۔ میرا قیام رامپور میں بہت مختصر رہا۔ مگر وہاں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔ یہ لوگ خلوص کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ مزاج میں کچھ اکھڑپن ہے مگر بڑی محبت کرنے والے، بڑے مہمان نواز، بڑے دل والے لوگ ہیں۔ بدقسمتی سے یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ شہر سے باہر ایک چھوٹا سا طبقہ جدید خیالات والوں کا تھا۔ ان لوگوں کے یہاں پردے کا رواج نہ تھا مگر شہر میں وہی پرانا ڈھرا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف حکومت نے توجہ کی تھی مگر عورتوں میں شرح خواندگی خاصی کم تھی۔ زیدی صاحب نے رام پور کی شکل دی تھی۔ اسٹیشن کے سامنے کا علاقہ بڑا خوبصورت تھا۔ بڑی سڑکیں کشادہ اور ہموار تھیں۔ شہر میں یہ بات نہ تھی۔ زندگی کا محور نواب صاحب اور ان کا دربار تھا۔ زیدی صاحب کی کوشش سے کئی صنعتی ادارے بھی قائم ہو گئے تھے جن کی وجہ سے ریاست کی آمدنی بڑھی تھی اور کچھ لوگوں کو روزگار بھی ملا تھا۔ میری ملاقاتیں زیادہ تر عرشی صاحب، واجد علی رشک، مولوی عبدالسلام، کرنل عطاالرحمٰن جو اقبال کے شاگرد رہے تھے۔'' (ایضاً، ص 123)

علی گڑھ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے کچھ عرصے بعد آل احمد سرور نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کا عہدہ سنبھالا۔ یہاں کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو آل احمد سرور نے بڑے موثر پیرائے میں اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ یہاں انہیں نورالحسن ہاشمی، محمد تقی، رشید جہاں، قاضی عبدالغفار، چودھری محمد علی ردولوی، آنند نارائن ملا، ڈاکٹر فریدی، مسعود حسن رضوی ادیب، چندر بھان گپتا، سلام مچھلی شہری، رضیہ سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی، مانی جائسی، بسمل شاہ جہاں پوری، یگانہ یاس چنگیزی، احسن فاروقی، اثر لکھنوی، حسرت موہانی، علی عباس حسینی، وی پی مینن، کنہیا لال کپور، پرشوتم داس ٹنڈن، سمپورنا نند وغیرہ کے ساتھ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے کے مواقع ملے۔ باب بعنوان 'لکھنؤ' 21 اگست 1946 سے 30 نومبر 1955 تک کی روداد پر مشتمل ہے۔ اپنے لکھنؤ پہنچنے کے فوری بعد جب وہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور فارسی پہنچے تو وہاں کے دلچسپ تجربات انھوں نے باب 'لکھنؤ' میں خصوصی طور پر بیان کیے ہیں۔ مثلاً:

''لکھنؤ پہنچ کر میں نے دوسرے دن ہی شعبۂ اردو اور فارسی میں اردو کے ریڈر کا چارج لیا۔ مسعود حسین رضوی صدر شعبہ تھے۔ وہ میرے آنے سے کچھ خوش نہیں معلوم ہوئے۔ احتشام حسین بھی اسی جگہ کے امیدوار تھے۔ ان سے پہلے سے ملاقات تھی۔ وہ اچھی طرح ملے۔ نورالحسن ہاشمی تو میرے آنے سے بہت خوش تھے۔ شعبے میں اس وقت عبدالقوی فانی اور یوسف حسین موسوی فارسی میں لیکچرار تھے۔ احتشام حسین اور نورالحسن ہاشمی اور محمد تقی اردو میں لیکچرار تھے۔ محمد تقی نیک آدمی تھے۔ جوانی میں انتقال کر گئے۔ یہ سابق لیکچرار سید محمد حسین کے صاحبزادے تھے۔ مسعود صاحب کا کمرہ الگ تھا۔ ایک دوسرے کمرے میں ہم سب بیٹھتے تھے۔ چند روز فانی صاحب اور موسوی صاحب دونوں مسعود حسن رضوی صاحب کو میرے سامنے برا بھلا کہتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح میں ان کے قریب ہو جاؤں گا۔ مگر دو تین دن ان کی کتھا سننے کے بعد میں نے کہہ دیا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ مجھے مسعود صاحب کے خلاف کوئی محاذ بنانا ہے۔ وہ جو صحیح بات کریں گے، میں اس کی تائید کروں گا۔ غلط بات ہوگی تو ضرور اختلاف کروں گا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس زمانے میں ایم اے اردو میں چھ سات طالب علم تھے۔ ہاں بی اے کے ہر کلاس میں سو سے اوپر طلبا ہوتے تھے اور ان میں غیر مسلم طلبا کی تعداد بھی قابل لحاظ ہوتی تھی۔ 1947 کے بعد غیر مسلم طلبا بہت کم ہو گئے مگر بی اے میں کچھ پھر بھی آجاتے تھے۔ لکھنؤ میں اس وقت ممتاز اساتذہ کی خاصی تعداد تھی۔'' (ایضاً، ص 126)

آل احمد سرور اردو کے اچھے نقاد، شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے تنقیدی نظریات پر بڑی اہمیت کی حامل کتابیں لکھیں اور وہ تا حیات مختلف ادبی تحریکات سے وابستہ رہے۔ تعلیمی و تدریسی اداروں سے متعلق ان کے مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر انھوں نے یونیورسٹی اساتذہ سے متعلق جو بڑی بے باک سچائیاں اُجاگر کی ہیں، وہ عہدِ حاضر کی تلخ صداقتوں پر مبنی ہیں:

''آزادی کے بعد یونیورسٹیوں کے وسائل میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ مگر کیا ہم ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ ان وسائل کا جائز استعمال کیا گیا ہے اور ریوڑیاں نہیں بانٹی گئی ہیں۔ باہر کے ملکوں میں اساتذہ کے چند سال کے لیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ مگر یہ مدت تین سال سے زیادہ نہ ہو، اور کسی شعبے کے ایک تہائی سے زیادہ استادوں کو ایک وقت میں باہر جانے کی اجازت کسی حال میں نہ دی جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ مقبولیت کی ایسی ہوا چلی ہے کہ وائس چانسلروں کو ادارے کا مفاد دیکھنے کے بجائے چند اشخاص کا ذاتی فائدہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے استاد صارفیت (consumerism) کے

چکر میں آگئے ہیں۔ ان کا یہ حق ضرور ہے کہ سماج انہیں مادی آسودگی اور ذہنی آزادی دے۔ مگر affluence تعیش ان کی زندگی کا نصب العین نہ ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ آج کل کی نسل کو میری یہ باتیں دقیا نوسی معلوم ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ میں علم کے گہواروں کو نفع کا کاروبار بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ آج کی یونیورسٹیوں میں سبھی گئے گزرے ہیں۔ ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ضرور ہوگی جو ملک وقوم کی آبرو اور علم وفن کے چشم و چراغ ہوں گے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثریت اس ذیل میں نہیں آتی اور کسی طبقے یا ادارے کے متعلق اندازہ اس کی اکثریت سے ہی لگایا جاتا ہے۔'' (ایضاً، ص349)

آل احمد سرور کی ملاقاتیں لکھنؤ کے اہلِ اردو سے ہونے لگیں۔ یہاں کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں انھوں نے دلچسپی لینا شروع کی۔ لکھنؤ کے کافی ہاؤس نے اردو و ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک دوسرے کو جذباتی طور پر باندھنے کا تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا۔ ان سب باتوں کا بیان وہ بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی سوانح عمری میں کرتے ہیں:

''لکھنؤ آکر میں نے یہاں کے ادیبوں سے ملاقات کی۔ اثر صاحب سے تو پہلے ہی ملاقات ہو چکی تھی۔ آنند نارائن مُلّا سے ملا اور جلد ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ وہ اکثر میرے یہاں آجاتے تھے۔ ان کے ساتھ میں مرزا حسن عسکری سے ملنے گیا اور انھیں کے یہاں حضرت صفی لکھنوی سے بھی ملا اور ان کا کلام سنا۔ میرے پڑوس میں ڈاکٹر رشید جہاں بھی رہتی تھیں۔ ان سے اور محمود الظفر سے اکثر ملنا ہوتا۔ رشید جہاں بھی بے تکلف گھر پر آجاتی تھیں۔ محمود الظفر سنجیدہ آدمی تھے۔ کچھ انگریزوں کی سی کم گوئی بھی ان میں تھی۔ مگر رشید جہاں کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔ نہایت صاف گو مگر بڑی محبت کرنے والی۔ ان سے سیاسی مسائل پر اکثر بحث ہوتی۔ مگر تعلقات کبھی مجروح نہیں ہوئے۔ نسیم صاحب ڈاکٹر تھے اور شعر و ادب کے دلدادہ۔ وحید الدین سلیم ان کے والد کے دوست تھے۔ نسیم، سلیم صاحب کے قصے بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں شام کی چہل قدمی کے بعد میں کافی ہاؤس اکثر جاتا تھا۔ وہاں یونیورسٹی کے استاد، ہندی اردو کے ممتاز ادیب، طلبا، سیاسی کارکن سبھی آیا کرتے تھے۔ یہیں بھگوتی چرن ورما، یشپال اور امرت لال ناگر سے ملاقات ہوئی۔ سب ہندی کے ممتاز ادیب تھے۔ احتشام کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ وہ شام کو دانش محل میں بیٹھتے تھے۔ وہاں مجاز اور سلام مچھلی شہری کافی ہاؤس آتے تھے۔ ڈاکٹر علیم تو اس قدر پابندی سے آتے تھے کہ اگر بارش ہوتی تو چھتری لے کر آتے تھے۔ میں نے آنے کے چند ماہ بعد فیکلٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ اردو کا شعبہ فارسی سے الگ کر دیا جائے۔ مسعود صاحب اس کے مخالف تھے۔ مگر فیکلٹی اور اکیڈمک کونسل میں یہ تجویز منظور ہوگئی۔ اکیڈمک کونسل نے اردو کا الگ بورڈ آف اسٹڈیز بھی بنا دیا۔ جس کے لیے باہر سے میں نے رشید صاحب اور قاضی عبدالغفار کا نام تجویز کیا۔ مگر شعبے کی علاحدگی ناسازگار حالات کی وجہ سے اگزیکیوٹیو کونسل سے منظور نہ ہو سکی۔ 1947 آگیا تھا اور فضا مکدّر تھی۔'' (ایضاً، ص128)

آل احمد سرور نے کچھ عرصہ شملہ میں بھی گزارا۔ یہاں وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز، شملہ میں بطور فیلو رہے۔ انھوں نے آگے کشمیر کا بھی تفصیلی منظر نامہ پیش کیا ہے۔ کشمیر کے شالی مار باغ، نشاط باغ، چشمہ شاہی جیسے قدرتی جاہ وجلال کی مصوری کے ساتھ وہاں کے سیاسی وسماجی تانے بانوں کا بھی اس خودنوشت میں تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

'خواب باقی ہیں' میں بہت سے مقامات پر بے ربطگی کا احساس ابھرتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ تحریر میں موضوع سے مطابقت رکھنے والی باتیں ہوتی ہیں، لیکن سرور صاحب نے جو بات جہاں یاد آئی لکھ دی۔ صفحہ نمبر 100 پر خالدہ ادیب خانم کی علی گڑھ آمد کے ذکر کے دوران ملک راج آنند نمودار ہو جاتے ہیں۔ پھر اسپین سِوِل وار میں ادیبوں کا کردار اُس کے فوراً بعد ہی اسی پیراگراف میں فراق گورکھ پوری کا تذکرہ سب کچھ گڈ مڈ کر دیتا ہے۔ عام قاری کو سطور بار بار پڑھ کر ربط ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اسی طرف صفحہ نمبر 110 پر علی گڑھ مسلم لیگ کا ذکر کرتے کرتے اچانک چارلی چیپلن کی فلم دیکھنے اور اُس کے فن کے بارے میں بتاتے ہیں۔ صفحہ نمبر 121 پر ذاکر صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے امتیاز علی عرشی پر چھلانگ لگ جاتی ہے تو قاری جھنجھلا جاتا ہے۔'

(ماہنامہ 'سخن ور' از مضمون 'پروفیسر آل احمد سرور کی خودنوشت' آل احمد سرور کی خودنوشت 'خواب باقی ہیں' کا تجزیاتی مطالعہ از قدرت اللہ شہزاد، اگست 2004، ص22)

ادبی جریدہ 'دستاویز' کے اردو کی آپ بیتیوں پر مبنی خصوصی شمارے میں ضیاء ندیم نے اپنے مضمون بعنوان 'اردو میں خودنوشت سوانح عمریاں' میں آل احمد سرور کی اس آپ بیتی کے ضمن میں بجا طور پر لکھا ہے:

''سرور صاحب اردو ادب میں بحیثیت ادیب اور نقاد ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدی تصانیف کی طرح ان کی یہ خودنوشت بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ سرور صاحب نے مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے صرف ان حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے جو حقائق پر مبنی ہیں۔ انھوں نے بہت سے ممالک کے دورے بھی کیے اور وہاں کے حالات بھی تحریر کیے، بعض شخصیات کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، سروجنی نائیڈو، جگر مرادآبادی، یاس یگانہ چنگیزی اور پروفیسر احتشام حسین شامل ہیں۔ سرور صاحب نے اپنے مخصوص طرزِ تحریر سے آپ بیتی میں جان ڈال دی ہے۔ ان کی یہ خودنوشت 'خواب باقی ہیں' اردو ادب میں ایک اہم تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔''

(دستاویز، دوحہ۔ دہلی، مضمون 'اردو میں خودنوشت سوانح عمریاں' از ضیاء ندیم، عالمی اردو ادب کا کتابی سلسلہ، 2016، ص53)

معروف محقق و ناقد خلیق انجم نے اس سوانح کو ایک عالم اور معلم کی سوانح قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور نے اس آپ بیتی میں بیانیہ انداز میں اپنے احوال قلمبند کیے ہیں۔ انھوں نے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ مصنف نے واقعات کو بڑے دلچسپ لب و لہجے میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس آپ بیتی کو ادبِ لطیف کا حصہ بنا دیا ہے۔ کتاب 'خواب باقی ہیں' کے مطالعے سے قاری کی نگاہوں میں ایک عہد کا مکمل ادبی، علمی اور ثقافتی منظر نامہ متحرک ہو جاتا ہے۔ بے شک آل احمد سرور کی یہ خود نوشت سوانح عمری اردو ادب کی ایک شاہکار کتاب ہے۔

ماخذ و مصادر

1. خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1991
2. ڈاکٹر مظہر مہدی حسین، مشمولہ، بیسویں صدی میں اردو ادب، دہلی، ساہتیہ اکادمی 2002
3. ماہنامہ 'سخن ور' از مضمون 'آل احمد سرور کی خودنوشت 'خواب باقی ہیں' کا تجزیاتی مطالعہ' از قدرت اللہ شہزاد، اگست 2004
4. دستاویز، دوحہ۔ دہلی، مضمون 'اردو میں خود نوشت سوانح عمریاں' از ضیاء ندیم، عالمی اردو ادب کا کتابی سلسلہ، 2016
5. رقصِ شرر، ملک زادہ منظور احمد، رہبر آفسیٹ پرنٹرز، ترکمان گیٹ، دہلی، 2004
6. وہاج الدین علوی، اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، 1989

■

Dr.Syed Wajahat Mazhar
T-116/1, Okhla Main Market,
Okhla Village,
New Delhi. 110025.
Mob..: No.7217718943

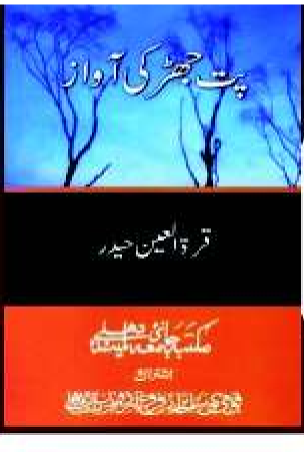

معراج احمد معراج

'پت جھڑ کی آواز' میں تانیثیت اور لاتانیثیت کا عکس

اردو کے بیشتر نظریات و رجحانات کی طرح تانیثیت بھی مغربی ادب سے مستعار ہے۔ تانیثیت کی تحریک یا اس کے رجحان کا آغاز بھی مغرب سے ہی ہوا۔ تانیثیت یعنی Feminism کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے فرانسیسی فلسفی چارلس فوریئر (Charles Fourier) نے 1837 میں کیا اور تانیثیت کے اس موضوع کو پہلی بار 1792 میں میری وال اسٹون کرافٹ (Mary Wollstonecraft) نے اپنی کتاب A Vindication of the Rights of Women میں روشن کیا، اس کے علاوہ انھوں نے مرد وزن کے ادبی و اخلاقی توازن کو برابر رکھنے کے لیے پھر ایک کتاب مردوں کے حقوق کی حمایت میں بھی لکھی جس کا نام A Vindication of the Rights of Men تھا۔ گویا 18 ویں صدی ہی سے تانیثیت کے ساتھ لا تانیثیت (Anti-feminism) کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس طرح تانیثیت اور تذکیریت (Masculinism) دونوں طرح کے رجحانات کے بنیاد گزاروں میں میری اسٹون کرافٹ کا نام سر فہرست ہے۔ معروف مورخ Judith Allen کے مطابق تذکیریت کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے CharlottePerkinsGilman نے 1914 میں کیا جب انھوں نے نیو یارک میں Studies in Masculinism کے عنوان سے عوامی تقریر کی۔ اردو کے مصنفین نے مغربی تانیثیت کا اثر تو قبول کیا لیکن تذکیریت اور لاتانیثیت جیسی اصطلاحات کو درکنار کر دیا۔ تذکیریت دراصل مغربی ملکوں کی ایک تحریک یا رجحان ہے جو تانیثیت کی مخالفت میں شروع ہوئی اسی لیے اس رجحان کو Anti-feminism بھی کہتے ہیں۔ اس رجحان کا مقصد اس خیال کا دفاع کرنا ہے کہ اب خواتین مردوں پر حاوی ہیں، جنھیں مردوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا جاتا ہے، اور انھیں طلاق شدہ مردوں کے خلاف مزاحمت کے لیے منظم کیا جاتا ہے۔

تانیثیت کی تعریف ایک دشوار مرحلہ ہے۔ مختلف مفکرین نے تانیثیت کے تعلق سے جو تعریفیں پیش کی ہیں ان کا نچوڑ بس یہی نکل کر سامنے آتا ہے کہ آزادیٔ نسواں اور نسائی حقوق کی بازیابی کے لیے عورتوں نے جو کچھ بھی تحریر کیا چاہے وہ جس صنف ادب سے متعلق ہو تانیثیت ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لڑکی کی پیدائش سے لے کر موت تک پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ تانیثیت کے زمرے میں آتی ہیں۔ تانیثیت کے رجحان کو فروغ دینے میں مرد قلم کاروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔

اردو افسانوں میں تانیثیت کی تحریک کی روح رواں ڈاکٹر رشید جہاں کو تسلیم کیا جاتا ہے، حالانکہ ان سے پہلے بھی اس موضوع کو ڈیل کرنے والی کئی خاتون افسانہ نگار ہیں، لیکن اس رجحان کے فروغ میں سب سے بڑا ہاتھ کشور ناہید کا ہے، جنھوں نے فرانسیسی مصنفہ سیمون ڈی بوار (Simone De Beauvoir) کی عورتوں پر لکھی کتاب The Second Sex(1949) کا ترجمہ اردو میں 1983 میں 'عورت' کے نام سے کیا جس نے اردو ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ ان نسائی مصنفین نے عورتوں میں بیداری پیدا کی اور اپنی تحریروں سے یہ واضح کیا کہ مردانہ سماج میں عورتیں مظلوم ہیں۔

رشید جہاں کا افسانوی دور 1931 سے 1952 تک محیط ہے جب کہ قرۃ العین حیدر کا افسانوی مجموعہ 'پت جھڑ کی آواز' 1966 میں اشاعت پذیر ہوا، اس لیے عین ممکن ہے کہ رشید جہاں کے افسانے عینی آپا کے مطالعے میں رہے ہوں گے اور وہ بھی رشید جہاں کے افسانوں کے احتجاجی تیور سے متاثر ہوئی ہوں گی۔ حالانکہ رشید جہاں اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا رنگ ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔

'پت جھڑ کی آواز' افسانے میں تانیثیت کے عناصر ہیں کیونکہ اس افسانے میں مردوں کی سماجی اجارہ داری کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس کہانی کی مرکزی کردار تنویر فاطمہ مردوں کی جھوٹی محبت کی شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی پہلی محبت ایک راجپوت میجر خوشوقت سنگھ سے ہوتی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن فاطمہ مذہب کو بنیاد بنا کر اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے، حالانکہ اسے خوشوقت سنگھ کی منگیتر بننے پر اعتراض نہیں ہوتا ہے۔ خوشوقت اسے اپنی منگیتر بنا کر شادی سے پہلے ہی دنیا کی سیر بھی کراتا ہے، ہوٹلوں میں شب گزاری بھی کرتا ہے اور جب جی چاہے اسے بری طرح مارتا پیٹتا بھی ہے۔ فاطمہ اپنا دکھ یوں بیان کرتی ہے:

"کالج کھلنے سے ایک ہفتہ قبل خوشوقت کی اور میری زبردست لڑائی ہوئی، اس نے مجھے خوب مارا، اتنا مارا کہ میرا سارا چہرہ لہولہان ہو گیا اور میری بانہوں اور پنڈلیوں میں نیل پڑ گئے۔" (پت جھڑ کی آواز)

ایک جگہ اور تنویر فاطمہ خوشوقت کے ظلم کا ذکر یوں کرتی ہے:

"میرے انکار پر خوشوقت نے مجھے جوتے اور لات سے مار کر میرا کچومر نکال دیا۔" (پت جھڑ کی آواز)

تنویر فاطمہ کی دوسری محبت فاروق ہے جو پہلے ہی کئی شادیاں کر چکا تھا اور شادی شدہ ہونے کے باوجود فاطمہ سے قریب ہو جاتا ہے۔ دونوں ایک لمبے عرصے تک شادی کیے بغیر میاں بیوی کی طرح ایک چھت کے تلے رہتے ہیں۔ وہ شادی کا وعدہ کرتا ہے لیکن یہ وعدہ بس وعدۂ محبوب ہی ثابت ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں اس سچائی پر روشنی ڈالی ہے کہ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر بھی لے تو اس کی عزت برقرار رہتی ہے لیکن عورتوں کو یہ اختیار نہیں۔

تنویر فاطمہ کا تیسرا رشتہ ایک امیر شخص سید وقار حسین سے قائم ہوتا ہے، وہ بھی شادی شدہ ہے، اور اس سے قبل کئی شادیاں کر چکا تھا۔ یہ اقتباس دیکھیے:

"ان گنت قومیتوں اور نسلوں کی عورتوں سے شادیاں رچائیں، ان کی موجودہ بیوی اڑیسہ کے ایک مارواڑی مہاجن کی لڑکی تھی جس کو یہ کلکتے سے اڑا لائے تھے۔"

افسانے کے کردار وقار صاحب فاطمہ کو اپنی بہن مانتے ہیں اور جب ان کی بیوی انھیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو اس پر گھر سنبھالنے کے لیے اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں۔ لیکن ایک روز وہ ایک مولوی کو بلا کر فاطمہ سے نکاح پڑھوا لیتے ہیں جس میں فاطمہ کی مرضی بھی شامل نہیں ہوتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے کہ کس طرح قرۃ العین حیدر نے ایک مرد کی بے شرمی اور نیت کا مذاق اڑایا ہے:

"چند روز بعد میں اپنا سامان باندھ کر وقار صاحب کے کمروں میں منتقل ہو گئی اور ناچ سکھانے میں ان کی اسسٹنٹ بن گئی۔ اس کے مہینے بھر بعد پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلوا کر اپنے دو چرکٹوں کی گواہی

میں مجھ سے نکاح پڑھوالیا۔''

چونکہ قرۃ العین حیدر ایک حساس خاتون افسانہ نگار ہیں اسی لیے انھوں نے عورتوں کے کرب کو بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، تبھی تو انھیں 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو' جیسا اثر انگیز افسانہ لکھنا پڑا۔

افسانہ'پت جھڑ کی آواز' میں افسانہ نگار نے مردانہ سماج کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے اور ان کی آزاد خیالی، ان کی سوسائٹی، اور ان کے ذریعے عورت پر کیے جانے والے ستم پر روشنی بھی ڈالی ہے، اس سے افسانہ نگار کا تانیثی رجحان واضح ہوتا ہے۔ دو اور اقتباسات پیش ہیں جن سے افسانہ نگار کے تانیثی رجحان کا پتہ چلتا ہے، اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پردہ، مذہبی کٹر پن اور مردوں کی اعلیٰ سوسائٹی کی معترض ہیں:

(1) ''ہمارے یہاں بڑا سخت پردہ کیا جاتا تھا، خود میرا، میرے چچازاد، پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ تھا۔''

(2) ''دراصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوتی کہ وہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے۔''

قرۃ العین حیدر کے افسانے 'پت جھڑ کی آواز' میں مردانہ سماج کی دھجی تو اڑائی ہی گئی ہے اور تانیثیت کا رجحان بھی منعکس کیا گیا ہے، اس کے ہمرکاب اس افسانے میں لاتانیثیت (Anti-feminism) کے ہلکے نقوش بھی روشن کیے گئے ہیں، جبکہ رشید جہاں کے افسانوں میں تانیثیت (feminism) کے رجحان کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ میں اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر متذکرہ افسانے سے چند اقتباسات پیش کروں گا اور یہ واضح کروں گا کہ قرۃ العین حیدر کے افسانے 'پت جھڑ کی آواز' میں اگر مردانہ سماج پر ضرب لگائی گئی ہے تو وہیں نسائی سماج کی دکھتی نبض پر انگلی بھی رکھی گئی ہے۔ یعنی اس افسانے میں تانیثیت کی جھلک بھی ہے تو لاتانیثیت کا عکس بھی ہے۔

افسانے کا راوی تنویر فاطمہ نے عورتوں کے مختلف محاسن کے علاوہ ان کے چند معائب کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ کس طرح عورتیں مردوں کی اعلیٰ سوسائٹی میں اپنے سماجی اسٹیٹس کو بحال رکھنے کے لیے ہر وہ کام کرتی ہیں جو ایک مہذب عورت کو شوبھا نہیں دیتا۔ اس نے عورتوں کو حرافہ جیسے غیر مہذب لقب سے بھی مخاطب کیا ہے۔

اسی افسانے کے بعض مقامات پر افسانے کے راوی نے ایسے ایسے جملے خواتین کے تعلق سے کہے ہیں کہ قاری وہیں ٹھٹک کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ افسانہ تانیثی رجحانات کا آئینہ دار ہے یا اس نظریے کا مخالف، یعنی ایسے مقامات پر لاتانیثیت کا پہلو جھلکنے لگتا ہے۔ بعض جملوں میں عورتوں کی تضحیک و تذلیل کا مادہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، جس سے افسانہ 'پت جھڑ کی آواز' تانیثیت اور لاتانیثیت کے درمیان جھولتا ہوا خلا میں معلق نظر آتا ہے، قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کیا یہ افسانہ عورتوں کے حق میں لکھا گیا ہے یا ان کے خلاف، لہٰذا تانیثیت کا رجحان ایسے مقامات پر دم توڑنے لگتا ہے اور وہیں لاتانیثیت کے ساتھ تذکیریت کے رجحان کو زندگی ملنے لگتی ہے۔

قرۃ العین حیدر خود ایک عورت ہیں اسی لیے وہ عورتوں کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے خرافات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ عورتوں کے درمیان ہونے والی چپقلش سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی طبیعت اور ان کے عادات و اطوار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خود افسانہ نگار نے راوی اور اس افسانے کے کرداروں کے ذریعے عورتوں کی منفی فطرت و طبیعت اور ان کی عیاش مزاجی کی ترجمانی بھی بڑے واضح الفاظ میں کی ہے۔ اسی تناظر میں چند اقتباسات پیش ہیں:

(1) **جھگڑالو فطرت**

''صبح میں گلی کے دروازے میں کھڑی، سبزی والے سے گوبھی کی قیمت پر جھگڑ رہی تھی''

(2) **باہمی نسائی رنجش**

* ''عورتیں ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں۔''
* ''عورتوں کی اعلیٰ جنس سروس اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انٹرپول بھی اس کے آگے پانی بھرے''
* ''مجھے لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں، مجھے دنیا میں زیادہ تر لوگ پسند نہیں آئے۔''

(3) **آزادیٔ نسواں کی مخالفت**

''شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں، ہوسٹل میں اکثر ہم اس قسم کی لڑکیوں کے لیے قیاس آرائیاں کیا کرتے، یہ بڑی عجیب اور پر اسرار ہستیاں معلوم ہوتیں۔''

اعلیٰ سوسائٹی پر طنز

''بہر حال کسی طرح یقین نہ آتا کہ یہ ہماری جیسی، ہمارے ساتھ کی چند لڑکیاں ایسی ایسی خوفناک حرکتیں کس طرح کرتی ہیں۔''

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے پت جھڑ کی آواز میں اپنے موجودہ سماج کی منظر کشی بڑے واضح طور سے کی ہے، وہ سماج جو تقسیم ملک کے المیے سے دو چار تھا، اس میں آزادی سے فوراً قبل ہندوستان اور آزادی کے فوراً بعد کے ہند و پاک کی معاشرتی اتھل پتھل اور بے قراری کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں دہلی اور لاہور کی بدلتی ہوئی فضاؤں کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے، ان دو بڑے شہروں میں ہر طرح کے لوگ رہتے تھے، جن کے جینے کے اپنے اپنے انداز تھے، لڑکیوں کی اپنی آزاد زندگی تھی جو کسی دقیانوس شخص کو عیش پرست اور بے لگام معلوم ہو سکتی تھی، اس میں ایسے مرد بھی تھے جو مذہبی قید و بند سے لاپروا آزاد خیالی کے ساتھ اپنی دنیا بسائے ہوئے تھے، بھلے ہی ان کی آزاد خیالی میں مذہب سے بیزاری کا عکس بھی ہو۔ قرۃ العین حیدر نے دو ملکوں کی تہذیبوں اور ان کی بدلتی اقدار کو بہت گہرے طور سے محسوس کیا، اور ان کے رسم و رواج اور طور طریقے کو اپنے افسانے میں بہت سلیقے سے برتا ہے۔ انھوں نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں یہ واضح کیا ہے کہ کس طرح حالات تیزی سے بدل رہے تھے، کیسے رفتہ رفتہ مذہبی و سماجی پابندیاں ختم ہو رہی تھیں۔ علم و ہنر کے چراغ ہر طرف روشن ہو رہے تھے۔ عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ علم و ہنر کے میدان میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ دونوں ملکوں کے نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان معاشرتی و اخلاقی ہم آہنگی پیدا ہو رہی تھی، لوگ روشن خیال ہو رہے تھے، رفتہ رفتہ ایک نئی سوسائٹی کی تشکیل ہو رہی تھی جو اعلیٰ سوسائٹی کے نام سے معروف ہو رہی تھی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانہ'پت جھڑ کی آواز' میں عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کی آزادی کی بھی وکالت کی ہے اور قاری کو یہ احساس دلایا ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں، اسی لیے دونوں جنسوں میں محاسن کے علاوہ معائب بھی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے دونوں جنسوں کے درمیان معاشی، سماجی اور اخلاقی برابری پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لہٰذا مجھے یہ رائے قائم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ 'پت جھڑ کی آواز' تانیثیت اور لاتانیثیت کے رجحانات کے درمیان سے گزرتا ہوا اور اخلاقی برابری کی طرف سفر کرتا ہوا ایک کامیاب افسانہ ہے۔

جو لوگ مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے کے لیے ادب خلق کرتے ہیں انھیں مساوات پسند یعنی equalist کہتے ہیں اور تانیثیت اور لاتانیثیت کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے والا نظریہ equalism کہلاتا ہے، اب آپ کے لیے یہ سوال میں چھوڑے جاتا ہوں کہ کیا قرۃ العین حیدر equalist تھیں؟

■

Meraj Ahmad Meraj
Kulti, Distt.: West Bardhaman-713343
(West Bangal)
Mob.:8918960724

محمد ریحان

ادبی متن کی قرأت اور غزل کے تفہیمی مسائل

پڑھنے کے عمل کو قرأت کہتے ہیں۔ قرأت کے ذریعے ہی متن کی اہمیت طے کی جاتی ہے کیونکہ متن اپنے آپ میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وولف ایزر نے متن کے حوالے سے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ جب تک متن کی قرأت نہیں ہوتی ہے اس کے Inherent Characters غیاب میں ہی رہتے ہیں۔ دریدا کا بھی یہی ماننا ہے کہ متن کے معنی التوا میں ہوتے ہیں۔ پروفیسر کوثر مظہری نے متن یعنی Text کو بے جان شے کہا ہے اور اس کو جمادات کے زمرے میں رکھا ہے۔ متن جب تخلیق ہو رہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کا خالق یعنی متن کار صرف لفظوں کو جمع نہیں کرتا بلکہ ان میں معنی اور مطلب بھی شعوری طور پر داخل کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ مناسب اور موزوں الفاظ کی تلاش کرتا ہے اور زبان و ادب کے اصولوں کی پابندی بھی۔ اگر دوران تخلیق متن کے ساتھ یہ سارے امور کارفرما ہوتے ہیں تو پھر متن کے بے جان ہونے والی بات کہاں تک درست ہے؟ متن کوئی بھی ہو وہ معنی سے خالی نہیں ہوسکتا۔ معنی کے غیاب میں ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرأت سے پہلے متن معنی سے خالی ہوتا ہے۔ متن کے حوالے سے جو نظریات اوپر پیش کیے گئے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ متن کی اہمیت اس کی قرأت پر منحصر ہے۔ یعنی جس طرح ہم متن کی قرأت کریں گے اسی طرح اس کے معنی بھی ہم پر واضح ہوں گے۔ ہم قرأت کے ذریعے متن کو متحرک کرتے ہیں اور متن قاری کی لیاقت اور علمیت کے مطابق ہی اپنے معنی کے دروازے کھولتا ہے۔

متن کی قرأت کے باب میں سب سے مضبوط نظریہ فرانسیسی ادیب رولاں بارتھ نے پیش کیا تھا۔ 1967 میں اس نے اپنے ایک مضمون "La mort de l'auteur" یعنی 'مصنف کی موت' میں یہ اعلان کیا کہ متن پر متن کار کی ملکیت نہیں ہوتی۔ یعنی متن جب تخلیق پا جاتا ہے تو وہ متن کار کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں کہ کسی متن کو اس کے لکھنے والے سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب کا شعر غالب کا نہیں ہے۔ مصنف کی موت کا مطلب یہ ہے کہ قاری کسی بھی متن کا مطالعہ متن کار کے نقطہ نظر سے کرنے کا پابند نہیں ہے۔ متن میں کیا لکھا ہے اس کا فیصلہ ہر قاری اپنے طریقے سے کرے گا۔ ایک بار متن تخلیق پا جائے تو پھر وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ قاری کے لیے تو ایسے بھی ممکن نہیں کہ وہ مصنف کے مطابق ہی سوچے۔ کیونکہ مصنف اور قاری کی اپنی اپنی علمیات ہوتی ہے۔ کبھی دونوں کے درمیان زمانی بعد ہوتا ہے اور کبھی کبھی ان کے بیچ جغرافیائی دوری حائل ہوتی ہے۔ ایسے میں ممکن ہی نہیں ہے کہ قاری ایک متن سے وہی سب کچھ معنی اخذ کرے جو صاحب متن نے لفظوں کی مدد سے اس میں چھپا رکھے ہیں۔ معنی کے التوا یا غیاب میں رہنے کا ایک نقصان یا فائدہ یہ ہے کہ جب بھی کسی متن کی قرأت کی جائے گی اس کے معنی ہمیشہ ایک سے برآمد نہیں ہوں گے۔ یہاں کوئی یہ سوال بھی قائم کرسکتا ہے کہ یہ تو مصنف کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ہوگی اگر متن سے وہ معنی برآمد ہی نہ ہوسکے جو مصنف نے لفظوں میں یا بین السطور میں پیش کیے ہیں۔ اس حوالے سے دریدا نے لکھا ہے کہ There is nothing outside of the text یعنی متن سے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی قاری کسی متن سے ایسے معنی نکال ہی نہیں سکتا جو متن میں موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ جو معنی اخذ کرتا ہے وہ منشائے مصنف سے کبھی زیادہ قریب ہوتا ہے اور کبھی کم۔ اس الجھن کو زیادہ خوش اسلوبی سے شمس الرحمٰن فاروقی نے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”متن سے وہ معنی برآمد نہیں ہوسکتے جو اس میں نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ منشائے مصنف کو بنیادی اہمیت نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں من مانی کرنے کی اجازت ہے۔ بلکہ متن کی صحت پر اصرار کرنے سے یہ اصول مستحکم ہو جاتا ہے کہ جو معنی متن میں نہیں ہیں ہم انھیں برآمد نہیں کرسکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو معنی نہ بیان کریں گے بلکہ اپنے مفروضات بیان کریں گے۔“

(بحوالہ قرأت اور مکالمہ، کوثر مظہری، ص:19)

فاروقی کی مذکورہ بالا باتوں سے یہ الجھن تو دور ہو جاتی ہے کہ قاری اگرچہ متن سے معنی اخذ کرنے کے معاملے میں آزاد ہے لیکن وہ متن سے ایسے معنی برآمد کر ہی نہیں سکتا جو اس میں ہے ہی نہیں۔ فاروقی کی یہ بات بہت اہم ہے کہ متن کی صحت پر اصرار ہونا چاہیے۔ بعض دفعہ ہوتا کیا ہے کہ ہم مصنف سے مرعوب ہو کر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر متن کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں۔ تعصب کے زیر اثر ہم ایمانداری سے متن کی قرأت نہیں کرتے ہیں اور ایک قدرے کم درجہ کے مصنف کو دوسرے بڑے درجہ کے مصنف پر فوقیت دے دیتے ہیں۔ محمد حسین

آزاد کی 'آبِ حیات' اور شبلی کی 'موازنہ انیس و دبیر' دونوں کتابیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ بعد کے دور میں بھی اس طرح کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جن میں متن سے زیادہ شخصیت کو اہمیت دی گئی۔ متن کو اہمیت دینے سے اس کی غلط تعبیر و تفہیم کے سارے چور دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ متن سے مختلف معانی اور مفاہیم نکل سکتے ہیں اور نکلتے ہیں لیکن میں اس بات سے متفق نہیں کہ کسی بھی متن کی متفقہ قرأت ممکن نہیں۔ یہ ممکن ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قاری صاحب علم و بصیرت ہو اور وہ متن کے ساتھ مکالمہ کرنے کے ہنر سے واقف ہو۔ متن کی عمارت لفظوں کی اینٹ سے تعمیر ہوتی ہے۔ ہر لفظ کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ لفظ میں صرف معنی نہیں ہوتے بلکہ اس میں متعلقہ زبان کی تہذیب اور اس کے بولنے والوں کی ثقافت بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ قاری کے لیے ضروری ہے کہ متن کی قرأت کرتے وقت جب کسی لفظ کا معنی متعین کرے تو اس کے ثقافتی عناصر کو نظر انداز نہ کرے۔ دوران قرأت اگر ان باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا تو ظاہر ہے کسی بھی ادبی متن کی متفقہ قرأت ممکن نہیں۔ متن کی قرأت کے معاملے میں یہ بات اہم نہیں ہے کہ متن کے معنی التوا میں ہوتے ہیں، مصنف کی موت ہو جاتی ہے یا معنی اخذ کرنے کے معاملے میں قاری آزاد ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ متن کی قرأت کیسے کی جا رہی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

''یک طرفہ مکالمے کو وہ جھوٹا مکالمہ کہتا ہے۔ مکالمہ دو طرفہ ہونا چاہیے۔ اس میں طرفین اپنی اپنی شناخت بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ گدامر کا کہنا ہے کہ کسی متن کو سمجھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو سمجھ رہے ہیں۔'' (بحوالہ: قرأت اور مکالمہ، کوثر مظہری، ص:11)

یہاں لفظ کے ساتھ مکالمے والی بات بہت اہم ہے۔ جب دو شخص آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو دراصل دونوں ایک دوسرے کی باتوں پر اپنا ردعمل پیش کرتے ہیں۔ دو لوگوں کے درمیان مکالمہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں ایک دوسرے کی باتیں سمجھ رہے ہوں۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک کسی کی بات نہیں سمجھتا ہے تو اس کی وضاحت طلب کی جاتی ہے۔ یعنی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہوتی ہے تو استفہامیہ ردعمل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ متن اور قاری کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ قاری جب کسی متن کے روبرو ہوتا ہے تو دراصل وہ اس کے ساتھ مکالمہ کر رہا ہوتا ہے۔ اس میں متن بھی اتنا ہی Active ہوتا ہے جتنا کہ قاری۔ جب کوئی متن کسی قاری کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ استفہامیہ انداز اختیار کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ متن سے متعلق دوسری چیزوں کو ٹٹولنے کی کوشش کرے۔ اس سے اسے متن کے معنی تک پہنچنے میں کامیابی مل سکتی ہے۔

نثری متن عام طور پر یک رخی ہوتا ہے۔ وضاحت و صراحت اس کی خوبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نثری متن ایک سے زیادہ مرتبہ قرأت کا متقاضی نہیں ہوتا۔ بہت سنجیدگی اور یکسوئی اختیار کیے بنا بھی معنی تک رسائی ممکن ہے۔ لیکن شاعری کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خاص طور پر غزل کے اشعار کے معنیاتی نظام کو سمجھنا دشوار ہے۔ گوپی چند نارنگ شاعری کے اس نکتے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''معنیاتی نظام انتہائی مبہم اور گرفت میں نہ آنے والی چیز ہے۔ بحث و مباحثہ کی سہولت کے لیے اسے چند الفاظ میں مقید تو کیا جا سکتا ہے لیکن معنیاتی کیفیات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔'' (بحوالہ: قرأت اور مکالمہ، کوثر مظہری، ص:187)

اس اقتباس سے اتنی بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ شعری تفہیم مشکل ہے۔ غزل کی زبان ایک مخصوص نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس میں رمزیاتی عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس کے اظہار و بیان کے طریقے مشکل اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ غزل کا شاعر مضامین کو شعری علامتوں اور استعاروں کے حریری نقاب میں چھپا کر پیش کرتا ہے۔ غزل کے معنیاتی نظام تک رسائی اس کے اشعار پر وجد کی کیفیت میں مبتلا ہو کر نہیں ہو سکتی۔ ایک شعر سن کر اس کی مخصوص ہیئت اور ساخت سے وقتی طور پر محظوظ ہوا جا سکتا ہے لیکن ایک بار میں اس کے معنی کی تہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ غزل جو اردو شاعری کی آبرو اور ادب کی شناخت ہے اس کی تنقید میں اس کی روایتی خصوصیت اور محاسن کا ذکر کیا گیا لیکن اس کے گہرے ایمائی نظام اور طول و عرض میں پھیلے اس کی تہذیبی، عمرانی، اور فکری و ذوقی پس منظر کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حالی نے وقت کے جبری تقاضوں کے تحت غزل کے اصلاحی نسخے تیار کرنے میں اپنی توانائی صرف کر دی۔ کلیم الدین احمد نے غزل سے اس کی شناخت سلب کرنے کے لیے اس کی نئی تعریف وضع کرنے کی سعی لاحاصل کی اور جب اس میں ناکام ہوتے نظر آئے تو اسے 'نیم وحشی صنف سخن' قرار دے دیا۔ رشید احمد صدیقی نے غزل سے جذباتی طور پر منسلک ہو کر اس کی تشریح و توضیح کی۔ غزل کے ساتھ ان کا رشتہ مدافعانہ قسم کا تھا۔ غزل کے مخالفین اس کی مخالفت میں ایک انتہا پر تھے اور اس کے حامی اس کی مدافعت میں ایک دوسری انتہا پر۔ غزل ان دو انتہاؤں کے بیچ میں معلق ہو کر رہ گئی۔ غزل کے فن پر گفتگو ہوئی ہے لیکن اس کے تفہیمی مسائل پر کم بات ہوئی۔ عملی تنقید کے ذریعے اس کی قرأت اور تفہیمی مسائل پر جس طرح بات ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ کلیم الدین احمد، اختر انصاری، شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، اسعد بدایونی اور دیگر نقادوں نے عملی تنقید کے ذریعے غزل اور شاعری کے معنیاتی نظام کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوششیں کی ہیں اس سے انکار نہیں لیکن غزل کی قرأت اور اس کی تفہیم کا مسئلہ آج بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم آج بھی کلاسیکی شاعری سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دیوان غالب کی تشریح لکھ دینے سے غزل کی تفہیم کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ ہمیں مطالعہ غزل کے طریقۂ کار متعین کرنے ہوں گے۔ اختر انصاری نے غزل اور متعلقات غزل کے باب میں جن امور کا خیال رکھنا ضروری سمجھا ہے ان میں غزل کی ہیئت، اس کا عہد بہ عہد ارتقا، اس کے مختلف دبستان اور اسلوب، اس کا رمزیہ اور کنایتی انداز بیان اہم ہیں۔ غزل کی قرأت سے قبل قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے خارجی امور سے واقفیت بہم پہنچائے۔ غزل کے خارجی امور میں اس کی ہیئت کا علم ضروری ہے۔ بہت بنیادی بات یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنا معنی ادا کرنے میں خود مکتفی ہوتا ہے۔ غزل کی اس ریزہ خیالی سے کلیم الدین احمد دھوکہ کھا گئے اور ادبی شرک کے مرتکب ہو گئے۔ غزل جس کو خالص مشرقی شعریات کے تناظر میں پرکھنا تھا، کلیم الدین احمد مغربی اصول و نظریات کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ غزل اتنی مقبولیت کے باوجود آج بھی اس کی ریزہ خیالی یورپ کے لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی۔

غزل کی تفہیم میں اس کے ارتقائی سفر کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ غزل اور شاعری کے ڈکشن میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک ہی لفظ نے معانی کے کئی رنگ و روپ اختیار کر لیے ہیں۔ میر و غالب کے عہد میں عاشق و معشوق کا جو تصور تھا وہ اقبال کے یہاں کسی اور شکل میں سامنے آیا اور فیض کے یہاں کسی اور روپ میں۔ آپ غالب کے یہ اشعار دیکھیں۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

یہی عشق سفر کرتے کرتے جب اقبال تک پہنچتا ہے تو اس

طرح شعر میں نمودار ہوتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

فیض احمد فیض کا معشوق گوشت پوست والا انسان بھی ہے اور ان کا ملک اور وطن بھی۔ فیض نے چونکہ زیادہ نظمیں تخلیق کی ہیں اس لیے یہاں ان کی نظم کے حوالے دیے جا رہے ہیں۔ 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' نظم میں وطن سے اپنی محبت کا اظہار ایسے کیا جیسے کوئی اپنے محبوب سے کرتا ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

غالب کا روایتی عاشق اقبال کے یہاں مرد مومن بن جاتا ہے اور فیض کے یہاں مرد مجاہد جو سرمایہ داروں کے خلاف آزادی کا پرچم لیے کھڑا نظر آتا ہے۔ مطالعہ غزل میں مرور ایام کے ساتھ لفظوں اور استعاروں کے بدلے ہوئے رنگ و روپ کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اس ضمن میں اردو ادب کی مختلف تحریکوں اور رجحانوں کے اسباب و مقاصد سے ہماری آگہی ضروری ہے۔ تمام تحریکوں کے اثرات اصناف ادب پر مرتب ہوئے ہیں۔ غزل کی تفہیم میں یہ طریقہ بھی کارگر ثابت ہوگا کہ ہم غزل کو اس کے ادوار میں رکھ کر اس کا مطالعہ کریں۔ آپ کسی ایک دور کی شاعری کا مطالعہ کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دور کی شاعری پر اس وقت کے رجحان کا کتنا گہرا اثر ہے۔ غزل کی روایت میں ایک دور ایہام گوئی کا گزرا ہے۔ شاکر ناجی اور آبرو کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ایہام گوئی کا تصور ہمارے ذہن میں واضح ہونا چاہیے۔ ناجی کا ایک شعر ہے۔

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

یہاں دوسرے مصرعے میں لفظ عارضی کا ایک مطلب وقتی اور Temporary ہے۔ قاری مزید غور و فکر کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پہلے مصرعے کی مناسبت سے اس کا ایک مطلب رخسار اور عارض بھی ہو سکتا ہے۔ قاری کی نظر جب اس نکتے پر پڑتی ہے تو وہ اس شعر سے زیادہ لطف اٹھاتا ہے۔ مطالعۂ غزل میں غزل کی روایت پر نظر نہ ہو تو ہم شاعری کے اصل لطف سے محروم رہ سکتے ہیں۔

غزل کے معنیاتی نظام تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم اس کے استعاراتی نظام کی مکمل آگہی ہے۔ استعارات و تشبیہات اور معروف صنعتوں کو سمجھے بنا غزل کی صحیح تفہیم تقریباً ناممکن ہے۔ مطالعۂ غزل میں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی ہوگی کہ غزل میں بات سیدھے انداز میں نہیں کی جاتی ہے۔ غزل کا شاعر اشارات و تمثیلات کے ذریعے معنی کو لفظوں میں چھپاتا ہے۔ اردو غزل کے علامتی الورود الفاظ و تراکیب جیسے عشق و جنوں، لیلی و مجنوں، گل و بلبل، شمع و پروانہ، برق و شرر، دام و صیاد، طور و کلیم، جام و صہبا، دیوانہ و صحرا، ساقی و ناصح، دیر و حرم اور اس نوعیت کے دوسرے الفاظ محض الفاظ نہیں بلکہ غزل کے مخصوص علائم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس نوعیت کے الفاظ شاعری میں گہری معنویت پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح کے الفاظ ظاہری مفہوم کے ساتھ اپنا باطنی مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ جب جب ہمیں اس طرح کے الفاظ و تراکیب کا سامنا ہو تو ہمارے لیے ہر شعر پر عمل جراحی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تبھی ہم اس کے ظاہری مفہوم کے ساتھ اس کے باطنی مفہوم کو تلاش کر سکتے ہیں۔ اس پوری بحث کو میر تقی میر کے اس مشہور شعر سے سمجھیں۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ظاہر ہے اس کا ایک مطلب تو یہی ہے جو پڑھتے ہی ہمارے ذہن میں آتا ہے، یعنی۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

یعنی عشق کرنا آسان نہیں ہے۔ اس میں روز بروز پریشانیوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم سنجیدہ ہو کر لفظ عشق پر غور کرتے ہیں تو پھر اس سے یہ معنی بھی نکل کر آتا ہے کہ عشق کی طرح ہم جب بھی کسی بڑے مقصد کے حصول میں نکلتے ہیں تو ہمیں کئی طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب تھوڑی اور مغز ماری کرتے ہیں تو اس سے عشق کا ہی یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ شروع شروع میں معشوق ناز و نخرے تو دکھاتا ہی ہے لیکن رفتہ رفتہ عشق میں وہ منزل بھی آتی ہے جہاں عاشق ہجر کا رونا نہیں روتا۔ وہ وصال کی مسرت کا نغمہ گنگناتا ہے۔ ممکن ہے یہاں شاعر یہ بھی کہنا چاہ رہا ہو کہ ابھی تو آغاز عشق ہے پریشان کیوں ہوتے ہو، حوصلہ رکھو کچھ دن میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہیں سے یہ معنی بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ کسی بھی کام کے آغاز میں دقتیں تو پیش آتی ہی ہیں۔ ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں یا ہر پریشانی کے بعد آسانی پیدا ہوتی ہے۔

میں نے مضمون کے شروع میں رولاں بارتھ کا نظریہ 'مصنف کی موت' کا ذکر کیا ہے لیکن میں اس نظریے سے پورے طور پر اتفاق نہیں رکھتا کہ متن آزاد ہوتا ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ متن کا مطالعہ آزادانہ طریقے سے کرنا چاہیے۔ متن کا آزاد ہونا اور متن کا آزادانہ طریقے سے مطالعہ کرنا، دونوں میں فرق ہے۔ اگر متن آزاد ہوتا ہے تو ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ یہ اسلوب میر کا ہے یہ غالب کا ہے اور یہ اقبال کا ہے۔ دراصل ہر متن میں صاحب متن کی علمی و فکری دنیا موجود رہتی ہے اور بعض دفعہ اس کی شخصیت کی پوری کہانی اس کے متن میں پنہاں ہوتی ہے۔ اس لیے میرا یہ ماننا ہے کہ مطالعۂ غزل میں شاعر کی زندگی کا مطالعہ بھی اہم ہے۔ میر کی زندگی کا مطالعہ کریں یا ان کی غزلوں کی بات ایک ہی ہے۔ ہم ان کی غزلوں کی مدد سے ان کی شخصیت کا ایک خاکہ بنا سکتے ہیں اور ان کی زندگی پڑھ کر ان کی غزلوں کی روح تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کی موت والی بات میرے نزدیک اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ متن کی قرأت کے حوالے سے جتنے بھی نظریات ہیں وہ سب کے سب بے معنی اور بکواس ہیں اگر قاری کی اپنی لیاقت اور علمیت قابل اعتبار نہیں ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری صاحب نے بڑی اچھی بات کہی ہے:

"میرا ذاتی ادراک اور Perception یہ ہے کہ متن کی قرأت کے لیے کسی بھی ایزرفش، دریدا، بارتھ، لاکاں فوکو کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ آپ کے اپنے شعوری بالیدگی اور قدرے Episteme کی اہمیت ضرور ہے۔" (قرأت اور مکالمہ، کوثر مظہری، ص:24)

قاری کا اپنا شعور اگر بالیدہ اور مطالعہ وسیع نہ ہو تو وہ جب جب کسی غزل کی قرأت کرے گا تب تب غیب سے یہ آواز آئے گی۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قاری کس نظریے کے تحت متن کی قرأت کر رہا ہے۔

■

Dr. Md. Raihan
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:7366083119

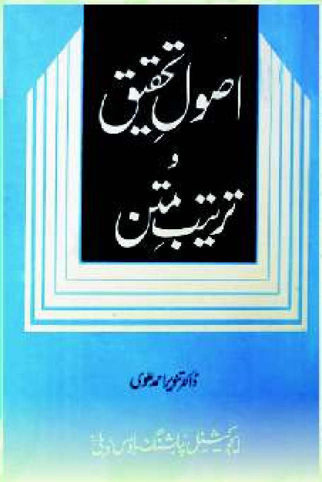

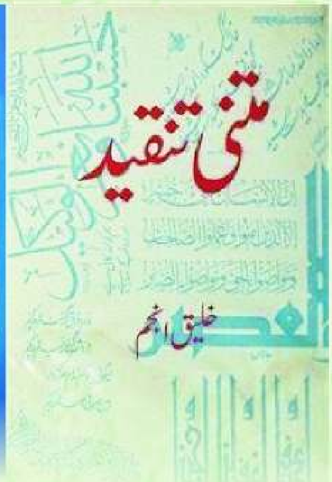

عبدالباری قاسمی

مرتب و مدون کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں ایک اہم اور بنیادی مسئلہ متن کی قرأت کا ہے۔اگر مخطوطہ شناسی کے فن پر عبور حاصل نہ ہو تو مدون کے لیے مصنف کی خواہش اور اس کے منشا کے مطابق متن کی تدوین مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔قرأت عربی لفظ ہے اس کے معنی پڑھنا ہوتا ہے۔ تدوین متن میں اس سے مراد مخطوطات یا مصنف کی تحریر کو پڑھنا ہے مدون جب کسی مخطوطے یاکتاب وغیرہ کو مرتب کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اسی مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے اس لیے مدون متن کے لیے قرأت کے مسائل سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔

تدوین متن میں قرأت کے مسائل

کسی قدیم متن کو مصنف کی منشا کے مطابق تحقیق و تخریج، تحشیہ و تعلیق اور مقدمے سے مزین کر کے منظر عام پر لانے کا نام تدوین ہے۔تدوین متن کو متنی تنقید اور ترتیب متن سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔تدوین کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مخطوطہ یا طبع شدہ کام کو کاتب کی غلطیوں یا ملاوٹ سے پاک وصاف کر کے مصنف کے منشا کے مطابق پیش کیا جائے۔مدون جب کسی مخطوطے یا کتاب کو مرتب کرتا ہے تو اسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت سے مراحل کو عبور کرنے کے بعد وہ متن کو تحریفات، الحاقات اور سرقے وغیرہ سے پاک کر پاتا ہے۔مرتب و مدون کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں ایک اہم اور بنیادی مسئلہ متن کی قرأت کا ہے۔اگر مخطوطہ شناسی کے فن پر عبور حاصل نہ ہو تو مدون کے لیے مصنف کی خواہش اور اس کے منشا کے مطابق متن کی تدوین مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔قرأت عربی لفظ ہے اس کے معنی پڑھنا ہوتا ہے۔تدوین متن میں اس سے مراد مخطوطات یا مصنف کی تحریر کو پڑھنا ہے مدون جب کسی مخطوطے یا کتاب وغیرہ کو مرتب کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اسی مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے اس لیے مدون متن کے لیے قرأت کے مسائل سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔

قدیم متون کے متعدد نسخوں میں بعض الفاظ اور عبارتوں کی قرأت کاتب نے غلط کی اور نادانستہ طور پر کچھ کا کچھ لکھ دیا۔اس قسم کی بہت سی مثالیں قدیم متون میں موجود ہیں۔ اس پر مرتب متن کی نگاہ ہونی چاہیے تبھی وہ اپنا کام درست طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔قرأتوں میں یہ اختلاف عموماً نقل در نقل کی وجہ سے ہوتا ہے کہ مصنف نے تو کچھ لکھا، بعد میں کاتب نے اسے کچھ پڑھا اور پھر وہی اس نے نقل کر دیا اور اسی طرح وہ متن چھپتا رہا۔ یہ کبھی کاتب کی غلطی سے ہوتا ہے یا وہ صحیح پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، مگر پڑھ نہیں پاتا پھر جو اسے سمجھ میں آتا ہے وہی لکھ دیتا ہے۔ ہر زبان میں بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اردو، عربی اور فارسی میں تو ایسے لفظوں کی تعداد اور بھی زیادہ ہے کہ ان زبانوں میں محض نقطوں کے فرق سے الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کے معنوں میں بھی بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔قرأت کی نادانستہ غلطیوں کی بہت سی مثالیں قدیم شعری دواوین اور مجموعوں میں موجود ہیں، جیسے انتخاب میر مرتبہ مولوی عبدالحق (طبع چہارم) میں ایک شعر ہے۔

تک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو
دو چار 'دن' کی باتیں اب منہ کو آئیاں ہیں

بعض نسخوں میں 'دن' کی 'قرأت' دل کی گئی ہے۔خلیق انجم [1] نے دل ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔

بعض الفاظ شکل وصورت میں ایک جیسے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے پڑھنے اور نقل کرنے میں غلطی رونما

ہوجاتی ہے جیسے کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں ایک شعر ہے۔

جیدھر کو جس کا منھ اٹھا اودھر کو چلا
'سوجھے' بغیر یہ کہ فلاں جا کروں قرار

شعر کے سیاق وسباق اور قرینے کے اعتبار سے دوسرے مصرعے میں لفظ 'سوجھے' غلط ہے، چنانچہ اسی کلیات کے دوسرے نسخے (نسخۂ رچرڈسن) میں اسے 'سوجھے' کے بجائے 'سوچے' پڑھا اور نقل کیا گیا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح قرأت کا یہ اختلاف کبھی مرکب لفظوں کے درمیان بے جا فاصلے، کبھی ایک یا اس سے زیادہ لفظوں یا حرفوں کی بے جا تقدیم وتاخیر کی وجہ سے، کبھی شعر کے مصرعوں کی ترتیب بگڑ جانے کی وجہ سے، کبھی الفاظ کی تبدیلی کی وجہ سے، کبھی شعر یا مصرعے کے کسی لفظ کے چھوٹ جانے کی وجہ سے، کبھی سہواً کسی لفظ یا فقرے کو مکرر سہ کرر لکھ دینے کی وجہ سے، کبھی اس وجہ سے کہ کاتب جس زبان کا متن نقل کر رہا ہے اس سے وہ کماحقہ واقف نہیں، چنانچہ وہ کسی لفظ کو غلط پڑھتا ہے اور وہی لکھ بھی دیتا ہے، کبھی کسی اہم اور خاص اصطلاح کے نقل کرنے میں کاتب سے غلطی ہوجاتی ہے، کبھی اعداد وشمار کی نقل میں غلطی ہوجاتی ہے اور کبھی محاورات وترکیبات کو مصنف اور شاعر کے منشا کے خلاف نقل کرنے کی وجہ سے قرأت کی غلطیاں رونما ہوتی ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات کاتب جان بوجھ کر شرارت کرتا ہے اور کسی لفظ کو بدل دیتا ہے، کوئی لفظ بڑھا دیتا ہے، اپنے زعم میں کسی غلط لفظ کی تصحیح کرنا چاہتا ہے اور مصنف نے جو لکھا ہے اس کی جگہ کوئی اور لفظ لکھ دیتا ہے، تذکیر وتانیث وغیرہ کے سلسلے میں مصنف کی تحریر کے برخلاف کسی لفظ کو نقل کرتا ہے یا اسی قسم کی غلطیاں کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے متنی نقاد یا مرتب متن کو تدوین کے دوران دشواری پیش آسکتی ہے اور اسے اپنے غور وفکر اور مصنف کے دوسرے مسودوں اور کتابوں کے مطالعوں سے بہت سی چیزوں کو سمجھنا اور زیر غور متن کو اسی کے مطابق مرتب کرنا پڑے گا۔

رسم الخط اور املا کے مسائل

تدوین متن کے مسائل میں جو سب سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ایک مدون کو پیش آتا ہے وہ قدیم مخطوطات کے رسم الخط اور طرز املا کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج تک جبکہ دنیا کی تمام زبانوں کے املا کے قواعد تقریباً متفقہ طور پر طے پاچکے ہیں، اردو میں ایسے قواعد املا کا وجود نہیں جن پر تمام اردو دنیا کا اتفاق ہو اور جنھیں سب مانتے ہوں۔ حالانکہ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بہت سے علمی ولسانی اداروں نے بھی املا اور قواعد املا پر کام کروایا ہے، اسی طرح متعدد ماہر لسانیات اور محققین نے اپنے طور پر بھی اردو املا کے قواعد مرتب کیے اور اردو والوں کو انھیں اپنانے کی تلقین وتبلیغ کی، مگر پھر بھی کوئی ایسا اتفاق رائے قائم نہیں ہوسکا، جس کی وجہ سے اردو الفاظ کے املا اور رسم خط کے سلسلے میں کوئی حتمی اور تمام اردو دنیا میں متفقہ موقف پایا جاتا ہو۔ جب آج

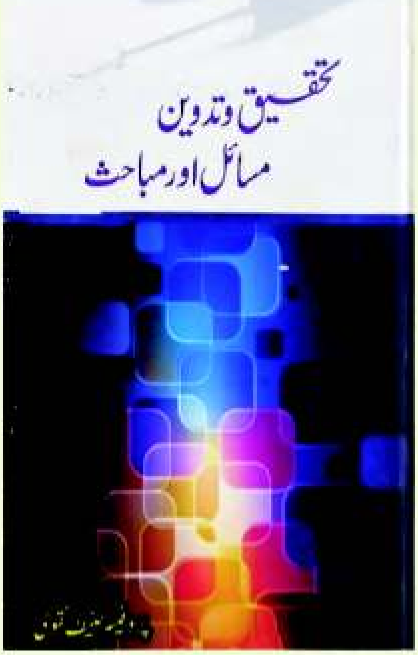

اکیسویں صدی میں یہ حال ہے تو پچھلی صدیوں میں کیا حال رہا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک اسکالر کسی سو دو سالہ قدیم متن کی ترتیب و تدوین کا بیڑہ اٹھاتا ہے تو اسے جہاں دیگر بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے، وہیں اس کے لیے متن کی قرأت وتفہیم کے سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ بلکہ سب سے بڑا مسئلہ قدیم طرز املا اور لفظوں کے رسم الخط کی وجہ سے پیش آتا ہے، کیونکہ اس مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس کے پاس کوئی متفقہ اصول، منظم قاعدہ اور طے شدہ ضابطہ نہیں ہوتا، اسے اس معاملے میں کلیتاً اپنے علم وفہم پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ تو ایسے ہیں جن کا املا پچاس ساٹھ سال قبل جو تھا اور اب وہ جس طرح لکھے جاتے ہیں، اس کو پہچاننا مشکل نہیں ہے، مگر ایسے الفاظ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، جن کے املا کے تعلق سے نہ ماضی میں کوئی اتفاق رائے تھا اور نہ آج کوئی طے شدہ اصول ہے، چنانچہ جس مصنف یا تخلیق کار کو جیسا بہتر سمجھ میں آتا ہے ویسے انھیں تحریر کرتا ہے۔ ذیل میں اس اہم ترین مسئلے کے کچھ گوشوں پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا ہے، اردو الفاظ میں نقطوں کی بڑی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے، ان نقطوں کے ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے بعض الفاظ کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے معنوں میں بھی بڑی غیر معمولی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ مگر ماضی میں کاتب حضرات حروف پر نقطے ڈالنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے، جس کی وجہ سے ان متون کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر نذیر احمد نے لکھا ہے، ان نقطوں کی وجہ سے ان تمام زبانوں کے متون کے ساتھ یہ مسئلہ لگا ہوا ہے، جو عربی فارسی رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں۔[2]

رسم الخط اور طرز املا کی وجہ سے متن میں بہت سی قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، مثال کے طور پر متعدد حروف صرف نقطوں کی کمی بیشی یا انھیں اوپر یا نیچے لگائے جانے سے بدلتے ہیں، ان کی شکل مفرد صورت میں کچھ اور ہوتی ہے اور مرکب صورت میں کچھ اور ہوتی ہے، جب ایسے حروف دوسرے حروف سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو بسا اوقات غلط پڑھے جاتے ہیں اور پھر وہی غلطی نقل در نقل چلتی رہتی ہے۔ جیسے کہ ب، پ، ت، ث میں فرق صرف نقطوں کا ہے، نقطوں کی تعداد اور انھیں اوپر یا نیچے رکھنے کا، جب یہ حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں تو شوشے کی صورت میں تبدیل ہوجاتے ہیں، ایسی صورت میں س، ش، ن، ی اور ے بھی اسی زمرے میں شامل ہوجاتے ہیں، شوشے اگر درست طریقے سے استعمال کیے گئے ہیں تب تو ان کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے لیکن شوشے کم رہ گئے ہیں تو مشکل بڑھ جاتی ہے، جیسے دیوانِ اثر (مخزونہ جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں ایک شعر ہے۔

حق تری تیغ کا ادا نہ ہوا
اپنی گردن پہ سر 'پہ' بار رہا

یہاں سر کے بعد 'پہ' کے بجائے 'یہ' کا موقع ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر نے یہی لکھا ہوگا مگر کاتب کو نقطوں کا صحیح اندازہ نہیں ہوا ہوگا اور اس نے 'یہ' کو 'پہ' لکھ دیا۔

کلیات سودا مرتبہ رچرڈسن میں ایک شعر ہے۔

سودا اس قوم سے کہہ بھاگیں اب اس پیشے سے
رگڑیں فرہاد صفت سر 'نہ' میرے تیشے سے

جب کہ کلیات سودا مرتبہ آسی میں دوسرا مصرع یوں ہے۔

رگڑیں فرہاد صفت سر 'یہ' میرے تیشے سے

یہاں نقطے کے اوپر نیچے ہونے سے مصرعے میں تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔

تذکرۂ سرور میں ایک شعر ہے:

گر تاقۂ لیلیٰ کے چرانے کی ہے خواہش
مجنوں تجھے لازم ہے لباسِ 'سبزی' رنگ

یہاں دوسرے مصرعے میں صحیح لفظ 'شتری' ہونا چاہیے تھا۔ یہاں بھی شوشے اور نقطے کی وجہ سے لفظ بدل گیا ہے۔

بعض دفعہ پورا لفظ بدل جاتا ہے، جیسے میر اثر کا شعر ہے۔

کون پتھر ہے دل ترا ظالم
ایسے 'نالوں' سے جو پگھل نہ گیا

دوسرے مصرعے میں 'نالوں' کی جگہ کچھ نسخوں میں 'باتوں' ہے۔

کبھی کبھی کاتب یا ناقل کسی مصرعے میں اپنی طرف سے کوئی لفظ بڑھا دیتا ہے، جیسے راغب کا ایک شعر ہے۔

اے وائے بیٹھتے ہی یہ کیا جی میں آگیا
محفل سے اپنی تو نے ہمیں کیوں 'کر' اٹھا دیا

یہاں دوسرے مصرعے میں 'کیوں' کے بعد 'کر' زائد ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے مصرعے کا وزن مارا جاتا ہے۔

جب م، ق اور ف کو ملا کر لکھتے ہیں تو اس سے بھی متن کے پڑھنے اور نقل کرنے میں غلطی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے جیسے تذکرہ سرور مرتبہ خواجہ احمد فاروقی میں ایک شعر ہے۔

مے کے پینے سے تو ہاں ہم نے نباہی توبہ
پر 'فغاں' سے یہ خجل ہیں کہ الٰہی توبہ

یہاں دوسرے مصرعے میں 'فغاں' کی جگہ 'مغاں' ہونا چاہیے تھا۔

یائے معروف و مجہول

اسی طرح اردو کے قدیم رسم الخط میں یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا یعنی دونوں کو گول یا کے ساتھ لکھا جاتا ہے، اس کی وجہ سے بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کلیات سودا مرتبہ آسی میں ایک شعر ہے۔

سودا 'گلی' میں یاد کی گو بولتا ہے گرم
پر ہر سخن کے ساتھ دمِ سرد ہے سو ہے

جب کہ پہلا مصرع نسخۂ جانسن میں یوں ہے۔

سودا 'گلے' میں یار کے گو بولتا ہے گرم

معلوم ہوا کہ شاعر نے یا اولین کاتب نے یائے مجہول کو گول یا کی صورت لکھا تھا، بعد میں جب آسی نے کلیات سودا مرتب کیا تو اسے یائے معروف سمجھ کر نقل کر دیا، جبکہ دوسرے مرتب نے یائے مجہول کے طور پر نقل کیا ہے۔

اس یائے معروف و یائے مجہول میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بعض دفعہ بہت مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے غالب کا ایک شعر ہے۔

'آئے' ہو کل اور آج ہی 'کہتے' ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

پہلا مصرع دیوان غالب کے نسخۂ نظامی کانپور مطبوعہ 1863 میں اس طرح لکھا گیا ہے۔

'آئی' ہو کل اور آج ہی 'کہتی' ہو کہ جاؤں

تشدید، ترکیب

قدیم متون میں حروف پر تشدید لگانے کا بھی اہتمام نہیں کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے بھی بہت سی غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ اسی طرح قدیم متون میں ایسے بھی بے شمار الفاظ ملتے ہیں جہاں الگ الگ لکھے جانے والے دو یا ان سے زائد لفظوں کو ملا کر لکھ دیا گیا ہے، ایسے الفاظ کو پڑھنے اور سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے، جیسے کربل کتھا میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں:

ظلمکی (ظلم کی)
بغلمیں (بغل میں)
آہمارےکو (آہمارے کو)
بہنکوں (بہن کوں) وغیرہ

لفظوں کو توڑ کر لکھنا

قدیم متون میں دو لفظوں کو ملا کر لکھنے کے ساتھ ایک ہی لفظ کو دو حصوں میں توڑ کر لکھنے کی روایت بھی عام رہی ہے اور اس کی مثالیں بھی بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ جیسے کربل کتھا میں ہی 'بیٹھتی'، 'پہنتی'، 'ٹوٹتا'، 'ڈھونڈتا' اور مردانگی' جیسے الفاظ کو 'بیٹھ تی'، 'پہن تی'، 'ٹوٹ تا'، 'ڈھونڈھ تا'، 'مردانہ گی' لکھا گیا ہے۔ ایسے ہی کلیات ناسخ میں ایک شعر ہے۔

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو 'ہل کا'

دوسرے مصرعے کے آخر میں 'ہل کا' دراصل 'ہلکا' ہے۔

ہائے مخلوط

قدیم تصانیف میں ہائے مخلوط کا استعمال بھی بہت کم ہوا ہے، زمانۂ قدیم میں عموماً ایسی جگہوں پر جہاں ہائے مخلوط کا موقع ہوتا تھا یا تو ہا استعمال نہیں کرتے تھے یا لٹکن والی ہا ہی استعمال کرتے تھے، اب آج کے زمانے میں ایسے متون کو پڑھتے ہوئے الجھن ہونا فطری ہے کیوں کہ ہم اس کے عادی نہیں ہیں۔ محمود شیرانی نے اپنے مرتبہ 'مجموعۂ نغز' کے رسم الخط پر تبصرہ کرتے ہوئے ان الفاظ کی نشان دہی کی ہے جن میں ہائے مخلوط کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، جیسے:

مجکو (مجھ کو)
اونگ (اونگھ)
سونگ (سونگھ)
پگلاتا (پگھلاتا)
ہاتوں (ہاتھوں)

مصوتوں کا مسئلہ

اسی طرح اردو رسم الخط میں بعض مصوتوں کے لیے باقاعدہ حروف نہیں ہیں بلکہ زیر زبر اور پیش سے ان کے تلفظ کا تعین کیا جاتا ہے۔ اب پرانے متن میں ایک لفظ مستعمل ہے اور اس پر کوئی حرکت نہیں لگائی گئی ہے تو اس زمانے کے حساب سے اس کے تلفظ کا تعین تقریباً ناممکن ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ بھی بڑی تعداد میں ہیں جن کے مصوتے بدل جانے سے ان کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مرتب متن کی ذمے داری ہے کہ وہ بڑی باریک بینی سے متن کو پڑھے اور حسب موقع و محل درست تلفظ طے کرنے کی کوشش کرے۔ اعراب بالحروف کا رواج بھی قدیم زمانے میں عام تھا جیسے زیر کی جگہ 'ی' اور پیش کی جگہ 'و' استعمال کرنا، اس پر بھی مرتب متن کی نگاہ ہونی چاہیے۔

عام طرز کے برخلاف املا

بعض دفعہ قدیم تحریروں میں روشِ عام کے برخلاف انفرادی طرزِ املا بھی پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اسے پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ مثلاً بالخیر، باللہ، بالکل اور بالفعل، بالکلیہ وغیرہ جیسے الفاظ جو عربی سے اردو میں منتقل

اردو میں ایسے الفاظ بھی بڑی تعداد میں ہیں جن کے مصوتے بدل جانے سے ان کے معنی بدل جاتے ہیں، ایسی صورت میں مرتب متن کی ذمے داری ہے کہ وہ بڑی باریک بینی سے متن کو پڑھے اور حسب موقع و محل درست تلفظ طے کرنے کی کوشش کرے، اعراب بالحروف کا رواج بھی قدیم زمانے میں عام تھا جیسے زیر کی جگہ 'ی' اور پیش کی جگہ 'و' استعمال کرنا، اس پر بھی مرتب متن کی نگاہ ہونی چاہیے۔

ہوکر اب اردو ہی ہوگئے ہیں، ان کا املا عموماً اسی طرح کیا جاتا ہے جیسا کہ مذکور ہوا یعنی ب اور لام کے درمیان الفِ غیر ملفوظ کے ساتھ، مگر بعض لوگ اس الف کو بھی لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں یعنی 'بالفعل' کو 'باالفعل' لکھتے ہیں اور 'بالکل' کو 'باالکل' لکھتے ہیں۔ آج کل تو اگر کوئی ایسے لکھے تو اسے لاعلمی پر محمول کیا جاتا ہے مگر قدیم عہد میں متعدد مصنفین و شعرا اس طرز املا پر ہی عمل پیرا تھے، جیسے حنیف نقوی کی تحقیق کے مطابق مرزا غالب نے ایسے تمام الفاظ کو الف کے ساتھ ہی لکھا ہے۔[3]

گول اور لمبی ت

گول اور لمبی ت (تائے قرشت اور تائے مدورہ)

> املا اور رسم الخط کے اختلاف اور قدامت کی وجہ سے پیدا ہونے والے ان مسئلوں کی وجہ سے ایک ہی متن کے مختلف نسخوں میں بعض الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، عبارتیں کچھ سے کچھ ہوجاتی ہیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے معنوں میں تبدیلی کا بھی امکان پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں مرتب متن کے لیے بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف قراتوں والے ایک ہی متن کے متعدد نسخوں میں سے کس کو اختیار کرے یا ان کی تصحیح کا فریضہ کیسے انجام دے۔ ایسے موقعے پر علمی وسعت کے ساتھ بڑی گہری بصیرت اور دانش مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بھی قدیم متون کو پڑھنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ دراصل عربی میں دو قسم کی تائیں ہیں ایک مدورہ یعنی گول تا جو کہ وقفے کے موقعے پر ہا سے بدل جاتی ہے اور ایک ہے تائے قرشت یعنی لمبی تا جو ہمیشہ پڑھی جاتی ہے۔ اردو میں جو 'تا' پڑھی اور بولی جاتی ہے وہ عموماً لمبی تا کے ساتھ لکھی جاتی ہے، ورنہ 'ۃ' لکھی جاتی ہے، مگر عربی کی تقلید یا تاثر کے نتیجے میں بہت سے الفاظ مثلاً 'صلوۃ، زکوۃ' وغیرہ گول تا سے بھی لکھے جانے لگے ہیں، یہ چیزیں بھی مرتب متن کے ذہن میں ہونی چاہیے۔

کاف اور گاف

قدیم طرز املا میں بعض دفعہ کاف اور گاف کے درمیان فرق و تمیز کا بھی اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے بھی بعض متون کو سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے، کیوں کہ اگر گاف کی جگہ کاف پڑھ لیا اور کاف کی جگہ گاف پڑھ لیا تو معنی میں بڑی تبدیلی واقع ہونے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے اور لفظوں کی ہیئت پوری طرح بدل جاتی ہے۔ جیسے کہ 'باگ' اور 'ٹوٹ' کی ترکیب سے ایک لفظ بنا ہے 'بگٹٹ'، اس لفظ کو 'فسانۂ عجائب' کے بعض نئے ایڈیشنز میں 'بکٹٹ' لکھا گیا ہے، یعنی یہ بالکل نیا ہی لفظ بن گیا ہے۔ ایک اور لفظ 'لگان' جس کے معنی دریا کے کنارے کشتیوں کے لنگر انداز ہونے کی جگہ کے ہیں، نئے ایڈیشنز میں 'لکان' بنا دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے نہ صرف لفظ بدلا بلکہ اس کے معنی بھی کلیتاً مختلف ہوگئے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں قدیم متون کے نئے پرانے نسخوں میں موجود ہیں۔ جیسے شورش عظیم آبادی کے تذکرے میں ایک جگہ میر کا درج ذیل شعر اس طرح منقول ہے۔

جو ترے کوچے میں آیا پھر نہیں کاڑھا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا

پروفیسر محمود الٰہی کے مرتبہ ایڈیشن میں 'کاڑھا' کو 'گاڑھا' بنادیا گیا ہے اور اس مناسبت سے 'نہیں' کو 'ہمیں' بنادیا گیا ہے۔

کیجیے اور کیجے، ایدھر اور ادھر، یاں اور یہاں

عام طور پر اشعار میں کہیں 'کیجیے' کا موقع ہوتا ہے اور کہیں 'کیجے' کا۔ اس کا تعلق وزن شعری سے ہے، اگر ذرا بے توجہی برتی جائے یا کاتب کو شعر و سخن سے کوئی انسیت نہ ہو تو وہ کیجے کو کیجیے لکھ دیتا ہے اور اس کی وجہ سے شعر کا وزن بگڑ جاتا ہے۔ اس کی مثالیں قدیم شاعری میں بھری پڑی ہیں۔ یہی حال ایدھر اور ادھر، یاں اور یہاں، واں اور وہاں کا ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے آخر میں اگر 'نون' ہے تو اس کو ظاہر کرنا ہے یا نون غنہ کے طور پر پڑھا جائے گا یہ بھی اگر واضح نہ ہو تو شعر کی موزونیت متاثر ہوتی ہے اور بعض دفعہ معنی میں بھی خرابی واقع ہوجاتی ہے۔

املا اور رسم الخط کے اختلاف اور قدامت کی وجہ سے پیدا ہونے والے ان مسئلوں کی وجہ سے ایک ہی متن کے مختلف نسخوں میں بعض الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، عبارتیں کچھ سے کچھ ہوجاتی ہیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے معنوں میں تبدیلی کا بھی امکان پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں مرتب متن کے لیے بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف قراتوں والے ایک ہی متن کے متعدد نسخوں میں سے کس کو اختیار کرے یا ان کی تصحیح کا فریضہ کیسے انجام دے۔ ایسے موقعے پر علمی وسعت کے ساتھ بڑی گہری بصیرت اور دانش مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خلیق انجم نے اس کی مختلف شکلوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس مسئلے سے نمٹنے کے طریقوں کی نشان دہی یوں کی ہے:

1. اگر ایک نسخے کی قرأت میں ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جو مصنف کے عہد میں رائج نہیں تھا یا کم رائج تھا یا اس کا تلفظ مختلف تھا اور دوسرے نسخے کی قرأت اس عہد سے زیادہ قریب ہے تو دوسری قرأت کو ترجیح دی جائے گی۔
2. ایک بامعنی قرأت کو بے معنی قرأت پر ترجیح دی جائے گی۔
3. اگر کسی قرأت میں ایک یا ایک سے زیادہ الفاظ زائد ہیں تو دوسری قرأت قابل ترجیح ہوگی۔
4. اگر کسی قرأت میں ایک یا اس سے زیادہ الفاظ حذف ہوگئے ہیں تو دوسری قرأت کو ترجیح حاصل ہوگی۔
5. اگر ایک قرأت بامعنی ہے لیکن سیاق و سباق کے مطابق نہیں ہے اور دوسری ہے، تو دوسری کو ترجیح ہوگی۔
6. اگر کوئی قرأت کاتب کی غلطی سے مکرر ہوگئی ہے تو اس قرأت کو ترجیح دیں گے جو مکرر نہ ہو۔
7. یہ ممکن ہے کہ دو نسخوں میں ایک مقام پر ایسی دو قرأتیں آجائیں، جن میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہو تو ایسی صورت میں بنیادی نسخے کی قرأت کو ترجیح دی جائے گی۔ جیسے دیوان تاباں کا ایک شعر ہے۔

کس پری رو نے 'چرایا' دل مرا معلوم نہیں
ڈھونڈھتا ہوں کیا ہوا دل، ہائے دل، افسوس دل

بعض نسخوں میں پہلے مصرعے میں 'چرایا' کی جگہ 'چھپایا' بھی منقول ہے اور یہ دونوں ہی لفظ بامعنی اور موقع کے مناسب ہیں، ایسی صورت میں مرتب متن کو چاہیے کہ بنیادی نسخے میں جو قرأت ہو اسی کو ترجیح دے۔[4]

حواشی

1. متنی تنقید، خلیق انجم، ص 64
2. تصحیح و تحقیق متن، پروفیسر نذیر احمد، ص 18
3. تحقیق و تدوین: مسائل و مباحث، پروفیسر حنیف نقوی، ص 150
4. متنی تنقید، خلیق انجم، ص 98

■

Abdul Bari Qasmi
C-145/1, GF, Tayyab Lane
Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Email.: abariqasmi13@gmail.com

فرحت علی

اختراعی تدریس و اکتساب

دور جدید مسابقت کا دور ہے۔ تعلیم کا مقصد طلبا کو صرف نصابی کتابیں پڑھانا نہیں بلکہ ان میں جدید سوچ، تخلیقی ماحول اور خود کفالت کو فروغ دینا ہے۔ اسی لیے تعلیمی اداروں کو مواصلات کے جدید طریقے اپنانے چاہیے۔ تدریس کے جدید طریقے تلاش کرنا ایک اہم ہنر ہے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کچھ تدریسی طریقہ کار اور حکمت عملی یقیناً تعلیم و تفہیم کی سطح میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ تدریس کے کچھ اختراعی طریقے جو طلبا تک معلومات پہنچانے میں موثر رول ادا کرتے ہیں، ان میں متعدد ڈیجیٹل میڈیا کی اقسام جیسے متن، تصاویر، آڈیو اور ویڈیو کو ایک مربوط کثیر حسی انٹرایکٹو ایپلی کیشن یا پریزنٹیشن شامل ہیں۔ طلبا اس وقت موثر طور پر سیکھتے ہیں۔ جو طلبا اکتسابی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے ہیں وہ زیادہ مستقل مزاجی اور کام کی تکمیل کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی تدریس واکتساب کے ماحول کو دلچسپ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہاں کچھ تخلیقی تجاویز ہیں جو تدریسی حکمت عملیوں کو جدید بنانے اور طلبا کی مصروفیتوں کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کریں گی۔

تدریس کے اختراعی طریقے

اختراعی تدریس کا مطلب استاد کی تخلیقی صلاحیت اور نیاپن ہے جو پڑھانے کے انداز اور طریقہ کار کو بدل دیتا ہے۔ پوری دنیا میں، تعلیمی ادارے طلبا میں علم کے اضافے کے لیے نئی طرز رسائی، طریقوں اور ٹیکنالوجی پر مبنی ایجادات کو عمل میں لا رہے ہیں۔ اختراعی تدریس تعلیم کے حال اور مستقبل کے لیے ضروری ہے تاکہ طلبا کو ان کی مکمل صلاحیتوں کو پہچاننے میں مدد مل سکے۔ اعلیٰ تعلیم کو طالب علم کے طویل مدتی فکری تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر، کیا اساتذہ کی طرف سے نیا مواد فراہم کرنے سے طالب علم کو نئی بصیرت حاصل کرنے میں مدد ملی یا فکری محرک کے نئے راستے کھلے یا طالب علم کی ضروری اور تخلیقی سوچ کی قوت میں اضافہ ہوا؟ آنے والی نسلوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تمام اساتذہ کو جدید تدریسی طریقوں پر عمل کرنا چاہیے۔ تاہم، اختراعی تدریس کے لیے، اساتذہ کی قابلیت اختراعی تدریسی کارکردگی کو متاثر کرنے والا ایک اہم عنصر ہے۔ کچھ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کچھ اساتذہ اختراعی تدریسی حکمت عملیوں کو اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔ یہاں ہر تدریس کے چند اختراعی طریقوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

1. **پیشے کے تئیں وفاداری اور محبت کا جذبہ:** ایک استاد اپنے تدریسی فرائض کو اس وقت بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے جب اس کا رحجان پیشے کے تئیں مثبت ہو اور اس سے انسیت رکھتا ہو۔ جب استاد دباؤ محسوس نہیں کریں گے تو وہ زیادہ تخلیقی طریقہ کار اپنائیں گے اور آزادانہ طور پر کام کریں گے۔ اپنے پیشے کے تئیں محبت آپ کو پرسکون رکھتی ہے اور آپ کو نئے طریقہ کار کو آزمانے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

2. **سمعی و بصری آلات:** استاد اپنے درس و تدریس کے عمل میں سمعی و بصری مواد شامل کریں۔ نصابی کتابوں میں ماڈلز، فلمیں، دیگر بصری مواد شامل کریں۔ معلوماتی گرافکس یا تصویریں اور دوسرے ایسے آلات استعمال کریں جو طلبا کے تخیل کو پروان چڑھانے میں مدد کریں۔ یہ طریقے نہ صرف ان کی سننے کی صلاحیت کو فروغ دیں گے بلکہ انھیں تصورات کو بہتر طور پر سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ مثال کے طور پر، استاد کچھ زبانی تاریخ کا مواد حاصل کر سکتے ہیں، لائیو آن لائن مباحثے کر سکتے ہیں یا عوامی لیکچرز کی پلے بیک ریکارڈنگ کر سکتے ہیں۔ پری اسکول کے بچوں کے لیے، بہت سی بہتر ایپس ہیں جنھیں استاد سلائیڈ شوز یا پریزنٹیشن کو موثر بنانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

3. **بَرین اسٹارمنگ:** یہ طریقہ تدریس بچوں میں تخلیقی سوچ اور معلومات اکٹھا کرنے کی صلاحیت اجاگر کرتا ہے۔ کسی بات یا مسئلے پر بہتر فیصلہ کرنے کو ممکن بنانے کے لیے ہم مختلف آپشن سوچتے ہیں۔ جتنے زیادہ آپشن ہوں گے ہم بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔ آپشن ڈھونڈنے یا سوچنے کا ایک طریقہ کار بنایا گیا ہے اس کو بَرین اِسٹارمنگ کہتے ہیں۔ استاد کو چاہیے کہ درس و تدریس کے دوران بَرین اِسٹارمنگ کے لیے کچھ وقت مختص کریں۔ اس طریقہ کار کے ذریعے طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو باہر نکالنے میں مدد ملے گی اور ساتھ ہی ان کے تخیل کو بھی جلا ملے گی۔ جب مختلف اذہان کسی ایک تصور پر توجہ مرکوز کر رہے ہوں تو آپ یقین کر سکتے ہیں کہ آپ مختلف قسم کے خیالات حاصل کر سکتے ہیں اور بحث میں سب کو شامل کر سکتے ہیں۔ یہ سرگرمی طلبا کے لیے صحیح یا غلط کی فکر کیے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوگی۔ استاد کو چاہیے کہ اس سرگرمی کو عمل میں لانے سے پہلے کچھ بنیادی اصول مرتب کرے، جس سے اس سرگرمی کو منظم طور پر انجام دیا جاسکے۔

4. **کمرہ جماعت کے باہر تدریس:** کچھ اسباق بہترین طریقے سے سیکھے جاتے ہیں، جب انھیں کمرہ جماعت کے باہر پڑھایا جاتا ہے۔ فیلڈ ٹرپس کا اہتمام کریں جو اسباق سے متعلق ہوں یا صرف طلبا کو کمرہ جماعت سے باہر سیر کے لیے لے جائیں۔ بچوں کو یہ تازہ اور پرجوش لگے گا اور بتائی گئی چیزیں تیزی سے سیکھیں گے اور یاد رکھیں گے۔ ہر عمر کے طلبا کے لیے رول پلے کرنا سب سے زیادہ موثر ہے۔ آپ اسے عمر کے مطابق گروپ میں منقسم کر سکتے ہیں۔ یہ حکمت عملی بچوں کو پڑھانے کے لیے بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ ان کی محدود توجہ کی مدت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے کافی رکھیں۔

5. **رول پلے یا کردار نبھانا:** رول پلے یا کردار نبھانا ایک ایسی تدریسی حکمتِ عملی ہے جو کہ سماجی سائنس کے زیر اثر آتی ہے۔ یہ حکمتِ عملی تعلیم کے سماجی پہلو پر زور دیتی ہے اور باہمی تعاون کے رویئے کو بچے کی معاشرتی اور ذہنی نشوونما کے لیے ایک عمل انگیز گردانتی ہے۔ یہ حکمتِ عملی اساتذہ اور طلبا دونوں کے لے بہت سودمند ثابت ہوتی ہے۔ رول پلے کے ذریعے پڑھانا بچوں کو ان کی سہولت پسندی سے باہر نکلنے اور ان کی باہمی مہارتوں کو فروغ دینے کا ایک بہترین طریقہ ہے۔ یہ طریقہ کارآمد ہے، خاص طور پر جب آپ ادب، تاریخ یا موجودہ واقعات پڑھا رہے ہوں۔ کردار ادا کرنے کا طریقہ طالب علم کو یہ سمجھنے میں مدد کرے گا کہ تعلیمی مواد اس کے روزمرہ کی سرگرمیوں سے کس طرح مطابقت رکھتا ہے۔

6. **نئے خیالات کی سراہنا:** وسیع النظری کا رویہ استاد کو تدریس کے نئے طریقوں کو اختراع کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ وسیع النظر ہونے کے باوجود بھی، بعض اوقات ہم میں سے اکثر نئے خیالات کا اظہار کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔

ایک استاد کے طور پر ایسا کبھی نہ کریں: ہمیشہ نئے خیالات کو قبول کرنے کی کوشش کریں، چاہے وہ پہلے غیر معمولی ہی کیوں نہ ہوں۔

7. **پہیلیاں اور گیمز:** جب پہیلیاں اور کھیل نصاب میں شامل کیے جائیں تو سیکھنا خوشگوار ہوتا ہے۔ بچوں کو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ سیکھ رہے ہیں جب ان کے اسباق کو گیمز کے ذریعے متعارف کرایا جاتا ہے۔ پہیلیاں اور گیمز بچوں کو تخلیقی انداز میں سوچنے اور مسائل کا سامنا کرنے میں مدد کرتی ہیں۔

8. **تخلیقی مہارتوں پر مبنی کتب کا مطالعہ:** تخلیقی استاد بننے کے لیے، آپ کو تخلیقی خیالات اور تکنیکوں پر کچھ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں پر بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ کچھ بہترین کاموں کا انتخاب کریں اور سیکھنا شروع کریں، یہ آپ کی پیشہ ورانہ ترقی کے لیے بھی مددگار ثابت ہوگا۔

9. **اسباق کو کہانی کی طرح پیش کرنا:** ذرا سوچیں، آپ فلمیں زیادہ دلچسپی سے کیوں دیکھتے ہیں؟ آپ فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ آپ کو مصروف رکھنے کے لیے اس میں ایک دلچسپ کہانی ہوتی ہے۔ اس طرح، اکتساب کے مخصوص اوقات کو زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا ہے جب اسے کہانی کی طرح پیش کیا جائے۔ اگر آپ کے اندر تخلیقی صلاحیت ہے تو ریاضی کے اسباق بھی دلچسپ کہانیوں سے مربوط کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ نالج اینڈ ہیومن ڈیولپمنٹ اتھارٹی (KHDA) کی جانب سے اسکولوں پر تدریس اور سیکھنے کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کرنے پر زور دینے کے ساتھ، یہ اختراعی خیالات یقینی طور پر تدریسی طریقوں کو مزید موثر بناتے ہیں۔

اب ہم اکتساب کے اختراعی طریقے کیا ہیں اس پر بات کریں گے۔

اکتساب کے اختراعی طریقے

1. **کراس اوور لرننگ:** غیر رسمی جگہوں میں سیکھنا، جیسے عجائب گھر اور اسکول کے بعد کے کلب، تدریسی مواد کو ان موضوعات سے جوڑ سکتے ہیں جو سیکھنے والوں کے لیے اہم ہیں۔ یہ کنکشن دونوں سمتوں میں کام کرتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں سیکھنے کو حقیقی زندگی کے تجربات سے وسعت دی جا سکتی ہے، اور کمرہ جماعت کے سوالات اور علم کو شامل کر کے غیر رسمی سیکھنے کو مزید موثر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مربوط تجربات سیکھنے کے لیے مزید دلچسپی اور تحریک پیدا کرتے ہیں۔

استاد کے لیے ایک موثر طریقہ یہ ہے کہ وہ کمرہ جماعت میں کوئی سوال تجویز کرے اور اس پر بحث کرے، پھر سیکھنے والے اس سوال کو میوزیم کے دورے یا فیلڈ ٹرپ پر دریافت کریں، ثبوت کے طور پر تصاویر یا نوٹ جمع کریں، پھر انفرادی یا گروہی جوابات تیار کرنے کے لیے ان کے نتائج کو دوبارہ کلاس میں شیئر کریں۔ یہ کراس اوور سیکھنے کے مواقع دونوں ترتیب کے بہترین پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور طلبا کو مستند اور دلچسپ سیکھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ چونکہ سیکھنا زندگی کا ایک مسلسل عمل ہے، متعدد سیاق و سباق میں تجربات پر روشنی ڈالتے ہوئے، وسیع تر موقع یہ ہے کہ سیکھنے والوں کو ان کے مختلف سیکھنے کے واقعات کو ریکارڈ کرنے، لنک کرنے، یاد کرنے اور شیئر کرنے میں مدد فراہم کی جائے۔

2. **استدلال کے ذریعے سیکھنا:** طلبا پیشہ ور سائنسدانوں اور ریاضی دانوں کی طرح مکالمہ کر کے اپنی سمجھ کو فروغ دے سکتے ہیں۔ استدلال طلبا کو متضاد خیالات میں شرکت کرنے میں مدد کرتا ہے، جو ان کے اکتساب کی سطح کو بہتر کر سکتا ہے۔ یہ تکنیکی استدلال کو سب کے لیے قابل رسائی بناتا ہے۔ یہ طلبا کو دوسروں کے ساتھ خیالات کو بہتر بنانے کی بھی اجازت دیتا ہے، لہٰذا وہ سیکھتے ہیں کہ سائنسدان دعوؤں کو قائم کرنے یا ان کی تردید کے لیے کس طرح مل کر کام کرتے ہیں۔

طلبا کو کھلے سوالات پوچھنے، مشاہدات کو مزید سائنسی اصطلاحات میں دوبارہ بیان کرنے، اور وضاحتیں بنانے کے لیے ماڈل بنانے اور استعمال کرنے کی ترغیب دے کر، اساتذہ اپنی کلاسوں میں بامعنی بحث کو فروغ دے سکتے ہیں۔ طلبا جب سائنسی انداز میں بحث کرتے ہیں تو توجہ سے سننا، اور تعمیری مکالمے میں مشغول ہونا سیکھتے ہیں۔ پیشہ ورانہ ترقی ان مہارتوں کو سیکھنے اور مسائل پر قابو پانے میں اساتذہ کی مدد کر سکتی ہے، جیسے کہ طالب علموں کے ساتھ اپنے فکری تجربے کو ذمے داری سے کیسے پہنچانا ہے۔

3. **اتفاقی اکتساب:** اتفاقی اکتساب غیر منصوبہ بند یا غیر ارادی طور پر سیکھنا ہے۔ یہ کسی ایسی سرگرمی کو انجام دینے کے دوران ہو سکتا ہے جو بظاہر سیکھی ہوئی چیزوں سے غیر متعلق ہو۔ اس موضوع پر تحقیق میں بتایا گیا کہ لوگ اپنے کام کی جگہوں پر اپنے روزمرہ کے معمولات میں کیسے سیکھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کے لیے، موبائل ڈیوائس کو ان کی روزمرّہ کی زندگیوں میں ضم کر دیا گیا ہے، جو ٹیکنالوجی سے تعاون یافتہ واقعاتی سیکھنے کے بہت سے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اتفاقیہ سیکھنا رسمی تعلیم سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کی نگرانی استاد نہیں کرتا، پہلے سے طے شدہ نصاب پر عمل نہیں کرتا، اور رسمی سند کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی۔

4. **عملی مشق:** مستند سائنسی ٹولز اور مشق جیسے کہ ریموٹ لیبارٹری کے تجربات کو کنٹرول کرنا سائنس کی انکوائری کی مہارتیں پیدا کر سکتا ہے، تصوراتی سمجھ کو بہتر بنا سکتا ہے اور حوصلہ افزائی کر سکتا ہے۔ خصوصی آلات تک ریموٹ رسائی، جو پہلے سائنسدانوں اور یونیورسٹی کے طلبا کے لیے تیار کی گئی تھی، اب تربیت یافتہ اساتذہ اور اسکول کے طلبا تک پھیل رہی ہے۔ ماہر آلات تک ریموٹ رسائی، جس کا مقصد ابتدائی طور پر سائنسدانوں اور یونیورسٹی کے طلبا کے لیے تھا، اب اسی تربیت یافتہ ہدایت کار اور اسکول کے بچوں تک وسعت دی جا رہی ہے۔ کر کے سیکھنا ایک سادہ سا خیال ہے کہ جب ہم عمل کرتے ہیں تو ہم کسی چیز کے بارے میں مزید سیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تجرباتی سیکھنے کا سلسلہ اب کئی سالوں سے جاری ہے۔ ارسطو ہی نے لکھا تھا کہ ”جن چیزوں کو کرنے سے پہلے ہمیں سیکھنا پڑتا ہے، ہم ان پر عمل کر کے سیکھتے ہیں۔“ اس ڈیزائن کے بہت سے نمونے ہیں جو حقیقی دنیا کے ماحول میں سیکھنے کو قوت بخشتے ہیں، جیسے: لیبارٹری، ورکشاپ یا اسٹوڈیو کا کام، اپرنٹس شپ ٹریننگ، مسئلہ پر مبنی سیکھنا، کیس پر مبنی سیکھنا، پروجیکٹ پر مبنی سیکھنا، انکوائری پر مبنی سیکھنا، کوآپریٹو (کام یا کمیونٹی پر مبنی) سیکھنا، وغیرہ۔

5. **ایمبڈیڈ اکتساب:** ایمبڈیڈ اکتساب یا) مجسم سیکھنا (سے مراد تدریسی نقطہ نظر ہے جو غیر ذہنی اجزا پر توجہ مرکوز کر کے سیکھنے میں جسم اور احساسات کے کردار پر زور دیتے ہیں۔ اس طریقے میں، کوئی شخص نہ صرف تدریس کا ایک فکری طریقہ پیش کرتا ہے، بلکہ پورے جسم کو بھی شامل کرتا ہے۔ مجسم سیکھنے میں، مقصد یہ ہے کہ دماغ اور جسم مل کر کام کریں تاکہ جسمانی تاثرات اور اعمال سیکھنے کے عمل کو تقویت دیں۔ یہ بھی سیکھنے کا ایک تفریحی طریقہ ہے۔

خلاصہ

اس مقالے میں طلبا کو ان کی مہارتوں کو تربیت دینے کا ایک نیا طریقہ دے کر کمرہ جماعت میں تدریس و اکتساب کے جدید طریقوں پر توجہ دی گئی ہے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ کمرہ جماعت میں نئی تکنیکی ٹیکنالوجی کو شامل کریں اور مواد کے ہدایتی طریقہ کار کو تبدیل کرنے کے لیے ملٹی میڈیا کا استعمال کریں۔ اس سے استاد اسباق کو زیادہ معنی خیز انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ نئے طریقوں کو شامل کرنے سے طلبا کو زیادہ توجہ دینے اور معلومات کو بہتر طریقے سے برقرار رکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ تدریس کا بنیادی مقصد معلومات یا علم کو طالب علم کے ذہنوں تک منتقل کرنا ہے۔ تدریس کا انحصار مواصلات کے کامیاب موڈ پر ہوتا ہے۔ اختراعی اساتذہ اچھی تدریس کے چیمپئن اور رول ماڈل ہیں۔

■

Dr. Farhat Ali
Associate Professor, Dept of Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:7396835675

آسمان ادب کا روشن ستارہ

گیان چند جین

ایم اے کنول جعفری

اردو دنیا کی ایسی زبان ہے، جس کی سادگی، شیرینی اور لطافت نے نہ صرف عالمی ادب پر اپنے ناقابل فنا نقوش چھوڑے، بلکہ اس ہر دل عزیز زبان نے ہر ملک، ہر خطے، ہر مذہب اور ہر برادری کے لوگوں کو اپنی جانب ملتفت ہونے پر مجبور کیا ہے۔ اردو کی آبیاری کے لیے ادبی شخصیات نے بغیر امتیاز مذہب و ملت مقدور بھر قربانیاں دے کر اسے اس مقام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا، جہاں پہنچنے کے بعد کوئی بھی زبان اپنے اوپر ناز کر سکتی ہے۔ اردو کے تعلق سے یہ بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ اس کا جنم ہندوستان میں ہوا۔ برصغیر کی یہ پیاری زبان شہنشاہوں، بادشاہوں، نوابوں، مہاراجاؤں، راجاؤں، زمینداروں اور اہل ثروت کے محلوں، قلعوں، گڑھوں، فوجوں، لشکروں اور خدمت گاروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی پروان چڑھی۔ اردو نہ تو مسلمانوں کی زبان ہے، نہ ہندوؤں کی، نہ سکھوں کی بولی ہے اور نہ عیسائیوں کی۔ مذاہب کی قید سے آزاد یہ ہر اس شخص کی زبان ہے، جس نے اس کی حلاوت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا، اسے اپنایا، اپنے سینے سے لگایا اور اسے پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے ہر طرح کا تعاون دیا۔ اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والے لوگوں کی فہرست میں ایک نام پروفیسر گیان چند جین کا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کا شمار اردو کی ان نامور ادبی شخصیات میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی زبان و ادب کے لیے وقف کر دی۔ گیان چند جین پروفیسر ہونے کے علاوہ ہر دل عزیز شاعر، معروف ادیب، نقاد، ممتاز محقق، ماہر علم عروض اور صاحب لسانیات کے طور پر اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی گراں قدر تصانیف اور تحقیقی مقالات سے اردو زبان کو تونگری اور ثروت مندی بخشی۔

پروفیسر گیان چند جین کا تعلق اتر پردیش کے ضلع بجنور سے ہے۔ اپنی ادبی شناخت کے لیے مشہور ضلع نے جہاں ہندی ادب کو سمپادکاچاریہ پنڈت رودر دت شرما اور 'بہاری ست سئی' کے تقابلی تجزیہ نگار کی شکل میں اپنی خاص پہچان رکھنے والے پنڈت پدم سنگھ شرما دیے، تو اردو ادب کو عبدالرحمٰن بجنوری اور پروفیسر گیان چند جین جیسے ادیب بھی دیے۔ پنڈت رودر دت شرما کا جنم شہر دھام پور میں اور پنڈت پدم سنگھ شرما کی پیدائش چاند پور کے قریبی گاؤں نائک نگلہ میں ہوئی، جبکہ عبدالرحمٰن بجنوری اور پروفیسر گیان چند جین کی جائے پیدائش قصبہ سیوہارہ ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور گیان چند جین کی شہرت نہ صرف ہندو پاک میں رہی، بلکہ یہ ان تمام ممالک میں بھی جانے پہچانے گئے، جہاں اردو سمجھنے، بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے افراد موجود ہیں۔

گیان چند جین کی تاریخ پیدائش 19 ستمبر 1923 ہے۔ ان کے والد کا نام شاہو بحال چند جین اور والدہ کا نام پاروتی ہے۔ والدہ کا تعلق سناتن خاندان سے تھا۔ گیان چند جین اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ انھیں چھ برس کی عمر میں (1929) ابتدائی تعلیم کے لیے قصبے کے گورنمنٹ لوور اسکول میں داخل کرایا گیا، جہاں سے مئی 1933 میں درجہ چار پاس کیا۔ اس کے بعد قریب آٹھ مہینے تک ایک پرائیویٹ اسکول میں انگریزی سیکھی۔ 1934 میں قصبے کے ہی مسلم قدرت اسکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ لیا اور 1937 میں درجہ آٹھ پاس کیا۔ مڈل کلاس کے بعد پارکر ہائی اسکول مرادآباد میں نویں کلاس میں داخل ہوئے اور 1939 میں اردو اور ریاضی میں امتیازی نمبروں کے ساتھ فرسٹ ڈویژن سے ہائی اسکول پاس کیا۔ آگے کی تعلیم کے لیے شہر کے دوسرے کالج میں داخلہ لیا اور 1941 میں سیکنڈ ڈویژن سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد گیان چند جین اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے اور 1943 میں سیکنڈ ڈویژن سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ 1945 میں اردو مضمون سے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے پاس کیا۔ اسی کے ساتھ داستانوں میں ان کی دلچسپی بڑھی اور انھوں نے الہ آباد سے ہی ڈی فل میں کامیابی حاصل کی۔ ڈی فل مقالے کا موضوع 'شمالی ہند میں اردو کے نثری قصے ابتدا سے 1870 تک' تھا، جو انھوں نے پروفیسر ضامن علی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ اس وقت ڈی فل آج کی پی ایچ ڈی کے مساوی تھا۔

یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گیان چند جین تین سال تک روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہے، لیکن کامیابی نہیں ملی۔

آخر کار انھوں نے 1950 میں روزنامہ پائنیر (Pioneer) لکھنؤ میں بغیر کسی تنخواہ کے سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ گیان چند جین ادارت کے کام سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی نگاہ کہیں اور تھی۔ وہ درس و تدریس کے کام کو انجام دینا چاہتے تھے۔ بالآخر گیان چند جین کی مراد بر آئی اور وہ 1950 میں حمیدیہ ڈگری کالج بھوپال میں اردو کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ وہ 1952 میں حمیدیہ ڈگری کالج کے شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے۔ 1953 میں سہارنپور کی ارملا کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔ ارملا کا تعلق سناتن خاندان سے تھا۔ انھوں نے تحریری کام جاری رکھتے ہوئے آگرہ یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا اور پھر 1956 میں آگرہ یونیورسٹی میں ڈی لٹ میں داخلہ لیا۔ 1960 میں آگرہ یونیورسٹی کے ذریعے انھیں 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' کے موضوع پر ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ انھوں نے ساگر یونیورسٹی سے لسانیات میں بھی درس لیا اور 1962 میں کرناٹک یونیورسٹی بھارواڑ میں شامل ہو کر ایڈوانس لسانیات کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ اس کے بعد 1965 میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر کے طور پر تقرری ہوئی اور 1976 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اکتوبر 1976 میں ہی الہ آباد آ گئے اور الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر کے طور پر کام کرنے لگے۔ 1979 میں ان کی تقرری حیدرآباد یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر ہو گئی۔ وہ 1987 تک اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ریٹائر ہونے کے باوجود انھیں مزید دو برس سے زائد مدت تک ملازم رکھا گیا۔ 1989 کے وسط میں سبک دوش ہوئے۔ 1982 میں کتاب 'ذکر و فکر' کے لیے اردو زبان کے ساہتیہ اکادمی انعام اور 2002 میں بھارت سرکار کے ذریعے ان کی ادبی خدمات کے لیے پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں ان کی صحت ٹھیک نہیں رہی۔ یادداشت کمزور ہونے کے ساتھ انھیں پارکنسن مرض ہو گیا۔ بیماری سے نبرد

آزما گیان چندجین کا 11 اگست 2007 کو امریکہ کے کیلی فورنیا میں انتقال ہوگیا۔

پروفیسر گیان چندجین کے دادا فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے بڑے بھائی پرکاش مونس کا شمار بھی اردو کے مشہور ادبا میں ہوتا تھا۔ ان کی کتاب 'اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر' ادبی دنیا میں کافی مشہور ہوئی۔ اردو ادب کی اسی کڑی میں گیان چندجین کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا۔ 1937 کے آخر میں اپنا تخلص غافل رکھا اور پہلی غزل کہی۔ شاعری کے شوق نے انھیں مزید غزلیں کہنے پر مجبور کیا۔ ان کی کئی غزلیں کافی سراہی گئیں۔ چند اشعار دیکھیں۔

کوئی نہ اس کا مال خریدے کوئی نہ اس کی جانب دیکھے
اب بنجارہ گھوم رہا ہے قریہ قریہ تنہا تنہا
وہ محتسب ہو کہ شحنا کہ مفتی و قاضی
ہمارا کوئی نہیں ہے ہر ایک تیرا ہے
ابر پارہ ہوں کوئی دم میں چلا جاؤں گا
نقش بر آب ہوں لہروں میں سما جاؤں گا
فکر کی دنیا میں کولمبس بنا پھرتا ہوں میں
علم کی پہنائی کا کتنا بڑا فیضان ہے
جب بھی ریگستانوں میں جانے کا ہوتا اتفاق
گھٹنے گھٹنے ذات کی پرتوں میں دھنس جاتا ہوں میں

گیان چندجین نے نثری مضمون فانی بدایونی کی شاعری پر لکھا، جو پارکر کالج کی سالانہ میگزین 37-1936 میں شائع ہوا۔ یہاں سے ان کے لکھنے لکھانے کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ تحقیق کا فن کافی مشکل ہے۔ ابھی اردو میں تحقیق اور اس کے اصول و مسائل کے بارے میں بہت زیادہ نہیں لکھا گیا۔ اس کے باوجود گیان چندجین نے اس طرف توجہ دی اور اپنے کمال کا نمونہ پیش کرتے ہوئے ادبا کا دھیان اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی مایہ ناز تصنیف 'تحقیق کا فن' سے ان کی تنقید و تحقیق کی مہارت کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کو تحقیق کے موضوع، خاکہ، مواد کی فراہمی، زبان و بیان، مواد کی پرکھ، حزم و احتیاط، اور مقالے کی تسوید جیسے اہم موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ وہ مواد کی فراہمی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''کتابیں ہوں کہ مخطوطات، اردو میں انھیں تلاش کرکے فراہم کرنا ہی سب سے بڑی ریسرچ ہے۔ علم کے ہر پیاسے کو کنواں کھودنا ہی پڑا ہے یا پرانے کنوؤں میں بانس ڈالنے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے بڑی بڑی لائبریریوں ہی میں جاکر تلاش کی جاسکتی ہے۔ لیکن بعض اوقات چھوٹی لائبریریاں بھی کچھ پرانی کتابیں اور مخطوطات اپنے دامن میں چھپائے ہوتی ہیں۔ دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور بمبئی میں پرانی کتابوں کے تاجروں کے ذخیرے میں تلاش کیجیے۔ ہوسکتا ہے ان کے پاس آپ کی موجودہ ضرورت کی کتاب نہ ملے، لیکن کوئی دوسری نادر کتاب مل جائے گی۔''

(تحقیق کا فن گیان چندجین اترپردیش اردو اکادمی، 1990 ص نمبر 57-156)

گیان چندجین نے جس صنف کو اختیار کیا، اس میں اپنی الگ پہچان بنائی اور اسے اس مقام تک لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی جس کی وہ مستحق تھی۔ اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والے گیان چندجین نے اردو کی تاریخ پر تفصیل سے گفتگو کی اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا بھرپور جائزہ لیا۔ انھوں نے اردو کے ادبی سفر کا جس ایمانداری کے ساتھ تذکرہ کیا، اس سے گزشتہ صدیوں میں پروان چڑھی ادب کی تاریخ نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ انھوں نے اردو تحقیق پر جو کام کیا ہے، وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کا تحقیقی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ گیان چندجین کی کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحقیقی بصیرت نہایت تیز اور علمی شعور کافی پختہ تھا۔ ان کے علمی اور تحقیقی کام کے علاوہ اردو کی ادبی تاریخیں کو بھی انجمن ترقی اردو پاکستان نے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ شائع کیا۔ گیان چندجین کی کتابوں کو پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہونا بڑے فخر کی بات اور ایک بڑا کارنامہ ہے۔ وہ مرزا غالب کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوجاتا ہے کہ انھوں نے غالب پر کام کرتے ہوئے کئی کتابیں لکھیں۔

گیان چندجین نے ادبی اصناف، عام لسانیات، شخصیات و تاثرات، اردو کی نثریات، اردو کی نثری داستانیں، اردو مثنوی شمالی ہند میں، تحریریں، کچے بول، غالب شناس مالک رام، حقائق، کھوج، پرکھ اور پہچان، لسانی مطالعے، مقدمے اور تبصرے، اوپیندر ناتھ اشک، ابتدائی کلام اقبال، تفسیر غالب، قاضی عبدالودود، رموز غالب، تغیر غالب، تجزیے، ذکر و فکر، تحقیق کا فن، لسانی رشتے، اردو کا اپنا عروض، اردو کی ادبی تاریخیں، اردو میں داستانوی ادب کا سرمایہ، تاریخ ادب اردو اور ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب سمیت درجنوں کتابیں تحریر کی ہیں۔ پروفیسر گیان چندجین کی کتابیں ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور کئی دیگر ممالک کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں کئی اسکالروں نے ان کے اوپر پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔

'جب چند تخلیقیں وجود میں آجاتی ہیں تو انھیں دیکھ پرکھ کر اقداری پیمانے اور راہ نما اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب فن کار مزید تخلیقات کرتے ہیں تو نقادوں کے وضع کردہ پیمانوں کو مدنظر رکھ کر اپنی تخلیق میں مزید ترقی و بہتری کا عمل کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ نقادوں کے مقرر کردہ معیاروں کی سو فیصدی پابندی کرے، وہ ان سے آگے بڑھ کر نئے تجربے کرتا ہے، نئے پیمانے دیتا ہے۔ اس پورے عمل میں تخلیق کار بھی نقاد بن جاتا ہے، لیکن اس کی تنقید اور نقاد کی تنقید میں یہ فرق ہے کہ تخلیق کار کی تنقید اس کے ذہن میں نہفتہ رہتی ہے، جب کہ نقاد کے پیمانے منظر عام پر آتے ہیں اور اس طرح بعد کے تخلیق کار اور قاری دونوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔''

(تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بہ اشتراک اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 2008 ص 32)

گیان چندجین کا نام ان ادبا و شعرا میں شامل ہے جنھوں نے ادب کو اپنا میدان بنایا اور لگاتار لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھا۔ بغیر کسی تھکاوٹ کے لگاتار کام کرنے والے جین صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ مختلف موضوعات پر بڑی تیزی کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے اس وصف سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت اردو کی خدمت اور اس کی نشو و نما میں لگا۔ معاشرے کے ہر ذمے دار شخص کی طرح جین صاحب کو بھی گھریلو ذمے داریوں اور ہنگامہ آرائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود وہ ادبی خدمات سے برگشتہ نہیں ہوئے اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام کو انجام دینے میں منہمک رہے۔ مختلف موضوعات پر اعلیٰ درجے کا کام ان کی وسیع النظری کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ لسانیات، داستان، مقالہ، غالب کے کلام کی شرح، عروض اور تحقیق وغیرہ پر جو قابل قدر کام کیا، وہ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

انھوں نے تحقیق کی دنیا میں جو مقام حاصل کیا وہ ہر کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ لگتا ہے قدرت نے اس خاص کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ داستان پر کام کرنے والے کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان کی کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' کو نظرانداز کرسکے، جس نے دیگر تحقیق کاروں کے لیے مزید راہیں استوار کیں۔

قریب 40 برس تک اردو میں درس و تدریس کا کام انجام دینے، اردو کی بدولت عالمی شہرت حاصل کرنے، اردو میں تنقید و نثری داستانوں کو عروج پر لے جاتے ہوئے خود بھی شہرت کا سفر طے کرنے والے پروفیسر گیان چندجین نے 'ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب' نام کی کتاب لکھی جو کافی متنازعہ رہی اور اس کے خلاف کئی کتابیاں بھی لکھی گئیں۔

■

M. A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Masjid
NEENDRU, Tehsil Dhampur
District: Bijnor- 246761 (UP)
Cell:991767622, 96757676722
E-mail : jafrikanwal785@gmail.com

محمد اکمل شاداب

مخطوطہ شناس
محی الدین قادری زور

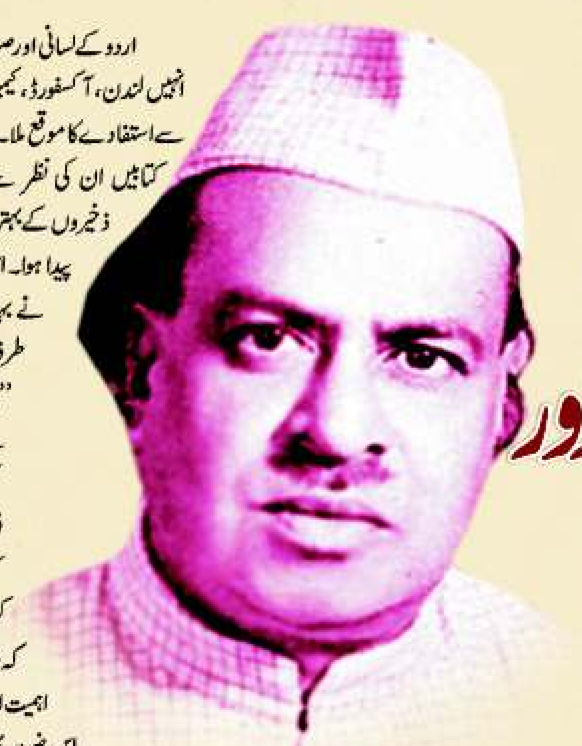

محی الدین قادری زور(25 دسمبر 1905 - ستمبر 1962) ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے تحقیق جیسے خشک موضوع پر اہم ادبی سرمایہ پیش کیا ہے، ان کا تعلق حیدرآباد سے تھا، یہیں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے بعد 1928 میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قادری زور نے دوران تعلیم تصنیف وتالیف کا کام شروع کردیا تھا۔ قادری زور پوری زندگی اردو کی بقا، اس کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ قادری زور نے دکن کی علمی و ادبی خدمات پر خوب لکھا۔ انھوں نے قدیم دکنی ادب کے شہ پاروں کی بازیافت کی، کئی اہم اور قدیم مخطوطات مرتب کرکے بہترین مخطوطہ شناس ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ 'ادارۂ ادبیات اردو' کی تشکیل ہے۔ قادری زور کی تصانیف کی تعداد لگ بھگ پچاس اور مضامین کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ انھوں نے تنقید و تحقیق اور انشا و افسانے، صوتیات و لسانیات اور تذکرہ نگاری و تاریخ نویسی پر خوب لکھا ہے۔ تحقیق ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ قادری زور کی علمی و ادبی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے نام ایک پیام میں تحریر کرتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب اردو کے ایک بہت بڑے محقق ہیں اور تحقیقات و تنقید میں ان کا مقام نہایت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اردو ادب کے لیے ان کے کارنامے مثالی ہیں اور دکن میں اردو کا پرچم لہرا رہے ہیں۔ ابتدائی دکنی اردو ادب میں ان کی تحقیقات بڑی عظمت کی حامل ہیں۔ انھوں نے ایسے جواہر پارے تلاش کیے ہیں جنھوں نے اردو کو مالا مال کیا ہے اور ان کے عالمانہ مقدمات اور تنقیدیں گراں بہا ہیں... ڈاکٹر زور صاحب بہ حیثیت ایک استاد، ایک محقق اور ایک نقاد کے بڑا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جو ادب و تحقیق کے لیے وقف ہو چکی ہے۔''

(ڈاکٹر زور کی زندگی، سیرت، علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات کا جائزہ، ص 30)

محی الدین قادری کی کتاب 'اردو شہ پارے' کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب کے شروع میں چار ابواب پر مشتمل ایک طویل مقدمہ لکھا ہے اور اس مقدمے سے متعلق تمہید لکھ کر چند باتوں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''اس میں جو شہ پارے پیش کیے گئے ہیں ان کی تخلیق کس زمانے میں، کن ہاتھوں سے، کس ماحول میں اور کس طریقہ پر عمل میں آئی، اس سلسلے میں بعض ایسے مصنفین کا بھی ذکر کردینا پڑا جن کا کلام موجود نہیں ہے یا جن کے انتخابات اس میں درج نہیں۔ بعض جگہ معلومات کی کمی کی بنا پر نہایت اختصار سے کام لینا پڑا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اگر زیادہ کد و کاوش اور تحقیق و تفتیش کی جاتی تو کئی جگہوں پر اضافہ کرنا پڑتا۔ لیکن اس کتاب کی بساط کے مدنظر اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ تاہم شاعروں اور کتابوں کے متعلق جو کچھ حالات لکھے گئے ہیں۔ وہ (سوائے چند معمولی اور غیر معروف چیزوں کو چھوڑ کر) راقم کی ذاتی تحقیق و تفتیش اور اصل ماخذوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔''

(اردو شہ پارے، جلد اول، تمہید)

اردو کے لسانی اور صوتی پہلوؤں پر کام کے دوران انھیں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس کے کتب خانوں سے استفادے کا موقع ملا۔ اس دوران قدیم اردو ادب کی کتابیں ان کی نظر سے گزریں۔ یہیں سے ادبی ذخیروں کے بہترین حصوں کے انتخاب کا خیال پیدا ہوا۔ اس انتخاب کے دوران انھوں نے بہت محنت و مشقت کی، جس کی طرف خود اشارہ کیا ہے:

''جب ایک ایک قلمی نسخہ کو شروع سے آخر تک کئی کئی دفعہ پڑھنے کی ضرورت ہونے لگی اور قدامت زبان کی پیچیدگیوں اور کتابت کی غلطیوں نے پریشان کردیا تو بار بار طبیعت چاہتی تھی کہ خیال ترک کردوں لیکن کام کی اہمیت اور ادبی ذوق نے گوارا نہ کیا کہ اس ضروری علمی خدمت سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔'' (اردو شہ پارے، جلد اول، ص 1)

اردو شہ پارے کے مقدمہ کے پہلے باب میں اردو ادب کی ابتدائی کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں بیجاپور میں اردو ادب پر اور تیسرے باب میں گولکنڈا میں اردو ادب پر روشنی ڈالی گئی جب کہ چوتھا باب مغلوں کی حکومت میں اردو کے شعرا و ادبا سے متعلق ہے۔ مضامین اور مصنفین کے لحاظ سے شہ پاروں کی فہرست کے بعد دکن کے مشہور و معروف شاعروں اور نثر نگاروں کا انتخاب کلام ہے۔ کتاب کے آخر میں مقدمے کے آٹھ ضمیمے ہیں پہلے ضمیمے میں قدیم اردو مصنفین اور ان کے کارناموں کی تاریخ وار فہرست ہے۔ دوسرا ضمیمہ پہلے باب کی علمیات سے متعلق ہے۔ تیسرے ضمیمے میں بیجاپوری مصنفین اور ان کے کارناموں کی تفصیلی فہرست ہے۔ چوتھا ضمیمہ دوسرے باب کی علمیات کے لیے ہے۔ گولکنڈا کے مصنفین اور ان کے کارناموں کی بالتفصیل فہرست پانچویں ضمیمے میں پیش کی گئی ہے اور چھٹے ضمیمے میں تیسرے باب کی علمیات ہے۔ ساتواں ضمیمہ چوتھے باب یعنی مغلوں کی حکومت کے مصنفین اور ان کے کارناموں کے لیے وقف ہے جب کہ آٹھواں ضمیمہ بھی اسی باب سے متعلق ہے، اس میں بیاض کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اور ان کے مرثیوں کی تعداد ہے۔ ان کے بعد اردو ادب سے متعلقہ سنین میں صرف اس دور کی

تاریخیں پیش کی گئی ہیں۔ جن کا اردو شہ پاروں کی اس جلد سے تعلق ہے۔ انھوں نے کتاب کے آخر میں اشاریے سے قبل ایک فرہنگ بھی شامل کی ہے، جس میں مشکل، نامعلوم اور مشتبہ الفاظ کے معنی بیان کیے گئے اور ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ کتاب قادری زور کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ قادری زور کے یہاں عجلت پائی جاتی ہے۔ اسی عجلت کی وجہ سے قادری زور کی مرتب کردہ کتاب اردو شہ پارے جلد اول میں کئی خامیاں بھی درآئی ہیں، جن کی طرف مولوی عبدالحق نے ایک تنقیدی مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ یہ کتاب قادری زور کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں اردو نظم و نثر کے متعلق جدید ترین تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔ اردو شہ پارے دراصل ادبی تاریخ کی کتاب ہے۔

'فیض سخن' میں حیدرآباد کے ایک شاعر میر شمس الدین محمد فیض کے کلام کا انتخاب ہے۔ فیض شعروشاعری کے علاوہ تصنیف و تالیف بھی کرتے تھے اور انھیں ادبی دنیا میں بحیثیت مصنف ومؤلف زیادہ شہرت ملی۔ میر شمس الدین محمد فیض کے کلام کا انتخاب محی الدین قادری زور نے بڑی محنت سے کیا ہے۔ فیض سخن میں انھوں نے سب سے پہلے دیباچہ عموی دکن کی اردو شاعری کے حوالے سے لکھا، قادری زور نے دکن کی اردو شعروشاعری کی تاریخ کے سات عہد اور ادوار قرار دیے ہیں اور ہر ایک پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ عموی دیباچے کے بعد انھوں نے فیض اور ان کی شاعری پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔

قادری زور نے خالق باری کے طرز پر فیض کی تصنیف رسالہ فیض جاری کے علاوہ خزانۃ الامثال، شمس التصریف، شمس النحو، رسالہ در بیان ناسخ ومنسوخ، طریق الفیض، شرح مأة عامل، شرح کلمۃ الحق اور متن میر شمس الدین اور شرح میر شمس الدین وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے تمام غزلوں کو بالترتیب جمع کیا ہے پھر ان کی رباعیوں اور دیگر اصناف پر مشتمل اشعار کو یکجا کرنے کے بعد ان کے نعتیہ قصائد کے انتخاب اور رسالہ فیض جاری کے انتخاب کو پیش کیا ہے۔

قادری زور نے 'روح غالب' میں غالب کی حیات سے متعلق ہر پہلو اور ان کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ غالب کی تمام کتابوں پر تحقیقی اور تنقیدی گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں مولوی سید مہدی حسین بلگرامی کا پیش لفظ ہے، جس میں قادری زور کی کتاب روح غالب کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سید مہدی حسین بلگرامی لکھتے ہیں:

''مجھ کو یقین ہے کہ اردو ادب کے قدردان اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ اس میں انھوں نے غالب کے متعلق جو کتابیں پیشتر شائع ہوئی ہیں اور ان کے دیوان کی جو شرحیں لکھی گئی ہیں، ان کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور اسی طرح مختصر الفاظ میں ان کی سوانح عمری بھی درج کی ہے۔ نیز ان کی مختلف تصانیف پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب میں غالب کے مشہور رقعات کا انتخاب درج کیا ہے'' (روح غالب، ص5)

روح غالب کے دیباچے میں قادری زور نے روح غالب کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے۔ روح غالب کا پہلا حصہ غالب کے متعلق ادب ہے۔ دوسرا حصہ حیات غالب پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ غالب کے ادبی کارناموں میں ان کی فارسی اور اردو نثر و نظم کو بہت تفصیل سے لکھا اور غالب کے ادبی کارناموں پر انتہائی بصیرت افروز اور محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں غالب کی تصانیف پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، درفش کاویانی پر محققانہ تبصرے کے ساتھ بھرپور معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کا چوتھا حصہ غالب کے اعزہ و احباب کے بارے میں ہے۔ جب کہ پانچواں خطوط غالب کے دلچسپ ادبی حصے پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں غالب کے 225 اہم خطوط کے اقتباسات شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے دکن کے نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے کلام کا انتخاب 'متاع سخن' کے نام سے کیا ہے۔ عزیز کوئی پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ ان کے اندر فطری مناسبت اور بزرگوں کی صحبت کی وجہ سے شعروشاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ عزیز کا تعلق حیدرآباد سے تھا مگر وہ اپنی شاعری میں دہلی کی زبان کا سختی سے التزام کرتے تھے۔ متاع سخن کے مقدمے میں قادری زور نے دکن کی اردو شاعری پر مفصل گفتگو کی ہے، زور نے دکن کی اردو شاعری کو تاریخ کے اعتبار سے کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے، مقدمہ کے بعد عزیز کی ایک تصویر ہے، اس کے بعد عزیز اور ان کی شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، انتخاب میں اشعار کو باعتبار ردیف پیش کیا ہے۔ غزلوں کے بعد دس رباعیاں بھی شامل کتاب ہیں۔ متاع سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی رقمطراز ہیں:

''یہ جناب عزیز کا انتخاب کلام ہے مگر نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ۔ ان کا شاعرانہ ذوق دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوق مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں چٹکی لی تھی اور انیس مرحوم کس لیے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ اگر میرے سامنے جناب عزیز کی صرف شاعری ہوتی اور ان کے احوال سے بے خبر ہوتا تو میں بلا مبالغہ یہ سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد ان کی بعض خصوصیات سے علیحدہ ہو کر مرزا داغ کی زبان بول رہا ہے۔ زبان میں ان کی لغزش نہیں۔ بیان میں ان کا زور، بندش ان کی چست، غرض کہ شاعری کے لیے جس کیفیت کی ضرورت ہے وہ ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور کا احسان ماننا چاہیے کہ انھوں نے دکن کے تین قابل قدر شعرا کے کلام سے ہمیں روشناس کرایا''

(ماہنامہ ساقی دہلی، ج15، شمارہ3 فروری 1937)

سدانند جوگی بہاری لال رمز شعرائے حیدرآباد میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، رمز نے میر شمس الدین محمد فیض کی شاگردی اختیار کی۔ قادری زور نے رمز سخن (منتخب کلام) میں دکن کی اردو شاعری پر مفصل اور مدلل گفتگو کے بعد رمز کے حالات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے اسی حصے میں قادری زور نے کلیات رمز پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، جس میں سات ہزار سے بھی زیادہ اشعار ہیں۔ اس کلیات میں رمز کی غزلیات اردو، رباعیات اردو، خمسہ جات اردو، قطعات اردو، قصائد اردو، تاریخیں، تہنیت وتعزیت ادبیات ومصرعہ جات وغیرہ، رباعیات فارسی، قطعات فارسی، قصائد فارسی، خمسہ ہائے فارسی اور کلام ہندی بھاشا کے اشعار شامل ہیں۔ فیض کی صحبتوں کی وجہ سے رمز کے اندر شعروشاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ رمز کی شاعری کے بارے میں قادری زور لکھتے ہیں:

''رمز کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں شعروسخن کا فطری ذوق تھا۔ اور یہ ذوق نتیجہ تھا حضرت فیض اور ان کے تلامذہ کی صحبت اور میل جول کا، اگرچہ وہ ابتداء دنیاوی کاروبار اور ملازمت اور فن طب کے شوق میں شعروشاعری سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ لیکن چالیس سال بعد جب پھر اس کی طرف راغب ہوئے تو ان میں از سر نو شاعرانہ قوتیں عود کر آئیں۔'' (رمز سخن، ص27)

مرتب رمز سخن قادری زور نے حروف تہجی کے اعتبار سے ردیف ت سے ردیف ے تک کی غزلیں پیش کی ہیں پھر تیس رباعیات کے بعد دو قصیدے مدح حضور پرنور اور مدح مہاراجہ سرکشن پرشاد ہیں۔ رمز سخن کے آخر میں چار نظمیں بھی ہیں۔

محقق و مخطوطہ شناس محی الدین قادری زور ان کی تمام تر کد و کاوش اور تلاش و جستجو کا مرکز و محور دکن تھا۔ مخطوطہ شناسی سے انھیں خاص شغف تھا۔ فن مخطوطہ شناسی تحقیقی نگاہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے تذکرہ اردو مخطوطات کی پانچ جلدیں مرتب کیں۔ انھوں نے صرف

مخطوطات کی فہرست سازی نہیں کی بلکہ ہر مخطوطے کی توضیحات پر خصوصی توجہ دی۔ بلکہ مصنفین کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کیں۔ انھوں نے توضیحات وتشریحات کے ذریعے مخطوطے کے تعلق سے دستیاب تمام مواد اور متن کو ان فہرستوں میں شامل کردیا ہے۔ انھوں نے اردو، عربی، فارسی اور ہندی کے 1150 مخطوطات کی وضاحت پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قادری زور لکھتے ہیں:

''ادارے کے جملہ 1150 مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (پانچ جلدوں میں) منظر عام پر آرہی ہیں۔ ابھی تقریباً چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں، جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اور اس تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔'' (تذکرہ مخطوطات، ج،5، ص5)

ان مخطوطات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری اپنے ایک مضمون 'زور صاحب کی تصانیف کا تعارف' میں لکھتے ہیں:

''پانچوں جلدوں میں مجموعی طور پر 1150 مخطوطات کی وضاحتی فہرست ہے۔ لیکن ان میں چند جلدیں ایسی بھی ہیں جن میں ایک سے زائد کتابیں شامل ہیں۔ لہٰذا 1150 جلدوں میں مجموعی طور پر 1246 مخطوطات ہوجاتے ہیں۔ ان میں 760 اردو کے، 421 فارسی کے، 52 عربی کے اور 13 ہندی کے مخطوطات ہیں۔ ان تمام مخطوطات کو موضوع کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو میں کس موضوع پر کتنے اور کون کون سے مخطوطات ہیں، آخر میں مصنفین، ان کے مصنفات، رسائل اور اماکن وغیرہ کا اشاریہ بھی شامل کردیا گیا ہے اور ان تمام اندراجات کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔''

(محی الدین قادری زور، ص 187)

ڈاکٹر قادری زور ایک باشعور مخطوطہ شناس اور محققانہ ذہن کے مالک تھے۔ مخطوطوں کی فہرست سازی انھوں نے انگریزی کیٹلاگنگ سے سیکھی۔ مخطوطات کی فہرست سازی اور مخطوطہ شناسی کے دوران ضعیف متن اور مشکوک حوالوں کی مدد نہیں لی جاتی ہے، کیونکہ مخطوطہ شناسی کی ہلکی سی لغزش سے مستقبل کا محقق بے شمار قلابازیاں کھا سکتا ہے۔ انھوں نے اس کام میں قیاس آرائی نہیں کی۔ وہ پوری محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں۔ کوئی بھی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے ان مخطوطات کی وضاحتی فہرست کے لیے بہت محنت کی اور طرح طرح کی صعوبتیں اٹھائیں۔ خود ہی لکھتے ہیں:

''اس تذکرۂ مخطوطات کی ترتیب کے سلسلے میں مؤلف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ وہی اصحاب کرسکتے ہیں جنھیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہوا ہو۔ اکثر مخطوطوں کے مصنفوں کے نام، سنہ یا زمانۂ تصنیف اور زمانۂ کتابت وغیرہ کی تحقیق میں بیسیوں قلمی ومطبوعہ کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی اور بڑا وقت صرف ہوا۔'' (تذکرہ مخطوطات، ج1، ص13)

اردو مخطوطات کی فہرست سازی محی الدین قادری زور کے علاوہ کئی لوگوں نے کی ہے جن میں عبدالقادری سروری، محمد ابرار حسین اور نصیر الدین ہاشمی کے نام بہت ہی اہم ہیں۔ ان لوگوں نے مخطوطات کی توضیحات اور تحقیقی وضاحتوں کا مواد اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، جس سے محقق کما حقہ استفادہ نہیں کرسکتا ہے جبکہ قادری زور کا تذکرہ مخطوطات کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

''اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوسری جلدوں کی طرح اس پانچویں جلد میں بھی مخطوطوں کی خصوصیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مصنفوں اور شاعروں کے حالات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں صرف حوالوں اور ماخذوں کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے۔ تاکہ تحقیق کرنے والے اصحاب کتابوں تک پہنچ جائیں۔ ان جلدوں کی ترتیب کا بڑا مقصد یہی ہے کہ ادارے میں جو مخطوطے محفوظ ہیں ان کی نسبت اہل ذوق اصحاب اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو علم ہوجائے کہ ادارے میں کیا کیا کتابیں موجود ہیں۔'' (تذکرہ مخطوطات، ج،5، ص605)

انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے بینر تلے کئی اہم شاعروں اور نثر نگاروں کے انتخابات شائع کیے ہیں۔ داغ، حالی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کے ہم عصر ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کے انتخاب کو بادۂ سخن کے نام سے شائع کیا۔ کلیات قلی قطب شاہ اور معانی سخن میں قطب شاہ کا کلام ہے۔ کلیات قلی قطب شاہ میں محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات اور اس عہد کے سیاسی وسماجی حالات پر مشتمل ایک طویل اور تحقیقی مقدمہ شامل ہے۔ کلیات کے آخر میں قطب شاہ کے کلام کو سمجھنے کے لیے قدیم، نامانوس اور مشکل الفاظ کی فہرست پیش کی ہے اور معانی سخن میں ابتدا میں دکن کی اردو شاعری کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ایک تحقیقی مقدمہ پیش کیا ہے۔ خطوط کے مجموعوں مکاتیب شاد عظیم آبادی اور شاد اقبال کو ترتیب دیا۔ تذکروں میں مرقع سخن (دو جلدیں) اور گلزار ابراہیم کی ترتیب وتدوین بہت ہی اہم ہیں۔ مرقع سخن جلد اول میں ہندوستان کے پچیس اور جلد دوم میں آصفیہ دور کے پچاس ممتاز شعرا کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قادری زور نے گلزار ابراہیم کی ترتیب میں یہ التزام بالخصوص رکھا کہ گلشن ہند میں جن شعرا کا حال تھا اس کو اردو میں علی لطف ہی کے الفاظ میں لکھا ہے۔ تذکرہ گلشن ہند میں گلزار ابراہیم سے 68 شاعروں کا حال منتخب کرکے اردو میں لکھا ہے۔ گلزار ابراہیم میں 68 شاعروں کے حالات اردو میں اور 252 شاعروں کے حالات فارسی عبارت میں ہیں۔ قادری زور نے علی لطف کی گلشن ہند اور علی ابراہیم کی گلزار ابراہیم میں بیانوں کے اختلافات کی نوعیت پر اپنے مقدمہ میں بہت مفصل اور جامع بحث کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو مزید مفید بنانے کے لیے کتاب کے آخر میں ایک اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔

مراجع ومصادر

1 محی الدین قادری زور، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، 1989
2 زور: ہندوستانی ادب کے معمار، پروفیسر سیدہ جعفر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1984
3 مطالعہ زور، ڈاکٹر اکبر حیدری، الماس بک ڈپو، حسین گنج لکھنؤ، 1966
4 اردو شہ پارے، جلد اول، محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، 1929
5 تنقیدات عبدالحق، مرتبہ تراب علی خاں، ایم۔ عطاء اینڈ مسلم پروپرائٹر، موہن لال روڈ، لاہور، بار چہارم 1945
6 فیض سخن، مرتبہ محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، 1937
7 روح غالب، مرتبہ محی الدین قادری زور، افضل برقی پریس، حیدرآباد، دکن، 1950
8 متاع سخن، مرتبہ محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، 1935
9 ماہنامہ ساقی دہلی، ج 15، شمارہ 3 فروری 1937
10 رمز سخن، مرتبہ محی الدین قادری زور، اداراہ ادبیات اردو، حیدرآباد، 1951
11 تذکرہ مخطوطات، ج۔1، مرتبہ محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، 1943
12 تذکرہ مخطوطات، ج5، مرتبہ محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، 1959
13 شاد اقبال، مرتبہ محی الدین قادری زور، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، 1942
14 کلیات قلی قطب شاہ، مرتبہ محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، 1940
15 کیف سخن، مرتبہ محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد، 1935
16 معانی سخن، مرتبہ محی الدین قادری زور، نیشنل پرنٹنگ پریس، حیدرآباد 1958

■

Dr. Mohd Akmal
Asst Prof. Dept of Urdu
Khwaja Moinuddin Chishti
Language University
Lucknow- 226013 (UP)

ندیم احمد انصاری

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی حیات و ادبی خدمات

خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری اردو کے ممتاز، قادرالکلام اور پرگو شاعر اور سوانح نگار ہیں، لیکن اردو زبان و ادب میں انھیں فراموش کر دیا گیا۔ موصوف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ تھے۔ مقامِ معرفت اپنے بافیض شیخ کے فیض سے حاصل کیا اور ان کی مبسوط سوانح بھی قلم بند کی۔ خواجہ صاحب کی تربیت خالص دینی اور مشرقی طرز پر ہوئی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی۔ سات برس ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے، پھر اپنا تبادلہ تنخواہ کی کمی کے ساتھ محکمۂ تعلیم میں کرالیا۔ پہلے مکاتب اسلامیہ کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے، پھر انگریزی اسکولوں کے انسپکٹر آف اسکولس (یوپی) مقرر ہوئے اور پنشن پاکر سبک دوش ہوئے۔ سرکاری افسر ہونے کے باوجود اذکار و اشغال کے پابند اور 'خان صاحب' اور 'خان بہادر' کے القاب سے ملقب تھے۔ انھوں نے شاعری کو کبھی مشغلہ نہیں بنایا، بعض موقعوں پر اپنے شیخ سے شاعری ترک کرنے کا مشورہ بھی کیا، لیکن انھوں نے شاعری کو چھوڑا اور نہ شاعری نے انھیں۔ خواجہ صاحب کی شاعری تصنع سے پاک اور فطری تھی۔

خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش 19 شعبان المعظم 1301ھ، مطابق 12 جون 1884 اور تاریخی نام 'مرغوب احمد' ہے۔ والد مرحوم اپنے کو شیخ لکھا کرتے تھے اور اکثر اہلِ برادری میں ناموں کے ساتھ بزرگوں کے زمانے سے 'شیخ' لفظ استعمال ہوتا رہا۔ والدہ صاحبہ قاضیوں کے خاندان کی تھیں۔[1]

خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ میرے اہلِ خاندان اپنے آپ کو خواجہ غوری اس لیے کہتے ہیں کہ ہمارے اجداد میں سے بہ عہدِ شاہ ہمایوں ایک صاحب الٰہ داد ابن خواجہ غوری تھے، جن کا کتبہ ہمارے قصبے کی مسجد میں بہ حیثیت بانی مسجد کے لگا ہوا ہے اور انھیں کے نام سے ہماری آبائی جائیداد 'تھوک الہ داد' کہلاتی ہے اور یہی نام اس جائیداد کا کاغذات دیہی میں بھی درج ہے، نیز جس محلّے میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ محلّہ بھی 'غوری پاڑہ' کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔[2]

اپنے قصبے کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کا قصبہ 'آصف آباد' عرف 'ندبئ' بھی - جو راجپوتانہ کی ریاست 'بھرت پور' میں واقع ہے۔ حسبِ اخبار و آثار سلطان شہاب الدین غوری فاتح ہندوستان کے زمانے سے آباد ہے۔ چنانچہ میں نے ایک ثقہ اہلِ وطن سے یہ روایت سنی تھی کہ جب سلطان شہاب الدین غوری نے راجپوتانہ کا یہ حصہ فتح کیا تو ان کے ہم راہی لشکری اور امرا اسی نواح میں بارہ مختلف مقامات پر آباد ہو گئے اور وہ بارہ بستیاں مسلمانوں کی اب تک موجود ہیں، جن میں سے ایک ہمارا قصبہ بھی ہے، جس میں مختلف قبیلوں کے مختلف محلّے ہیں۔ مثلاً غوری پاڑہ، قاضی پاڑہ، بھیم پاڑہ، سید پاڑہ وغیرہ۔[3]

مزید حالات بیان کرتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ احقر ابتداءً ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور ہوا تھا، پھر سات برس اس عہدے پر رہ کر نصف تنخواہ پر محکمۂ تعلیم میں اپنی خدمات خود درخواست کرکے منتقل کرالیں، کیونکہ وہاں فیصلے کرنے پڑتے تھے، لیکن النصیب یصیب۔ الحمد للہ اس محکمے میں بھی ببرکتِ دعائے حضرت والا (مولانا تھانوی) عہدۂ انسپکٹری ترقی پاچکا ہوں، جو محکمۂ

خواجہ صاحب کی تربیت خالص دینی اور مشرقی طرز پر ہوئی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی، سات برس ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے، پھر اپنا تبادلہ تنخواہ کی کمی کے ساتھ محکمۂ تعلیم میں کرالیا، پہلے مکاتب اسلامیہ کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے، پھر انگریزی اسکولوں کے انسپکٹر آف اسکولس (یوپی) مقرر ہوئے اور پنشن پاکر سبک دوش ہوئے۔

تعلیم میں ایک عہدۂ جلیلہ سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ مشاہرہ بھی بفضلہٖ تعالیٰ 660 روپے تک پہنچ چکا ہے اور تیس روپے سالانہ ترقی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ اپنے گدھوں کو بھی خشکہ دے رہا ہے۔[4] الحمدللہ حضرت والا کے فیضِ صحبت اور برکتِ تعلق کی یہ دولت ہمیشہ نہایت تدین اور محنتِ شاقہ کے ساتھ اپنا کارِ منصبی انجام دیا، اس لیے ازراہِ قدردانی گورنمنٹ نے حکام کی پرزور سفارشوں پر 'خاں صاحب' کا خطاب بھی بلا درخواست دے دیا ہے اور تاج پوشی کے موقع پر تمغہ بھی ملا ہے۔ گو یہ احقر ہرگز کسی قابل نہیں، لیکن محض حضرت والا کے تعلق کی برکت سے بفضلہٖ تعالیٰ دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے لوگ عموماً بہت عزت اور وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس سے مجھ کو نہایت خجالت ہوتی ہے۔[5]

خواجہ صاحب کو 19 جولائی 1944 کو امرتسر میں بخار اور سینے میں درد ہوا، اول تو یونانی پھر ڈاکٹری علاج شروع ہوا۔ نمونیہ تجویز ہوا، ضعف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خدا خدا کر کے کچھ افاقہ شروع ہوا۔ مولانا محمد حسن صاحب امرتسری نے حقِ تیمارداری ادا کر دیا۔ غرض مرض میں اور ضعف میں تخفیف ہوئی اور افاقۂ کلی نہ ہوا تھا کہ 5 اگست 1944 کو خواجہ صاحب نے وطن کی واپسی کا قصد فرمایا۔ مولانا محمد حسن صاحب نے اپنے بھتیجے مولوی محمد عرفان کو ہمراہ کر دیا کہ راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو، چنانچہ 8 اگست 1944 کو خواجہ صاحب اپنے وطن اورئی پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر کچھ راستے کی تکان، کچھ مرض کا بقیہ پہلے سے موجود تھا ہی، اورئی پہنچ کر بخار بھی عود کر آیا اور سینے کا درد بھی، وہاں بھی علاج ہوتا رہا۔ آخر 17 اگست 1944 کو صبح 9 بجے چہکتا ہوا بلبلِ چمنستانِ اشرفی اور خسروِ اشرفی اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر اپنے محبوب شیخ سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔[6]

شاعری

خواجہ صاحب نے تفننِ طبع کے لیے اپنے انداز کی شاعری کی، شاعری میں ان کا کوئی استاذ نہ تھا، البتہ ذوق سلامت اور فطرت سنجیدہ تھی، جس نے کلام میں چار چاند لگا دیے، ہر شخص اپنے مذاق و مزاج کے مطابق ان کے کلام سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ صوفیائے عارفین ان کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور شعرا و اصحابِ ذوقِ فنِ شعر کی باریکیوں کو سراہتے ہیں۔

خواجہ صاحب صاحبِ دیوان شاعر ہیں، پہلے حسن تخلص کرتے تھے، پھر مجذوب ہو گئے۔ حمد، مناجات، نعت، مرثیہ، غزل، نظم مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ کلام میں لطافت، متانت، روانی، معنی آفرینی، فکر و تخیل سبھی کچھ موجود ہے۔ حضرت تھانوی کے تقریباً دو سو خلفا ہوئے، سبھی مجذوب کا عارفانہ کلام درد و محبت کے ساتھ پڑھا سنا کرتے تھے۔ آج بھی مشائخِ سلوک کے یہاں عموماً اور سلسلۂ تھانوی میں خصوصاً مجذوب کا کلام انتہائی مقبول ہے۔

قدرِ مجذوب کی خاصانِ خدا سے پوچھو
شہرۂ عام تو اک قسم کی رسوائی ہے

بلکہ مولانا انعام الرحمٰن تھانوی کا بیان ہے:

آپ جس طرح علما اور مشائخ کے طبقے میں اپنے تدین و تقویٰ اور نیک نفسی کے لیے مشہور و متعارف ہیں، اسی طرح ہند و پاکستان کے شعر و ادب کے حلقوں میں بھی اپنی شاعرانہ معراجِ فکر کے باعث پورے طور پر معروف و روشناس ہیں۔ اربابِ علمِ سلوک اور اصحابِ شعر و ادب ان سے یکساں طور پر واقف ہیں اور وہ دونوں حلقوں میں مقبولیت و عقیدت مندی کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں... وہ بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر انسان کے لیے مجذوب ہونے کے باوجود جاذب تھے، ہر ہر مجمع میں ان کی ہستی ایسی نمایاں ہوتی تھی کہ ہر شخص متوجہ ہونے پر مجبور ہوتا تھا۔ وہ بلند اخلاق و وسیع القلب تھے، جس کے سبب ہر شخص گرویدہ (و) متاثر ہوتا تھا۔ بڑے بڑے علما اور معاصر شعرا بھی ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔[7]

خواجہ صاحب کا کلام ان کی وصیت کے مطابق اولاً 'کلامِ مجذوب' کے نام سے شائع ہوا اور پھر 'کشکولِ مجذوب' کے نام سے مسلسل شائع ہوتا رہا، اب یہی ان کا کُل شعری جہان ہے، جو سالک واحسان اور محبت و عرفان سے پر ہے۔

جو مجذوب کا ہے کلامِ محبت
وہ دنیا کو ہے اک پیامِ محبت

کشکول کی پہلی اشاعت ناسازگار حالات میں ہوئی، اس وقت یہ غنیمت سمجھا گیا کہ جس صورت میں بھی ہو ایک دفعہ شائع ہو جائے۔ اس کے بعد جن لوگوں کے پاس خواجہ صاحب کے کلام کا کوئی قلمی ذخیرہ موجود تھا ان سے وہ حاصل کیا گیا نیز مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے مرتبہ مجموعے 'مجذوب اور ان کا کلام' کے ایسے حصے کو جو سابق اشاعت میں نہ تھا، اس میں شامل کر لیا گیا اور کثیر ترمیمات و اضافات کے بعد جدید ایڈیشن شائع ہوا۔

مولانا نجم الحسن تھانوی لکھتے ہیں:

خواجہ صاحب کا کچھ کلام تو ان کی حیات میں طبع ہوا، جس میں رسالہ نمکدانِ ظرافت، نفیرِ غیب، مراقبۂ موت، دوازدہ اذکارِ عبرت، جذباتِ مجذوب حصہ اول و دوم، فریادِ مجذوب، فغانِ بیوہ وغیرہ شامل ہیں، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید ظہور الحسن صاحب نے ایک مجموعہ اس طرح مرتب فرمایا کہ جہاں جہاں سے ان کا کلام ملا، اس کو جمع کر کے چھاپ دیا اور نام اس کا 'کشکولِ مجذوب' رکھا۔[8]

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی خواجہ صاحب کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

آج کل کے شاعر اس بات کو نہیں سمجھتے کہ شاعری ترقی کے دو مدارج ہوتے ہیں؛ پہلا درجہ حکمت کا ہے، جب شاعر علومِ عقلیہ و نقلیہ میں یک گونہ مہارت حاصل کر لیتا ہے اور معاملاتِ دنیا و دین کے باریک امتیازات کو سمجھنے لگتا ہے تو کہا جاتا تھا کہ اسے 'حکمت' حاصل ہو گئی ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ 'کمال' کا تھا، یعنی جب شاعر اپنی وہبی اور اکتسابی حکمت کو شعر کی زبان میں ادا کرنے کے لائق ہو جاتا تو کہا جاتا کہ اب وہ 'درجۂ کمال' کو پہنچ گیا ہے... حضرت مجذوب کا کلام شروع سے آخر تک یکساں ہے اور اس اعتبار سے ان کے دیوان کو اساتذۂ قدیم کے دواوین سے مشابہ قرار دینا چاہیے، حیرت ہوتی ہے کہ معاملاتِ سلوک، سرکاری نوکری کی ذمے داریوں اور دنیا کے روزمرہ کاموں میں مصروفیت کے باوجود مجذوب صاحب کا کلام کہیں سے بھی نومشقی یا خام کاری کا پتہ نہیں دیتا، مشکل سے مشکل زمینوں میں طویل سے طویل غزلیں اور نعتیہ نظمیں بھی روانی اور شستگی میں سادہ روزمرہ

> ”خواجہ صاحب نے تفننِ طبع کے لیے اپنے انداز کی شاعری کی، شاعری میں ان کا کوئی استاذ نہ تھا، البتہ ذوق سلامت اور فطرت سنجیدہ تھی، جس نے کلام میں چار چاند لگا دیے، ہر شخص اپنے مذاق و مزاج کے مطابق ان کے کلام سے محظوظ ہو سکتا ہے، صوفیائے عارفین ان کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور شعرا و اصحابِ ذوقِ فنِ شعر کی باریکیوں کو سراہتے ہیں۔“

پرمبنی غزلوں سے بالکل مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔ 9

سوانح نگاری

'اشرف السوانح' مصنفہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی اولین اور مفصل سوانح حیات ہے، اس پر صاحب سوانح نے از خود نظر ثانی کی ہے۔ یہ صرف سوانحِ حیات نہیں بلکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و روحانی کمالات، مجددانہ کارنامے، اصولِ تربیت وسلوک، عارفانہ نکات، زریں اقوال، مریض و مسموم قلوب کے لیے مسنون و مجرب تعلیمات کا تریاق، حضرات سلف کا علمی عملی ذخیرہ اور یادگار، حقیقی اسلام کا مکمل درس اور دنیا و آخرت کے سنوارنے کا مکمل لائحۂ عمل ہے۔

اس طرح یہ ایک اہم، لازوال اور یادگار تصنیف ہے اور یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب کہ اردو زبان میں سوانح نگاری ابتدائی مراحل میں تھی، حالی وشبلی اور ان کے معاصرین اس میں قیمتی اضافے اور تجربے کر رہے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے خواجہ صاحب اور 'اشرف السوانح' کے متعلق لکھا ہے:

ان (خواجہ صاحب) کی سب سے بڑی یادگار اشرف السوانح کی تین جلدیں ہیں، جو بظاہر تو اپنے شیخ کے احوال وسوانح ہیں، مگر درحقیقت اس میں شیخ کے جمیع اصولِ تعلیم و ہدایات ونصائح و وصایا کو اس ترتیب سے جمع کیا ہے کہ وہ سلوک کی بہترین کتاب ہوگئی ہے۔ اشرف السوانح کا چوتھا حصہ جو شیخ کے آخری حالات اور وفات پر مشتمل ہے، شیخ کی وفات کے بعد بڑے سوز و گداز سے انھوں نے لکھا تھا۔ 10

دیگر خدمات

خواجہ صاحب کی ادبی خدمات میں شاعری اور سوانح نگاری کے علاوہ ایک نصابی کتاب کی ترتیب بھی شامل ہے۔ خواجہ صاحب انسپکٹر آف اسکولس تھے، یہ کتاب اسی سلسلے میں بطور نصاب تیار کی گئی۔ یہ کتاب 343 صفحات کو محیط ہے۔

سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے شری نرائن چترویدی لکھتے ہیں:

محکمہ توسیع تعلیم یوپی نے گذشتہ دو سال میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ لوگوں کو خواندہ بنایا اور ان نو خواندہ لوگوں میں خواندگی قائم رکھنے کے لیے کچھ خاص طرح کی کتابیں تیار کی جارہی ہیں، لیکن چونکہ دیہات کے لوگ عام طور پر نظموں اور ترانوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، اس لیے حکومت ممالک متحدہ کے ایجوکیشن سکریٹری جناب این سی مہتا صاحب آئی سی ایس نے اپنا یہ خیال ظاہر فرمایا کہ مقبولِ عام نظموں اور ترانوں کا ایک عمدہ مجموعہ خاص طور پر نوخواندہ لوگوں کے لیے تیار کیا جائے۔ حسبِ ایما آں جناب میں نے اپنے محترم دوست جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب سابق انسپکٹر مدارس سے یہ استدعا کی کہ وہ یہ کام اپنے ہاتھوں میں لیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ مجذوب صاحب نے میری استدعا قبول کی اور یہ قابلِ قدر مجموعہ تیار کر دیا، جو آپ کے سامنے ہے۔ 11

اس کتاب کی ترتیب میں حامد اللہ افسر میرٹھی اور عبد الرحمن قریشی سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس خواجہ صاحب کے معاون رہے۔ کتاب میں درج ذیل موضوعات پر نظموں کا عمدہ انتخاب پیش کیا گیا ہے: حمد باری تعالیٰ، مناجات، نعتِ رسولِ خدا، اخلاق، درسِ عبرت، نصائح، درسِ عمل، حبِ وطن، محبت، مناظرِ قدرت، ظرافت، متفرقات۔ ان حصص اور ان میں شامل تخلیقات کو دیکھنے سے خواجہ صاحب کے ادبی ذوق کی بالیدگی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نونہالوں کی ادبی و ذہنی تربیت کے لیے یہ ایک عمدہ انتخاب ہے۔

خواجہ صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انتخاب کا معیار میں نے کیا رکھا ہے؟ اس سوال کا جواب مشکل ہے، میں خود نہیں کہہ سکتا کہ میں نے انتخاب میں کیا معیار قائم کیا ہے؟ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ

جس قدر تنکے برے دل میں چبھے
چن لیے اپنے نشیمن کے لیے

لیکن ایسے تنکے اور بھی لاتعداد تھے اور میرے دل میں چبھنے کی گنجائش بھی بہت تھی، لیکن اس کتاب میں اس سے زیادہ گنجائش نہ تھی۔ 12

ترتیب نصاب کے علاوہ خواجہ صاحب انسپکٹر آف اسکولس ہونے کی حیثیت سے جب اسکولوں کا دورہ کرتے، اس وقت بھی طالب علموں کی ادبی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایسے ہی ایک دلچسپ واقعے کے ذکر پر بات کو ختم کیا جاتا ہے۔

ایک اردو اسکول کی کلاس میں معائنہ فرمارہے تھے، کلاس ٹیچر، ہیڈ ماسٹر، ڈپٹی انسپکٹر مدارس سب موجود تھے، ایک طالب علم سے درسی کتاب پڑھوائی، لفظ 'یتیم' آیا، معنی دریافت فرمائے گئے۔ طالب علم نے جواب دیا کہ جس کے باپ زندہ نہ ہوں، اس کو یتیم کہتے ہیں۔

کلاس ٹیچر سے دریافت فرمایا: اس نے بھی یہی جواب دیا۔

ہیڈ ماسٹر سے پوچھا، اس نے بھی یہی جواب دیا۔

فرمایا: پھر آپ بھی یتیم ہیں!

اس کے بعد فرمایا: میرے بھی باپ زندہ نہیں، میں بھی یتیم ہوں۔ غرض کہ اس جگہ جتنے آدمی ہیں، سب یتیم ہیں!

سب سن کر خاموش ہوگئے، شرمندہ ہو کر رہ گئے، پھر فرمایا: جس معصوم، نابالغ کے باپ زندہ نہ ہوں، اس کو یتیم کہتے ہیں، نہ کہ ہم جیسے بن باپ کے بوڑھوں کو۔

حواشی

1. خواجہ عزیز الحسن مجذوب، اشرف السوانح، جلد 3، ص: 537
2. ایضاً، ص: 522
3. ایضاً، ص: 522
4. ایضاً، ص: 534
5. ایضاً، ص: 534
6. ایضاً، جلد 4، ص: 210
7. خواجہ عزیز الحسن مجذوب، کشکولِ مجذوب، ص: 40
8. پروفیسر شمس الرحمن فاروقی، حضرت مجذوب کی شاعری، اوراق سبز ڈاٹ کام
9. خواجہ عزیز الحسن مجذوب، کشکولِ مجذوب، ص: 36
10. ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، ص: 207، بابت: جولائی 1944
11. خواجہ عزیز الحسن مجذوب، پھولوں کی ڈالی، ص: 3
12. خواجہ عزیز الحسن مجذوب، پھولوں کی ڈالی، ص: 15
13. پروفیسر احمد سعید، ذکر مجذوب، ص: 95، 96

Nadeem Ahmed Ansari
Flat No- 18, A - Wing
Sai Prasad Nagar
Second Floor, Bori Colony
Achole Road, Nallasopara (E)
Taluka Vasai-401209 (Maharashtra)
Mob.: 9022278319

محمد شاہد پٹھان

مظہر صدیقی

حق بات تو یہی ہے کہ مظہر نے آج تک
اک شعر بھی خلافِ حقائق نہیں کہا

راجستھان میں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں شعری افق پر اُبھرنے والے جدید شعرا میں خوشتر مکرانوی، مخمور سعیدی، عابد ادیب، خلیل تنویر، عقیل شاداب، ظفر غوری، غوث شریف عارف، عشرت دھولپوری، ممتاز شکیب اور ان کے بعد کے شعرا میں شاہد عزیز، ڈاکٹر سخاوت شمیم، احتشام اختر، شاہد میر، مظہر صدیقی، نذیر فتح پوری، شین کاف نظام، اظہار مسرت یزدانی، انعام شرر، ارشد عبدالحمید، لطیف فہمی اور کامران نجمی (مرحوم) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کے بعد کی نسل میں فاروق انجینئر، ش م حنیف، سرفراز شاکر، افضل جودھ پوری، ذاکر ادیب، شکور انور، معین الدین شاہین، نثار راہی اور ڈاکٹر محمد حسین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا میں سے بیشتر کا کلام برصغیر ہندوپاک کے مقتدر رسائل و جرائد اور شعری انتخابات میں برابر شائع ہوتا رہا، مگر بعض شعرا ایسے بھی ہیں جنھوں نے رسائل میں اپنے کلام کی اشاعت پر توجہ نہیں دی، چنانچہ راجستھان سے باہر کے قارئین کے مطالعے میں ان کی تخلیقاتِ شعری بار نہ پاسکیں۔ مظہر صدیقی کا شمار بھی آخر الذکر شعرا میں ہوتا ہے۔

مظہر صدیقی نے 1962 میں اپنی تعلیم (Draftman in civil engineer) مکمل کرنے کے بعد ماہرِ عروض استاد شاعر جناب شیدا کوثری جے پوری سے عروض کی تعلیم حاصل کی اور 1965 میں فارغ الاصلاح قرار دیے جانے کے بعد باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ ان کے پسندیدہ شعرا میں غالب، اقبال، حالی، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری اور کیفی اعظمی وغیرہ شامل ہیں۔

مظہر صدیقی نے غزل کے ساتھ ہی ساتھ نظم، ماہیا، ترائیلے، مثلث، ہائیکو، گیت اور دوہا وغیرہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے 'ارتعاش' (1988) اور 'اضطراب' (1995) اور ایک 'کلیات' (باعتبار حروفِ تہجی ستمبر 2007) شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مجموعۂ کلام 'سائباں' کے نام سے زیرِ اشاعت ہے۔ جس پر قمر رئیس کا مقدمہ شامل ہے۔ (مرقومہ 16 اکتوبر 2002)

مظہر صدیقی کے شعری و ادبی نظریے کی تفہیم کے سلسلے میں خود ان کے نثری و شعری معروضات قاری کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے درجنوں اشعار اور بعض بیانات میں صراحت کے ساتھ اپنے شعری منہاج و ترجیحات کی نشاندہی کی ہے۔ ذیل میں ایک نثری اقتباس پیش ہے:

''عوام کے جذبات اور احساسات کی صحیح ترجمانی کرکے انھیں موزوں الفاظ کی شکل دے کر عوام تک پہنچانا ہی میرا نصب العین رہا ہے۔ عین حقیقت ہے کہ پروازِ فکر، جولانیِ طبع اور اظہارِ خیال کے لیے عروض کی پابندی سدِ راہ نہیں بن سکتی۔ اصولی قید و بند شہباز طبیعت کو اوجِ معانی پر پرواز کرنے سے ہرگز نہیں روک سکتی۔ میں نے بعض مقامات پر الفاظ کی موزونیت، خیال و فکر کی مرکزیت، مضمون اور خصوصاً نظریاتی نصب العین کو قواعد و ضوابط پر ترجیح دی ہے، میں اسے عذرِ گناہ کی بجائے اپنی کم فہمی ہی تصور کرتا ہوں۔'' (ارتعاش 1988)

مظہر کی غزل کے حسبِ ذیل اشعار بھی اس ضمن میں مشرح و معاون معلوم ہوتے ہیں۔

احساس کی زمین تخیل کا آسماں
فکر کی قندیل کو مظہر ذرا
سرد ہوتے ہی نہیں میری نگاہوں کے چراغ
ہم زمانے میں بہر طور رہے سینہ سپر
زخم چاہیں کسی کے ہوں مظہر
دنیا کے حادثات سے جو بے خبر رہی
جذبات سے تہی ہو گر دائرہ نظر کا
لفظ بن کر خود حقائق بیش و کم آجائیں گے
دنیا میں میرے بعد کوئی غم نہیں رہے

جذبات کا عمیق سمندر غزل میں ہے
روزِ روشن کی طرح روشن کرو
میں نے دیکھے ہیں سلگتے ہوئے محشر کتنے
سر کو جھکنے نہ دیا فتنہ و شر کے آگے
خون روتا ہے پیرہن میرا
لفظوں کی بازگشت تھی وہ شاعری نہ تھی
ہر آئینہ ہے پتھر ہر گیت مرثیہ ہے
حادثے جتنے بھی ہیں زیرِ قلم آجائیں گے
ہر غم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

منقولہ اقتباس و اشعار سے مظہر صدیقی کے تصورِ شعر و ادب پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی ان کے احساسات و افکار کے اہم جہات و ابعاد کا بھی بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے، مظہر صدیقی درحقیقت ادب و شعر کا اجتماعی، افادی اور تعمیری نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے احساس و فکر پر اخلاقی و اصلاحی رنگ ہویدا ہے، وہ تخلیق کار کے 'دیدۂ بینائے قوم' کے منصب سے آگاہ ہیں، چنانچہ اپنے مشاہدات اور افکار کے اظہار میں انھوں نے عصری حسیت کے ساتھ ہی ساتھ حقیقت نگاری و حق بیانی کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے۔ انھیں حرف کی حرمت اور قلم کی قوت کا اندازہ ہے۔ لہٰذا اپنے شعری افکار و معروضات میں فکر افزائی اور حیات افروزی کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔

یہ بے حسی کا دور ہے اے صاحبِ قلم
آلودگی سے پاک نئی نسل کے لیے

تو چاہے تو یہ معرکہ سر ہو تو جائے گا
پُر نور منظروں کی چمک چھوڑ جاؤں گا

دانشوروں کے ذہن تو مفلوج ہو گئے — آخر مجھی کو اچھا برا سوچنا پڑا
روح میں ہوتا اگر دردِ صدائے مظلوم — تیرا ہر نغمۂ غم نغمۂ سرمد ہوتا

مظفر صدیقی نے سردار جعفری، ساحرلدھیانوی اور کیفی اعظمی سے اپنی پسندیدگی کا اعتراف کیا ہے، مگر میرے خیال سے بات پسند تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں اثر پذیری کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ مظفر کی ابتدائی شاعری پر سردار جعفری کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی نظم، غزل اور قطعات کے مطالعے سے قاری اس حقیقت کا اندازہ کرسکتا ہے۔ شعری اسلوب کی سطح پر مظفر صدیقی کے یہاں جذباتیت اور بلند آہنگی اوائل کار میں دراصل شروع (ارتعاش میں) میں نمایاں تھے مگر بعد کو بتدریج کم ہوتے جاتے ہیں۔ ذیل میں پیش کردہ اشعار سے مظفر صدیقی کی جذباتی ترقی پسندانہ روش اور بلند آہنگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مسلسل حادثوں میں جو پلے ہیں — بلندی پر انھیں کے حوصلے ہیں
توڑ کر بیساختہ اپنے قفس کی تیلیاں — ایک دن صیاد کو بھی آزمانا چاہیے
سرمایہ دار طبقے کو محنت سے ہے گریز — محنت کشوں کے واسطے آرام بند ہے

مظفر صدیقی نے اپنے زمانے و ماحول کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور قومی و بین الاقوامی مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے اپنے تفکرات اور محسوسات کو قدرے نرم گفتاری اور خود کلامی کے پیرائے میں بیان کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے۔ موضوعات کی تفصیلات سے صرفِ نظر یہاں صرف چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے حوالے سے قاری کو مظفر کی شاعری کی فنی و فکری جہات کا مناسب اندازہ بھی ہو سکے گا اور عہدِ جدید کی اچھی اور سچی ترقی پسند شعری روایت کے عمدہ نمونے بھی سامنے آسکیں گے۔

تبدیل اس کو کرنا ہے آبِ حیات میں — جو زہر کائنات میں پھیلا ہے ہر طرف
اپنے شہکار کو منظورِ نظر ہونے تک — ہاتھ کٹ جائیں گے تشہیرِ ہنر ہونے تک
ہر آشیانہ رہے جس کی شاخ پر محفوظ — تمام عمر رہے گا وہی شجر محفوظ
رہ گزر میں روشنی ہوجائے گی — اپنا اپنا حوصلہ روشن کرو
کیا ہے عہد نئی نسل کے پرندوں نے — رکھیں گے برق پہ بنیاد آشیانے کی
غبار آلودہ ہے ہر ایک چہرہ — گلوں میں رنگ و بو باقی نہیں ہے
اپنے اشکوں میں کچھ نور تحلیل کر — ظلمتوں کو اُجالوں میں تبدیل کر
ظلمتیں انسان کو مایوس کر دیتی ہیں جب — از سرِ نو زندگی کا واسطہ دیتی ہے دھوپ
حسن کی روداد ہو یا قصۂ دار و رسن — گفتگو کے واسطے کوئی بہانا چاہیے
دیکھ کے مجھ کو دریچے بند کر لیتے ہیں جو — ان پہ مظفر بند میرے گھر کا دروازہ نہیں
تاریکیوں میں ڈوب گئی گردشِ حیات — سورج کے ارد گرد زمیں گھومتی رہی
جو سوچتا ہوں تو ہر ایک چیز ہے میری — جو دیکھتا ہوں تو گلشن نہ آشیانہ ہے

انھوں نے اپنے احساسات و تجربات کے اظہار کے دوران زیادہ تر براہِ راست طرزِ اظہار اختیار کیا ہے، لیکن ان کی شاعری (غزل) کا ایک حصہ 'جدید غزل' کی بنیادی جہات و خصوصیات کا بھی ترجمان ہے۔ مظفر نے دراصل فطری طور پر جدید اور صنعتی تہذیب اور معاشرے کے معمولات و مظاہر پر اپنے محسوسات و تاثرات کا مؤثر اظہار کیا ہے، وہ جدید لفظیات اور عام فہم نئے استعارات و علامات کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔ مشینی سماج و ثقافت میں زندگی گزارنے والے ایک حساس فنکار کی حیثیت سے مظفر صدیقی نے کسی قدر اپنے ذاتی اور وجودی کرب و احساس کا بیان بھی کیا ہے۔ مگر ان کا ذاتی کرب 'داخلیت زدہ' نہیں بلکہ ایک صحت مند، حساس اور حق آگاہ تخلیق کار کا شعری معروضہ ہے جس میں آج کا باذوق اور حساس قاری اپنی ذہنی رغبت و قربت محسوس کرتا ہے۔ اپنے تجربات کے اظہار میں مظفر صدیقی نے طنز آمیز تخاطب، خود کلامی اور گاہے بہ گاہے استفہامیہ لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ درج ذیل اشعار اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ حد سے بڑھ گیا ہے یہ بے چہرگی کا کرب — اب آئینوں کو اور جلا دینا چاہیے
مظفر ہر ایک فاصلہ اپنی جگہ رہا — ہم قربتوں میں اور اضافہ نہ کر سکے
چہروں نے دے رکھا تھا فریبِ نظر مجھے — ورنہ مری نگاہ میں بے چہرگی نہ تھی
ترکِ تعلقات کا باعث تھا اور کچھ — یوں تو مرے خلوص میں کوئی کمی نہ تھی
سورج کی تیز دھوپ نے مظفر جلا دیا — ملتا نہیں ہے سایۂ دیوار و در مجھے
مجھ کو معلوم ہے خوابوں کی حقیقت کیا ہے — خواب ہوتے ہیں حقیقت سے زیادہ بیتاب
دشت کا دشت ہے آبادی کی آبادی ہے — دوسرا گھر نہیں کوئی مرے گھر کے آگے
باہر نکل کے گھر سے کوئی دیکھتا کسے — جز میرے شہر میں کوئی بے خانماں نہ تھا
جاؤں تو کہاں جاؤں سرابوں سے نکل کر — صحرا مرے پیچھے ہے تو دریا مرے آگے

آج کے ماحولِ حیات میں سماجی سطح پر بڑھتی ہوئی خود پروری، بے گانہ وشی، بے مروتی اور دوسری مکروہاتِ حیات کا مظفر صدیقی کو شدید احساس ہے، انسانی اقدار اور اخلاقی رسم و روایات کا انفساخ بھی ان کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ نظمیہ شاعری کی طرح مظفر کی غزل میں بھی عصرِ جدید کے کرب ناک مناظر کا اندوہ ناک بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔

کیا عجب بات ہے باہر ہے بڑی خاموشی — اندر اندر کوئی کہرام مچا ہو جیسے
روداد رو رہے ہو تم اپنے ہی جسم کی — اس آگ میں جلے ہیں ہزاروں کے گھر میاں
زندگی اصل میں وہ راہ گزر ہے جس میں — حادثے ختم نہ ہوں ختم سفر ہونے تک
لوٹ کر جب بھی ہم اپنے ہی گھر آتے ہیں — حادثے ساتھ مکانات میں در آتے ہیں
سرد ہوتے ہی نہیں میری نگاہوں کے چراغ — میں نے دیکھے ہیں سلگتے ہوئے محشر کتنے

ان کے شعری افکار میں زندگی بیزاری، ہزیمت اور شکست کا تصور نہیں اُبھرتا، انھیں زندگی کی اخلاقی، ایمان پرور اور امید افزا اقدار پر کامل یقین ہے، چنانچہ وہ ایک خوشگوار اور روشن انسانی مستقبل کا خواب دیکھتے اور دکھلاتے ہیں۔ انھیں باطل قوتوں کے مقابلے میں حق و انصاف کی فتح و نصرت کا بھروسہ ہے۔ مظفر صدیقی کی شاعری ہر خاص و عام قاری کو جہد و عمل کا پیام دیتے ہوئے امید و ایقان کی حیات بخش دولت سے بہرہ مند کرتی ہے۔

ناامیدی کے اندھیرے بڑھ گئے تو کیا ہوا — اپنی آنکھوں میں امیدوں کی چمک باقی رہے
میری خوش فہمی کا عالم حد سے کم ہوتا نہیں — یہ وہ سرمایہ ہے جو رہنِ الم ہوتا نہیں
مسلسل حادثوں میں جو پلے ہیں — بلندی پر ان ہی کے حوصلے ہیں
فکرِ حادثاتِ شب یوں نہ کر دلِ مظفر — ظلمتوں میں پوشیدہ بیکراں اُجالے ہیں
سیکڑوں ظلمت کدوں کو توڑ کر آئے گا پھر — اک نیا سورج جو مظفر شب کے پیراہن میں ہے

مظفر صدیقی کی شاعری واقعتاً سنجیدہ مطالعہ کی متقاضی ہے۔ غزل میں نظمیہ موضوعات و مسائل کا شعری اظہار ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، مگر مظفر صدیقی نے اپنی فنکارانہ مشاقی وزِرا کی سے یہ مرحلہ کامیابی سے طے کیا ہے۔

یہ سچ ہے ہوتی ہے ہر شے فنا، مگر مظفر — جہاں میں رہتے ہیں افکار معتبر محفوظ

■

Mohd Shahid Pathan
Govt Girls College, Gangapol
Jaipur- 302002 (Rajasthan)

منموہن تلخ اور یاس یگانہ چنگیزی

فیضان الحق

منموہن تلخ جدید اردو غزل کے ایک اہم شاعر ہیں۔ ان کا شمار دہلی کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ کمار پاشی، اور منجیدہ بانی جیسے متعدد شعرا نے ان سے مشورۂ سخن لیا ہے۔ ان کی غزلوں کا رنگ میر تقی میر اور یاس یگانہ چنگیزی کے خاص اسلوب کو آگے بڑھاتا ہے۔

منموہن تلخ، یاس یگانہ چنگیزی کے باضابطہ شاگرد تھے۔ ان دونوں کا رشتہ کافی گہرا ہے۔ یگانہ نے منموہن تلخ کو ہمیشہ عزیز رکھا اور ذاتی زندگی سے لے کر ادبی معاملات و مسائل کا بھی ان سے بلا تکلف اظہار کیا۔ تلخ کے نام لکھے گئے یگانہ کے خطوط، منموہن تلخ کے کالم اور یگانہ کے سلسلے میں کہی گئی تلخ کی نظم اور رباعی کا مطالعہ کرنے سے ان دونوں کے گہرے تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ تلخ پر تبصرہ و تنقید کرنے والے کچھ بزرگ ناقدین نے اس بات کا ضرور ذکر کیا ہے کہ تلخ یگانہ کے شاگرد تھے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یگانہ پر کام کرنے والے بیشتر مؤلفین و مصنفین کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ یگانہ کے شاگردوں میں 'منموہن تلخ' نام کا بھی کوئی شاعر ہے، شاگرد ہونے کی بات دور کی ہے۔ اگر کسی نے یگانہ کے خطوط کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو شاید اتنی بڑی بھول نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کے سوانحی کوائف اور ادبی رشتوں پر ابھی بہت کام کیا جانا باقی ہے۔ یگانہ کے شاگرد ہونے اور منفرد شعری رویے کے حامل ہونے کے سبب منموہن تلخ کی شخصیت غیر معمولی ہے۔ تلخ کو فراموش کر کے ہم یگانہ کے سوانحی کوائف اور ادبی معاملات کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تلخ یگانہ کے ایسے شاگرد ہیں جنھوں نے ان کی ذاتی زندگی کا ایک بڑا مسئلہ حل کیا۔ تمام عمر ان سے استفادہ کیا اور اپنی صلاحیتوں پر استاد سے سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ جب یگانہ اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے تو بہت سی امانتوں کے وہ تنہا وارث بھی رہے۔ لوگوں نے یگانہ کے نام پر بہت کچھ کیا، مگر تلخ نے کبھی بھی اپنی قربت اور تعلق کو کیش کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

"ادھر پچھلے پانچ دس برسوں میں مرزا یگانہ پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس میں راقم الحروف کا کہیں ذکر تک نہیں ہے، نہ پاکستان کی تحریروں میں نہ ہندوستان میں شائع ہونے والے مضامین میں، اور اب تو جیسا کہ مجھے شاید کمال احمد صدیقی نے بتایا کہ ہندوستان میں بھی مرزا یگانہ کے نام پر کوئی سوسائٹی بھی بن چکی ہے جسے سرکار کی طرف سے مالی امداد بھی دی جا رہی ہے۔ اگر مرزا کے بارے میں مجھ سے کوئی رابطہ قائم کر لیتا تو مجھے سونے کا کوئی سنگھاسن نہ دے دیتا۔ یہ ذہنیت اردو ادب ہی کو نقصان پہنچائے گی، مجھے نہیں۔ میں نے تو اپنے اور مرزا کے تعلق کو کیش کرانے کی کبھی سوچی ہی نہیں۔ کس مسخرے نے مرزا یگانہ کے نام پر کوئی سوسائٹی بنالی ہے اور کون سی عقل کی اندھی حکومت اسے گرانٹ دے رہی ہے۔ اردو والوں کی باتیں اردو والے ہی جانیں۔ مجھ سے زیادہ مرزا کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔"[1]

'مجھ سے زیادہ مرزا کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔' یہ معمولی بیان نہیں۔ اس سے تلخ کے جذباتی رشتے اور یقین کا بھی سراغ ملتا ہے۔ مگر مرزا کے احوال سے

واقف یہ شخص یگانہ تحقیق کے سلسلے میں کسی بھی تحریر یا تقریر کا حوالہ نہیں بن سکا۔ سب سے پہلے یگانہ کے متعلق تلخ کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے، جو انھوں نے یگانہ کی وفات کے قریب چالیس سال بعد لکھی ہے:

''میرزا یاس یگانہ چنگیزی۔ ایک یگانۂ روزگار شخصیت، ایک عہد ساز شاعر، ایک ایسی شخصیت جسے ان کے جیتے جی عام طور پر غلط سمجھا گیا اور آج بھی جب کہ انھیں اس جہان فانی کو الوداع کہے ہوئے قریب قریب نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی بے پر کی ہانک رہے ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہر شخص اپنے آپ کو مستند کہہ رہا ہے۔ ایک ایسا بے مثال شاعر جس کے ادبی مقام و مرتبے کا ٹھیک ٹھیک تعین آج تک نہیں کیا جا سکا اور غضب یہ ہے کہ ہر شخص یہ مان رہا ہے اردو ادب کو جتنی ضرورت ان کے لہجے کی آج ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔''[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یگانہ کو کس طرح نظر انداز کیا گیا اور ان کے اسلوب کی موجودہ زمانے میں کتنی ضرورت ہے۔ شاید اسلوب کی یہی وہ خوبی ہے جو تلخ کے یہاں نمودار ہو کر اپنی تلخی کے باوجود نئی حسیت کا احساس دلاتی ہے۔ تلخ کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ یگانہ اپنی خودسری کے باوجود جھگڑالو قسم کے انسان نہیں تھے۔ جیسا کہ ان پر طرح طرح کے الزامات عاید کر کے انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر کی کج ادائی یا دلی والوں کی زبان میں میر کی کجی اردو ادب میں محاورہ بن چکی ہے۔ تنک مزاج مرزا یگانہ بھی کم نہ تھے لیکن راہ چلتے لڑائی مول نہ لیتے تھے۔''[3]

راہ چلتے لڑائی مول نہ لینے کا مطلب واضح ہے۔ یگانہ کی شخصیت میں کوئی ایسا ٹیڑھ نہیں تھا جس کے سبب انھیں لعن طعن کیا جائے۔ ان کی ساری کجی علمی بنیادوں پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تلخ جیسا خودسر شخص یگانہ کی سرپرستی قبول کر سکا۔ تلخ کے مربی اور اہم عروض داں 'فلک صاحب' تلخ کے مزاج اور یگانہ کے فکر و کلام سے واقف تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ یگانہ کی سرپرستی میں تلخ کی آواز کو انفرادیت مل جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تلخ کے ذہن میں یگانہ کو استاد بنانے کا خیال فلک صاحب کے مشورے سے آیا اور وہ اس بات سے بہت خوش تھے۔ ایک بار انھوں نے تلخ سے کہا:

''تلخ! اگر مرزا یگانہ تمھیں شاگرد بنانا منظور کر لیں تو کیا بات ہے۔ میں نے کہا تھا: ان کے لائق کوئی غزل کہہ لوں پھر ایک اور خط لکھ دوں گا۔''[4]

تلخ ایک مدت سے یگانہ کو استاد بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے، لیکن اس کے لیے کوئی مناسب وقت درکار تھا۔ یگانہ کے نام انھوں نے پہلا خط ہفتہ وار 'اپنا دیش' میں مضمون لکھنے کی درخواست کے طور پر لکھا تھا، لیکن اس سے استاد اور شاگرد کا تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی سے ملنے کے لیے دہلی آنا ہوا۔ اتفاق سے تلخ بھی وہاں پہنچ گئے اور تلخ کو یگانہ کی شاگردی اختیار کرنے کا سنہری موقع ہاتھ لگ گیا۔ اس واقعے کو تلخ نے بہت ہی دلچسپ انداز میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھیں اپنے واقعۂ شاگردی کے تعلق سے سنت کبیر کا خیال آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرزا جب 1952 میں واپس ہندوستان آئے تو ان کی بیگم کو ہندوستان آنے اور یہاں آزاد شہری کی حیثیت سے رہنے کی اجازت نہ ملی تھی۔ میرزا دہلی اسی سلسلے میں آئے تھے کہ جوش ملیح آبادی سے کہیں کہ جواہر لال نہرو سے کہہ کر ان کی بیگم کو یہاں رہنے کی اجازت دلا دیں۔ میرزا سے میری ملاقات جوش ملیح آبادی ہی کے دفتر میں ہوئی تھی۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع۔ میں جیسے ہی جوش صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو میرزا کو ان کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میرزا کو پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی کیونکہ میں گنجینہ میں ان کی چھپی ہوئی تصویر دیکھ چکا تھا۔ کوئی اور شاعر ہوتا تو میں جھک کر آداب کر کے ایک طرف کرسی پر بیٹھ جاتا۔ لیکن میرزا کے لیے میرے دل میں اتنی عقیدت تھی کہ میں آگے بڑھا اور جھک کر ان کے پاؤں چھوئے۔ میرزا نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جوش صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''منموہن تلخ صاحب ہیں۔ آپ سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔'' جوش صاحب نے کہا۔''[5]

پہلی ملاقات کے ساتھ ہی کسی کا شاگرد بن جانا بھی آسان کام نہیں، لیکن تلخ کے لیے یہ ساری منزلیں آسان ہوتی گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے قدرت بھی اس تعلق کے لیے راستے ہموار کر رہی تھی۔ تلخ لکھتے ہیں:

''میں ہمت کی کمی کا کبھی شکار رہا ہی نہیں۔ سو میں نے قدرے جھک کر کہا۔ وزارت خارجہ کے کچھ اعلیٰ افسران کو میں بھی جانتا ہوں میں کل ہی ان سے ملنے جاؤں گا۔ نیچے سے رپورٹ ٹھیک اوپر چلی جائے تو...

''ہاں نہرو کے لیے بھی آسانی رہے گی'' جوش صاحب نے کلے میں ایک اور پان ٹھونستے ہوئے کہا۔

''بیٹے تم میرا یہ کام کرا دو تو...'' ''میرے من کی مراد پوری ہو جائے گی؟'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''شرف تلمذ!'' میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرزا نے لمحے بھر کے لیے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ جوش صاحب، عرش صاحب جیسے ہمہ تن گوش بن گئے تھے... اچانک میرزا کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور بولے۔ پاؤں تم میرا چھو ہی چکے ہو۔ بیٹا میں تمھیں کہہ ہی چکا ہوں۔ بھیج دیا کرو اپنی غزل لکھنؤ۔ لیکن غزل وہی بھیجنا جس کے بارے میں تمھیں بھروسہ ہو کہ میرے لائق ہے۔ ایسے ہی ہر غزل نہیں بھیجنا۔

''میں علم عروض بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''چراغ سخن پڑھو اور جہاں مشکل پیش آئے خط لکھ دیا کرو۔''[6]

اسی بزم میں فراق گورکھپوری بھی آ گئے اور تلخ کو دیکھ کر حیرت سے کہا: آپ؟ جس کا جواب یگانہ نے یہ کہتے ہوئے دیا۔ ''میرے شاگرد منموہن تلخ۔'' فراق نے کہا تبھی تو عروض میں سب کے کان کترتے ہیں۔ اسی طرح جب شام میں دلی کالج کے مشاعرے میں جانے کی بات آئی تو تلخ نے یہ کہتے ہوئے منع کر دیا کہ 'میں مدعو نہیں ہوں اور بن بلائے تو میں اوپر نہیں جا رہا۔'' فراق صاحب نے یگانہ سے کہا۔ 'اب یقین آ گیا کہ واقعی تمہارے شاگرد ہیں۔''

یگانہ کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد تلخ کبھی براہ راست لکھنؤ جا کر اور کبھی خط و کتابت کے ذریعے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ یگانہ سے ملنے کے لیے وہ لکھنؤ جانے

منموہن تلخ، یاس یگانہ چنگیزی کے باضابطہ شاگرد تھے، ان دونوں کا رشتہ کافی گہرا ہے۔ یگانہ نے منموہن تلخ کو ہمیشہ عزیز رکھا اور ذاتی زندگی سے لے کر ادبی معاملات و مسائل کا بھی ان سے بلا تکلف اظہار کیا۔ تلخ کے نام لکھے گئے یگانہ کے خطوط، منموہن تلخ کے کالم اور یگانہ کے سلسلے میں کہی گئی تلخ کی نظم اور رباعی کا مطالعہ کرنے سے ان دونوں کے گہرے تعلقات کا علم ہوتا ہے۔

کے بہانے تلاش کیا کرتے تھے۔ اپنے کالم میں انھوں نے ایک دوست کی بارات کا ذکر کیا ہے، جسے لکھنؤ ہو کر گزرنا تھا۔ تلخ محض یگانہ سے ملنے کے شوق میں اس بارات میں شامل ہو گئے۔ اس سفر میں قریب نو دنوں تک ان کا لکھنؤ میں قیام رہا اور وہ اپنے استاد و دیگر ادبی شخصیات سے استفادہ کرتے رہے۔

تلخ کے کلام میں جو انفرادیت نظر آتی ہے اسے قائم کرنے میں یگانہ کا بہت اہم کردار ہے۔ یگانہ باکمال شاعر تو تھے ہی، ساتھ ہی ماہر استاد بھی تھے۔ انھوں نے شعر وسخن کے سلسلے میں تلخ کو کئی اہم مشورے دیے۔ جن سے یگانہ کی فہم، لیاقت اور علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مشورہ نقل کرتے ہوئے تلخ لکھتے ہیں:

"انھوں نے مجھے خیال اور شعر کے آپسی رشتے کے بارے میں کئی اہم نکات بتائے۔ آخر میں بولے "تم پر میر کا اثر کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر تمھاری آواز میں میر اور یگانہ کے رنگ کا سنگم نظر آنے لگے تو تمھاری ٹکر کی غزل کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میرزا نے میر انیس کے مرثیوں کے ان گنت اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے اسلوب اور زور بیان کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ اردو زبان کے سہل ممتنع لب ولہجے کی مثال دیتے ہوئے میرزا نے پھر انیس کا یہ شعر پڑھا تھا۔

بد ہاتھ میں شکست ظفر نیک ہاتھ میں
وہ ہاتھ جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

میرزا کے یہ الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں۔ "دیکھو بیٹے، یہ آمد کا شعر ہے جس میں نیک اور ایک کا قافیہ، قافیہ بیانی کے لیے نہیں بلکہ عام بات چیت کے اس انتہائی قدرتی انداز میں استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اردو شاعری آج تک زندہ ہے اور رہے گی۔ مصرعۂ ثانی سے لگتا ہے یا نہیں کہ وہ تلوار چلی اور یہ ہاتھ کٹ کے دور جا پڑا۔"[7]

اس مشورے میں یگانہ نے واضح طور پر تلخ کی طبیعت پر میر کا اثر محسوس کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر تلخ یگانہ کے مشورے پر عمل پیرا رہے تو بہت مختلف غزل گو ثابت ہوں گے۔ تلخ کی غزلوں میں جس قسم کی سادگی نظر آتی ہے وہ بھی ایک شعوری عمل ہے۔ استاد یگانہ نے ہی انھیں سہل گوئی کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس مشورے میں بھی انھوں نے میر انیس کا ایک بند بطور مثال پیش کیا ہے۔ شعر کی توضیح جس انداز میں پیش کی گئی ہے وہ یگانہ کی استادی کا ثبوت ہے۔

تلخ نے لکھنؤ میں یگانہ سے ملاقات کے دوران ایک غیر معمولی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعے کے بعد یگانہ نے تلخ کی عروض دانی کا امتحان لیا اور تلخ نے اپنی عروض دانی پر استاد سے سند حاصل کی۔ واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تلخ اپنی دھن کے پکے، جرأت مند، اور نہایت بے باک انسان تھے۔ یگانہ کے مشوروں کی ان کی نظر میں خاص اہمیت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب میں 1954 میں لکھنؤ گیا تھا تو ایک دن میرزا کے ساتھ (تب وہ شاہ گنج والے مکان میں قیام فرما تھے) گومتی کے کنارے بیٹھے بیٹھے جب میرزا مجھے غزل، لہجے، فکر اور شعری محاسن کے بارے میں کافی کچھ بتا چکے تو میں نے کہا "میرزا میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام..."

"ابھی نہیں۔ اپنی آواز پہچانو۔ آواز پہچانے بغیر شعر کہا تو کیا کہا۔ ابھی آواز میں وہ بات آ لینے دو کہ میں تمہارا مجموعہ سامنے لاتے وقت فخر محسوس کروں۔"

میں میرزا کی بات سن کر کچھ دیر تک زمین پر پڑی اپنی بیاض کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بیاض اٹھائی اور گھما کر گومتی میں پھینک دی۔

"یہ کیا؟" میرزا نے کہا۔

"آج سے سب کچھ بالکل نئے سرے سے کہوں گا۔"

میرزا مجھے کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر اٹھتے اٹھتے بولے۔ غالب کی وہ غزل ہے نا! آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے۔ ذرا اس کی تقطیع تو کرنا۔ میں نے تقطیع کر دی تو میرزا نے میری پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے اب تمھیں میری ضرورت رہی بھی نہیں۔"[8]

تلخ کو اپنی لیاقت اور فہم پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنے استاد کی تمام آرا سے اتفاق کرنے کے قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار عزت واحترام کے باوجود تلخ نے یگانہ کی متعدد اصلاحات اور خیالات سے عدم اتفاق ظاہر کیا ہے۔ اس کی ایک مثال علامہ اقبال کے متعلق واقعہ ہے۔ اقبال تلخ کے پسندیدہ شاعروں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے گہرائی سے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تھا اور ان کے فکر وفن کو سمجھا تھا، اقبال پر ان کی نظم بھی اس کی گواہ ہے۔ لہٰذا اقبال کی تعریف کرنے پر اپنے استاد کے غیر معقول رویے کو وہ برداشت نہ کر سکے تھے اور ناراض ہو کر باہر نکل گئے تھے۔ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں دہلی واپس آنے سے پہلے اگلے دن پھر میرزا سے ملنے گیا۔ جہاں ان کے ساتھ تلخی پیدا ہو گئی۔ میری زبان سے ڈاکٹر اقبال کے لیے کچھ تعریفی جملے سن کر میرزا نے مجھے جس طرح پھٹکارا، میں وہ برداشت نہ کر سکا اور میری زبان سے نکل گیا۔ میں آپ کی پوجا کرتا ہوں۔ لیکن میں نے اپنا ذہن کہیں گروی نہیں رکھا۔ بھاگوت گیتا کے سامنے بھی نہیں۔ اور میں اٹھ کر چلا آیا تھا۔"[9]

اس تلخی کے بعد فلک صاحب کا خیال تھا کہ اب تعلق ختم سمجھو، لیکن اس کے باوجود دونوں کے رشتے میں دراڑ نہیں پیدا ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تلخ نے یگانہ کی بیوی کے ہندوستان آنے اور یہاں کے شہری بن کر رہنے کا انتظام کر دیا تھا، جس سے یگانہ بہت خوش اور ممنون تھے۔ تلخ نے یگانہ کی اس کوشش سے ایک دوسرا نتیجہ بھی اخذ کیا ہے۔ انھوں نے بیوی کے سلسلے میں یگانہ پر لگائے جا رہے بیجا الزامات کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسی لیے اب میں پاکستان کے کچھ بڑے ادبی جریدوں (خاص طور پر 'ارتقا' کراچی) میں میرزا کے بارے میں یہ پڑھ کر حیران ہو جاتا ہوں کہ بیگم کے ساتھ میرزا کے تعلقات میں اس قدر تلخی آ چکی تھی جو بیان سے باہر ہے۔ جوانی یا بڑھاپے میں کس میاں بیوی میں چخ چخ نہیں چلتی۔ لیکن جس بیگم کو ہندوستان میں رہنے کی اجازت دلانے کے لیے میرزا اس قدر پریشان تھے اس کے ساتھ ایسی نا چاقی... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"[10]

تلخ کے یہاں استاد کی پیروی اور مطابقت کی شعوری کوشش بھی نظر آتی ہے۔ یہ استاد سے گہری عقیدت کا بھی ثبوت ہے۔ اس کی ایک مثال ان کے پہلے شعری مجموعہ 'چراغ فکر' کا عنوان ہے۔ بیاض دریا برد کرنے کے باوجود یگانہ کی وفات سے کچھ پہلے ہی تلخ نے اپنا پہلا شعری مجموعہ تیار کر لیا تھا۔ کتاب کا عنوان بھی انھیں بتا دیا تھا اور داد حاصل کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں جب لکھنؤ سے دہلی کے لیے چلنے لگا تو میں نے انھیں ایک غزل سنائی تھی اور کہا تھا۔ یہ شعر آپ کی نذر ہے۔

ہم نے چراغ فکر لہو سے جلا دیا
لیکن ملا نہیں ترا نقش قدم ابھی

میرزا نے بہت خوش ہو کر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولے۔ ''لمبی عمر پاؤ، بہت نام پاؤ گے۔'' میں نے کہا تھا۔ ''میں نے اپنے پہلے مجموعے کا نام 'چراغ فکر' سوچا ہے۔ آپ کے۔''

''چراغ سخن' پر رکھا ہے۔ جیتے رہو۔''[11]

یگانہ اس فخریہ لمحے کو اپنے جیتے جی نہ دیکھ سکے۔ یگانہ 1956 میں انتقال کر گئے جب کہ یہ مجموعہ 1958 میں منظر عام پر آیا۔

یگانہ اور تلخ کے درمیان خط و کتابت کا طویل سلسلہ رہا۔ یگانہ نے تلخ کو نہ صرف خطوط لکھے بلکہ اپنے کئی مضامین بھی ارسال کیے۔ اس تعلق سے منوہن تلخ نے کئی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس طرح میرزا کے ساتھ میری خط و کتابت شروع ہوئی۔ یہ تمام خطوط میرزا کی وفات کے بعد ماہنامہ 'ساقی' کراچی میں قسط وار شائع ہوئے تھے۔ عنوان تھا ''یگانہ کے خطوط'' میرزا نے مجھے لکھنؤ سے دو ایک مضامین بھی بھیجے تھے اس خاص ہدایت کے ساتھ کہ انھیں بہ حفاظت تمام اپنے پاس سنبھال کر رکھنا۔ ایک مضمون کا عنوان تھا ''قبلہ تیرا ڈانواڈول'' لیکن میرا گھر تو ایک عرصہ سے سرائے تھا۔ وہاں کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔ میری کتابیں محفوظ نہ رہیں تو اور کیا رہتا۔ میں نے وہ مضامین اور میرزا کے کچھ اہم مضامین عرش صاحب کو دے دیے کہ وہ اپنے پاس ادبی امانت سمجھ کر رکھ لیں۔ کیا خبر تھی کہ عرش صاحب مجھ سے بھی پہلے داغ مفارقت دے جائیں گے۔ میرزا کے وہ مضامین اور خطوط کیا ہوئے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرزا کے کچھ دیگر اہم خط میں نے مشفق خواجہ کے کہنے پر کراچی بھیج دیے تھے۔ پتہ نہیں انھیں ملے بھی یا نہیں۔[12]

یگانہ کی وفات کے بعد جب شاہد احمد دہلوی کو اس بات کا علم ہوا کہ یگانہ اور تلخ کے درمیان آخری وقت تک خط و کتابت کا سلسلہ رہا ہے تو انھوں نے تلخ سے ان خطوط کے بابت دریافت کیا۔ تلخ نے کئی اہم خطوط کے موجود ہونے کا ذکر کیا۔ شاہد دہلوی نے انھیں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ تلخ نے خطوط بھیج دیے۔ اس طرح تلخ کے نام یگانہ کے یہ خطوط 1957 میں ماہنامہ 'ساقی' میں 'یگانہ کے خطوط' کے عنوان سے قسط وار شائع ہوئے۔ کچھ اور خطوط مشفق خواجہ نے 'تخلیقی ادب' میں شائع کیے۔ ماہنامہ 'ساقی' میں ''میرزا یگانہ کے خطوط'' کی تیسری قسط کے ساتھ منوہن تلخ کا ایک نوٹ بھی درج ہے۔ اس نوٹ سے یگانہ اور تلخ کے درمیان گہرے تعلقات اور کئی اہم باتوں کا علم ہوتا ہے۔ تلخ لکھتے ہیں:

''میرزا کے خطوط کی تیسری قسط روانہ کر رہا ہوں۔ بیگم کے پاسپورٹ کی منظوری کے بعد میں نے بارہا میرزا کو اکسایا کہ وہ کوئی مضمون لکھ دیں۔ کسی ادبی بحث میں الجھیں۔ یہاں کی مقامی ادبی بحثوں اور ملاقاتوں کا حوالہ دیا۔ لیکن سب بے سود۔ میں میرزا کے مزاج سے آشنا ہوں۔ اور اپنی حدود میں رہ کر انھیں کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور کرتا رہا۔ کبھی رباعیات، کبھی کوئی غزل۔ اور ان خطوط میں میری رائگاں کوشش بڑی واضح طور پر جھلکتی ہے۔ (اسی دوران میں میرزا کے الاؤنس کی توسیع کا بھی جھگڑا شروع ہو گیا تھا) حیرت ہے کہ اس قسط کے آخری خط میں سے میرزا کا عجیب احساس کمتری جھلکتا ہے۔ وہ میرزا یگانہ جس نے یہ شعر کہا ہے۔

میں اپنے زعم بلندی میں مٹ گیا لیکن
کبھی نشانۂ احساس کمتری نہ ہوا[13]

یہاں تلخ نے جس آخری خط کے متعلق احساس کمتری کی بات کہی ہے، اس میں یگانہ نے اپنے چل چلاؤ کا وقت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی معاشرے کے رویوں کا بھی اشارۃً ذکر ہے۔ یہی باتیں تلخ کو حیرت میں ڈال رہی ہیں۔

یگانہ نے خطوط میں تلخ کو بہت ہی پیار اور شفقت سے مخاطب کیا ہے۔ عام طور پر وہ 'عزیزی' یا 'پیارے عزیز' کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ یگانہ نے تلخ سے اپنی بہت سی پریشانیوں اور مسائل کا ذکر کیا ہے۔ اور مسئلہ حل ہونے پر شکریہ نامہ بھی لکھا ہے۔ مثلاً ان کی اہلیہ کے ہندوستان کا شہری بننے کا قضیہ جب حل ہوا تو انھوں نے تلخ کو لکھا:

''تم نے میرے معاملے میں جو سعی و کوشش، دوڑ دھوپ کی وہ مسلم ہے۔ کیوں کہ تمہارے دل کو لگی تھی۔ میری مصیبتوں سے تم واقف ہو۔ میں فقط یہ جاننا چاہتا تھا کہ اور کن بھلے آدمیوں نے تمہارا ہاتھ بٹایا سو وہ بھی معلوم ہو گیا۔ مسٹر کرشن موہن کو خدا خوش رکھے اور مسٹر ستیند رسنگھ کا بھی ممنون ہوں۔ میں نے اس فقرے کا لطف اٹھایا: ''ورنہ میرا ہاتھ اس کے منہ پر جا پڑتا۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری موقع تھا کہ میں مصلحت اندیش نکلا۔'' شاباش یہی چاہیے تھا۔ Prudence is better part of valour،

ہاں ہاں جن اصحاب نے تمہاری جدو جہد کا مضحکہ اڑایا وہ زیادہ تر قابل توجہ نہیں ہیں۔ آخر انھیں معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ یہ کام انجام پا گیا۔ خدا کا شکر ہے۔ میرزا یگانہ۔[14]

یگانہ نے تلخ کے نام ایک خط میں صنف غزل کی اہمیت اور اس پر کیے جا رہے بے جا اعتراضات کے سلسلے میں اظہار خیال کیا ہے۔ خط پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید تلخ نے غزل کے متعلق یگانہ کی رائے جاننی چاہی تھی۔ اس خط میں یگانہ نے جوش ملیح آبادی کی غزل دشمنی پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب تک تمھیں غزل کے متعلق میری رائے معلوم نہ ہو سکی۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ عملی طور پر برت کر دکھایا۔ چالیس برس تک مضامین لکھتا رہا۔ اب کیا کر سکتا ہوں۔ غزل کے خلاف جوش جو کچھ کہا کرتے ہیں کیا فی الحقیقت وہ غزل کو ایسا ہی سمجھتے ہیں یا محض لوگوں کو چڑانے کے لیے کج بحثی کرتے ہیں۔ کیا یگانہ کو دیکھنے کے بعد بھی انھیں غزل کا مرتبہ معلوم نہیں!''[15]

فلک صاحب کا ذکر تلخ کے ایک اہم مربی و رہنما کے طور پر آ چکا ہے۔ یگانہ کو استاد بنانے کا مشورہ بھی انھوں نے ہی دیا تھا۔ یگانہ بھی فلک صاحب سے واقف تھے اور عروض سے ان کی گہری دلچسپی اور واقفیت کے قائل تھے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''ہاں فلک صاحب علم عروض کی تدوین نئے طور پر کر رہے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ اس علم کو زیادہ Practical بنانے کی ضرورت ہے۔ میرا اسلام کہو۔''[16]

منوہن تلخ اور یگانہ کے درمیان آخری وقت تک خوشگوار تعلقات رہے۔ اس کا ایک ثبوت وہ خط ہے جو منوہن تلخ نے ظ۔ انصاری کے کہنے پر لکھا تھا۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

'' 1955-56 میں جب ظ۔ انصاری نے 'شاہراہ' کی ادارت کے فرائض سنبھالے تو مجھ سے بولے۔'' ارے یار تلخ! شاہراہ کے لیے ان سے رباعیات منگوا دو۔'' یہ میرزا کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ میں نے خط لکھ دیا اور جواب میں میرزا نے 'یگانہ آرٹ' کے عنوان سے چھ رباعیاں بھیجیں جو شاہراہ میں نمایاں طور پر شائع کی گئی تھیں۔''[17]

وسیم فرحت کارنجوی کی مرتبہ کتاب 'مکتوبات یگانہ' میں منوہن تلخ کے نام یگانہ کے خطوط کے تحت پانچ رباعیات شامل ہیں۔ یہ وہی رباعیات ہیں، جنھیں یگانہ نے منوہن تلخ کی درخواست پر ارسال کیا تھا۔ تلخ نے اپنے کالم میں چھ رباعیات ارسال کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن رسالہ شاہراہ کے شمارہ نومبر اور دسمبر (1954) میں کل 10 رباعیات 'یگانہ آرٹ' کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید تلخ سے ان کی صحیح تعداد کے سلسلے میں بھول ہوئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے

کہ 'مکتوباتِ یگانہ' میں شامل پہلی رباعی، جو کہ تلخ کے ہی پتے پر ارسال کی گئی ہے، رسالہ شاہراہ میں شامل نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ نے تلخ کو مختلف اوقات میں کئی رباعیات خطوط کے ذریعے ارسال کی تھیں۔ مکتوباتِ یگانہ میں سرنامے پر 1953، 1954 اور 1955 کی تاریخ درج ہے۔ بہت ممکن ہے ان میں سے محض دس رباعیات شاہراہ میں شائع ہوئیں اور کچھ باقی رہ گئیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف یہی ایک رباعی شائع نہ ہوئی ہو۔

وسیم فرحت کا رجوی کو ان میں سے محض 5 رباعیات خطوط کی شکل میں دریافت ہوئیں۔ مشکل یہ ہے کہ انھوں نے ان خطوط کا جو حوالہ پیش کیا ہے وہاں سرے سے تلخ کے نام کوئی خط ہی نہیں۔ وسیم فرحت نے ان خطوط کے سلسلے میں ''نقوش، مکاتیب نمبر'' (نومبر، 1957) کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس شمارے میں یہ خطوط موجود نہیں۔ 'نقوش، مکاتیب نمبر' میں یاس یگانہ چنگیزی کے کل 15 خطوط نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے 8 خطوط مالک رام کے نام، 2 راغب مرادآبادی کے نام، 2 دل شاہجہان پوری کے نام، ایک ایک مولوی ضیا احمد اور رفیق احمد بدایونی کے نام اور ایک خط کا مکتوب الیہ نامعلوم ہے۔ یہ خط مذکورہ رباعیات ہرگز نہیں۔ اس خط میں یگانہ نے کسی شخص کے ایک شعر کے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی کے اعتراض کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ یگانہ کے نام لکھے گئے تلخ کے خطوط دستیاب نہیں۔ اگر یہ خطوط بھی کہیں سے مل جائیں تو یگانہ اور تلخ کے تعلقات کو اور بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

یگانہ کے متعلق تلخ کی نظم کا عنوان 'آہ یگانہ' ہے جو کہ پہلے شعری مجموعہ 'چراغ فکر' میں شامل ہے۔ یہ نظم یگانہ کے سانحۂ ارتحال پر لکھی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نظم سے قبل مجاز کے متعلق لکھی گئی تعزیتی نظم میں تلخ نے یگانہ کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا

اب ہے یگانہ شمعِ فروزانِ لکھنؤ
کن آخری دموں پہ ہے اب شانِ لکھنؤ

مجاز کے متعلق تعزیتی نظم لکھتے ہوئے تلخ کو یگانہ کی بھی فکر لاحق تھی۔ جلد ہی وہ بھی چل بسے۔ اسی لیے اس نظم کی شروعات میں ہی وہ کہتے ہیں کہ تیری موت کسی بھی پل متوقع تھی لیکن آج اسے سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ابھی مجاز کی رحلت کا غم ہرا ہی تھا کہ یگانہ بھی چل بسے۔

ابھی ہونٹوں سے ابھرتی تھی صداہائے مجاز
زخم مرگ اس کا ابھی تھا دل پرخوں میں جواں

یگانہ کی رحلت تلخ کے لیے اس لیے بھی تکلیف دہ تھی کیونکہ

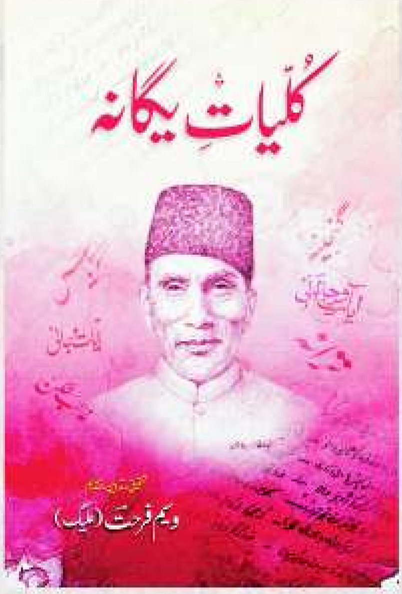

وہ ان کے استاد اور مونس بھی تھے۔ تلخ نے نظم کی ابتدا میں علم و ادب میں یگانہ کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے رحلت کا ماتم کیا ہے۔ اس بند کے ایک ایک لفظ سے عقیدت، انفرادیت اور امتیاز کے معانی برآمد ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی تراکیب، آہنگ اور لفظوں کا انتخاب بھی قابل غور ہے۔

ہائے وہ یاس و یگانہ وہ مفکر وہ غیور
ہائے وہ منکر و ملحد وہ مجاہد کردار
ہائے وہ درخور صد فخر و پرستش انساں
ہائے وہ گوہر افکار کا بحر ذخار

راز جو بھی تھا وہی اور وہ خود راز بھی تھا
تھا وہی جس نے کہ جانا تھا کہا تھا سب کچھ
اس دکھی جان نے کیا کیا نہ ستم جھیلے تھے
اے زمانے! یہ بتا کیا وہ روا تھا سب کچھ

تلخ نے یگانہ کو مفکر، غیور، لائق صد فخر، گوہر افکار کا بحر ذخار، راز اور راز جو ایسے ہی نہیں کہہ دیا۔ انھوں نے یگانہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کے ساتھ کافی وقت بھی گزارا تھا۔ ایک مقام پر وہ خود کہتے ہیں کہ یگانہ کے جتنے ناز انھوں نے اٹھائے وہ وہی جانتے ہیں۔ تلخ ان کی علمی و ادبی مہارت کے گواہ تھے۔ اسی لیے انھیں ہندوستان اور یہاں کے لوگوں سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے یگانہ کی قدر نہ کی۔

اے مرے ہندوستاں اے وطن اہل نظر
تو ہے سرچشمۂ فن، منبع ہر علم و ہنر
تو ہے گہوارۂ تہذیب و تمدن، لیکن
جیتے جی ایسے یگانوں کی کبھی قدر بھی کر

تلخ نے اس نظم میں اقبال کی مشہور نظم 'شکوہ' سے ایک مصرعے کو 'انھیں' کی جگہ 'اسے' کی تبدیلی کے ساتھ ایک بند کا حصہ بنایا ہے۔ ''اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر'' یہ یگانہ کے تئیں تلخ کے کرب کا اظہار ہے۔ تلخ کو یقین ہے ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب لوگ یگانہ کو تلاش کریں گے، لیکن جیتے جی یگانہ کو کبھی بھی ان کا حق نہیں دیا گیا۔ یگانہ کی زندگی اور موت دونوں ان کے شایان شان نہیں تھے۔ تلخ کا خیال ہے کہ یگانہ کی ایک بھی ادا کسی کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ یہ نظم یگانہ کی موت کا ماتم بھی ہے، عقیدت کا اظہار بھی اور ان کی انفرادیت و محرومی کا اعتراف بھی۔

یگانہ کی وفات پر لکھی گئی رباعی میں بھی تلخ نے ایک بڑے خسارے کا ذکر کیا ہے۔ 'چراغ فکر' میں شامل یہ آخری رباعی ہے۔ تلخ کو اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا کہ یگانہ کا وقت سفر قریب ہے۔ لیکن انھیں اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ یگانہ کی وفات ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ یگانہ کی خبر وفات کو انھوں نے اس خبر سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ قطب مینار گر گیا۔ تلخ نے منار کی مناسبت سے اسے مذکر استعمال کیا ہے۔ لیکن بطور عمارت قطب مینار دہلی کی شناخت اور قدیم مغل تہذیب کی ایک بڑی علامت ہے۔ تلخ کے مطابق موجودہ ادبی دنیا میں یگانہ کا مقام و مرتبہ بھی اسی منار کے مترادف تھا۔ مضمون کا اسی رباعی پر اختتام کرتے ہیں۔

اس عمر پہ یوں موت تری کیا ہے عجب
اے یاس و یگانہ ترا مرنا ہے غضب
یوں جان پڑا جیسے کوئی یہ کہہ دے
مینار قطب گر گیا ہے کل شب

حوالے

1 روزنامہ قومی آواز، دہلی، 10 ستمبر 2000
2 ایضاً، 9 جولائی 2000
3 ایضاً، 3 ستمبر 2000
4 ایضاً، 30 اپریل 2000
5 ایضاً، 9 جولائی 2000
6 ایضاً 7 ایضاً
8 ایضاً 9 ایضاً
10 ایضاً
11 روزنامہ قومی آواز، دہلی، 10 ستمبر 2000
12 ایضاً، 9 جولائی 2000
13 رسالہ ساقی مدیر: شاہد احمد دہلوی، کراچی، اگست، 1955، ص، 39
14 ایضاً، ص 40
15 ایضاً 16 ایضاً
17 روزنامہ قومی آواز دہلی، 9 جولائی، 2000

Faizanul Haque
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.: 8800297878

مقبول احمد مقبول

اعظم اثر کی غزل گوئی

ریاستِ کرناٹک کے شاعروں میں اعظم اثر کا نام ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ وہ چھ دہائیوں سے بھی زائد مدت تک گلستانِ شعروسخن کی آبیاری کرتے رہے۔ اعظم اثر کا اصل نام ابوالحاسن محمد اعظم ہے۔ موصوف شاہ پور، ضلع گلبرگہ (موجودہ نام کلبرگی) کے متوطن تھے۔ 16/مارچ 1931 کو موصوف کی ولادت ہوئی۔ اعظم اثر شاہ پور کے ایک علمی اور مذہبی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے دادا محمد قاسم وکیل تھے اور والد محمد اسماعیل ذبیحؔ پیشۂ درس وتدریس سے وابستہ تھے۔ 8/اکتوبر 2020 کو اعظم اثر نے اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف کوچ کیا۔

اعظم اثر نے نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ موصوف نہ صرف خالص شاعر تھے بلکہ نہایت زود گو شاعر تھے۔ ان کے اب تک سات شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں: (1) زخمِ آگہی (2) متاعِ آگہی (3) رشتوں کا درد (4) موسموں کی سرحدیں (5) اجالے تبسم کے (6) فیضانِ رسولِ رحمت (7) سوچ کا سایہ۔

اعظم اثر کہنہ مشق شاعر تھے۔ جیسا کہ کہا گیا انھوں نے چھ دہائیوں سے بھی زائد مدت تک گلستانِ شعروسخن کی آبیاری کی ہے۔ اعظم اثر کے ذخیرۂ کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل، پابند نظم، آزاد نظم، قطعہ، حمد، نعت اور منقبت جیسی اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے پاس چند ثلاثیاں، ماہیے اور ہائیکو بھی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض تبدیلیِ ذائقہ کی خاطر ان اصناف میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اعظم اثر کو غزل، نظم اور قطعہ کے ساتھ ساتھ حمد ومناجات اور نعت و منقبت نگاری پر بھی یکساں قدرت حاصل تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں بھی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں اعظم اثر کی غزل گوئی پر گفتگو مقصود ہے۔

اعظم اثر کے کلام کا غالب حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کے مطبوعہ مجموعوں میں لگ بھگ پانچ سو غزلیں موجود ہیں۔ اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ بظاہر آسان دکھائی دینے والی صنفِ غزل، شاعر سے بڑے ریاض اور محنت کا مطالبہ کرتی ہے۔ دو مصرعوں میں ایک مکمل بات، بہترین پیغام اور جذبہ واحساس تمام ترفنی لوازمات اور زبان کے حسن کے ساتھ اس سلیقے سے پیش کرنا کہ وہ قاری اور سامع کے دل میں اتر جائے، ظاہر ہے کہ مشکل ہی نہیں بلکہ مشکل ترین امر ہے۔ جب اس حوالے سے اعظم اثر کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی۔ اعظم اثر کے اسلوب میں کوئی انوکھا پن یا جدت وندرت نہ سہی لیکن انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کو فنی رچاؤ کے ساتھ بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اعظم اثر کی ساٹھ سالہ طویل مشق ومہارت نے ان کی غزل میں نکھار پیدا کیا ہے۔ اعظم اثر کی غزل پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہے۔ ان کی غزل کے کئی اشعار زبان زدِ خاص وعام ہونے کی خصوصیت کے حامل ہیں۔ اعظم اثر کو زبان وبیان اور فن پر اچھی دسترس حاصل تھی۔

اعظم اثر کی غزل کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ انھوں نے زندگی اور سماج سے وابستہ تقریباً ہر موضوع پر شعر کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں۔ اعظم اثر نے مثبت انقلاب، تعمیر وترقی، اعلیٰ اقدار وکردار کی ترویج، محبت والفت کے فروغ، ہمدردی واخلاص کی اشاعت پر زور دیا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ان کی غزل میں مایوسی ونامرادی اور شکست خوردگی نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف امید، عزم وہمت اور حالات سے نبردآزما ہونے کا حوصلہ نظر آتا ہے۔ ان کی غزل کا یہ رجائی پہلو قابلِ تحسین ہے۔ مثلاً پہلے مجموعے 'زخمِ آگہی' سے چند شعر ملاحظہ کریں۔

جلا دیا مرے تنکوں کا آشیاں تم نے
پر آشیانِ تمنا جلا نہیں سکتے
(ص:23)

اثر حیات کی پر ہول آندھیوں میں بھی
چراغِ ذوقِ عمل ہے کہ جگمگاتا ہے
(ص:24)

خوشی تو ہے خوشی، غم سے بہلنا جانتے ہیں ہم
غمِ ہستی ترے ہمراہ چلنا جانتے ہیں ہم
(ص:31)

پیمبر ہوں نہ کوئی معجزہ ہوں
محبت کے اجالے بانٹتا ہوں
مرا رہبر مرا عزمِ سفر ہے
میں اپنے آپ ہی اک قافلہ ہوں
(ص:29)

اس طرح کے اشعار ان کے یہاں بہت نظر آئیں گے۔

جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا کہ اعظم اثر کی غزل پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہے۔ وہ دور از کار علامتیں، مبہم استعارات اور مشکل تشبیہات سے دامن بچاتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ الفاظ بھی آسان اور سریع الفہم استعمال کرتے ہیں۔ اظہار میں بھی کوئی الجھاؤ یا گنجلک انداز نظر نہیں آتا۔ یہ تمام باتیں ان کی شاعری کو سہلِ ممتنع کے قریب کردیتی ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں سہلِ ممتنع کے حامل کئی اشعار بلکہ غزلیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک غزل کے کچھ شعر ملاحظہ کریں۔

جو ضروری ہے کیا کرتے رہو
کام جو بھی ہے بھلا کرتے رہو
وقت ہی کردے نہ کوئی فیصلہ
وقت پر ہرفیصلہ کرتے رہو
جب بھی ہو سنسان راہِ زندگی
ایک ہنگامہ بپا کرتے رہو

(متاعِ آگہی،ص:61)

مندرجہ بالا اشعار میں آسان ترین الفاظ میں اہم اور نہایت مفید باتیں کہی گئی ہیں۔ اعظم اثر ہرقسم کے موضوع اور خیال کو شعری جامہ پہنانے کا ہنر جانتے تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں رنگِ تغزل کی رعنائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً

تیری نگاہِ ناز گلِ تر سے کم نہیں
بن جائے قہر تو کسی خنجر سے کم نہیں
اس پیکرِ جمال کی کیا ہو وضاحتیں
وہ شعلہ تن کسی پری پیکر سے کم نہیں
اس کے خرامِ ناز کے قربان جایئے
انگڑائی اس کی فتنۂ محشر سے کم نہیں

(موسموں کی سرحدیں،ص:74)

اعظم اثر کے اشعار میں تغزل کی چاشنی کے باوصف کہیں کہیں طنز کی کاٹ بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر 'زخمِ آگہی' سے یہ دو شعر دیکھیں۔

اللہ کے بندوں سے تو کچھ پیار نہیں ہے
اور شیخ بنے بیٹھے ہیں اللہ کے پیارے

(ص:56)

بتا اے شیخ کہاں آدمی کی منزل ہے
تجھے تو عالمِ بالا دکھائی دیتا ہے

(ص:54)

اعظم اثر نے جس دور میں شعر گوئی کے میدان میں قدم رکھا وہ دور ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کے آغاز کا دور تھا۔ اعظم اثر کی غزل میں موجود تعمیری اور سماجی عنصر کو دیکھتے ہوئے ان کی غزل کو ترقی پسندی سے کچھ قریب کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کے ابتدائی دور کے کلام پر ترقی پسندی کی چھاپ کچھ حد تک نمایاں بھی ہے۔ اگر چہ اعظم اثر جدید طرزِ اظہار کے شاعر نہیں ہیں تاہم ان کے پاس کچھ جدید اسلوب کے حامل اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے

سورج کی روشنی بھی گھر میرے کیسے آئے
سورج بہت بڑا ہے دالان مختصر ہے

(متاعِ آگہی،ص:44)

اس کی سرسبزی وشادابی سے حیران ہیں لوگ
زرد موسم میں جو اک پیڑ اگا ہے مجھ میں
غیر آباد مرے جسم کی یہ بستی ہے
اک کھنڈر ہے کہ اثر چیخ رہا ہے مجھ میں

(متاعِ آگہی،ص:87)

دل میں یادوں کے کئی چاند اگا کرتے ہیں
اب یہ آسیب زدہ کوئی کھنڈر لگتا ہے

(رشتوں کا درد،ص:76)

اعظم اثر بلاشبہ قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے نئی نئی اور سنگلاخ زمینوں میں بھی اچھی غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً

جب سے ترا خیال مرے دل میں دفن ہے
اک دردِ لا زوال مرے دل میں دفن ہے

(رشتوں کا درد،ص:33)

حسن وعشق کی ساری دلکشی ہے شیشے میں
زندگی ہے شیشے میں بندگی ہے شیشے میں

(زخمِ آگہی،ص:61)

حصارِ ذات میں بھی راستے نکالتا ہوں
پھر اس کے بعد میں دل سے تجھے نکالتا ہوں
مرے کمالِ ہنر پر یقین کون کرے
میں زہر سے بھی کئی ذائقے نکالتا ہوں

(موسموں کی سرحدیں،ص:50)

پگھل جاتا ہے دل کا برف سارا موسمِ گل میں
سلگتا ہے محبت کا شرارہ موسمِ گل میں

(موسموں کی سرحدیں،ص:12)

اعظم اثر نے چھوٹی بڑی تمام مروجہ بحور میں غزلیں کہی ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے بعض ایسی بحور میں بھی غزلیں کہی ہیں جو مستعمل نہیں ہیں۔ غیر مستعمل اور نامانوس بحور میں کہنا اور اچھے شعر نکالنا قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ مثلاً بحرِ مجتث کا ایک غیر مانوس وزن یہ ہے۔

مَفَاعِ لُن فَعِلاتُن مَفَاعِ لُن فَعِلاتُن

یہ وزن اردو میں (اور شاید فارسی میں بھی) بہت کم بلکہ نہ کے برابر استعمال ہوا ہے۔ اس وزن میں غالب کے دیوان میں ایک غزل نظر آتی ہے جس کا مطلع ہے۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دوقدم آگے

عروض کی بعض کتابوں میں رند لکھنوی اور آتش کے درج ذیل شعر اس وزن کے تحت نظر آتے ہیں۔

موافقت میں عناصر کی گر نفاق نہ ہوتا
فراقِ روح کا قالب سے اتفاق نہ ہوتا

جو ساتھ چلنا ہے آتش تو باندھیے کمر اپنی
سفر زیارتِ کعبہ کو ہے ضرور ہمارا

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وزن کا استعمال دو چار شعرا ہی نے کیا ہے۔ اعظم اثر نے اس زیرِ بحث وزن میں اچھی غزل کہی ہے جس کا مطلع پیش ہے۔

سنا ہے پہلے سے وہ خوبرو زیادہ ہے اب کے
اسی کا ذکر یہاں گو یہ گو زیادہ ہے اب کے

(موسموں کی سرحدیں،ص:36)

عروضیوں کے مطابق بحرِ رمل سالم (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن) عربی اور فارسی میں مستعمل رہی ہے لیکن اردو میں اس کے استعمال کی مثالیں شاذ ونادر بلکہ نایاب ہیں۔ اعظم اثر کے ذخیرۂ غزلیات میں راقم الحروف کو اس بحر میں کہی گئی تین غزلیں نظر آئیں۔ ان تینوں غزلوں کے مطلعے پیش ہیں:

ہر حسیں منظر نظر کے زاویے میں روک لینا
کچھ حسیں چہروں کو دل کے آئینے میں روک لینا

(موسموں کی سرحدیں،ص:19)

یہ اندھیرے چاہتے ہیں روشنی کو میں نہ دیکھوں
بے خودی سے مطمئن رہ کر خودی کو میں نہ دیکھوں

(رشتوں کا درد،ص:68)

کون ہے سچا مرا بھائی برادر ڈھونڈتا ہوں
خون کی سچائیوں کو گھر کے اندر ڈھونڈتا ہوں

(سوچ کا سایہ،ص:43)

ممکن ہے کہ تمام کلام کو توجہ سے دیکھنے کے بعد نامانوس اوزان میں کچھ اور غزلیں بھی مل جائیں۔ وزن بھی نامانوس اور زمین بھی مشکل، اس کے باوجود اس میں غزلیں کہنا اور اچھے شعر نکالنا قادر الکلامی کی دلیل ہی تو ہے۔ مختصر یہ کہ اعظم اثر کی غزلیں فکر وفن اور زبان وبیان کے اعتبار سے متاثر کرتی ہیں۔ کرناٹک میں اردو غزل کی تاریخ اعظم اثر کے نام کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔

■

Dr. Maqbool Ahmed Maqbool
Professor, Dept. of Urdu
Maharashtra Udayagiri College
UDGIR-413517, Dist. Latur (M.S)
Mob.:9028598414

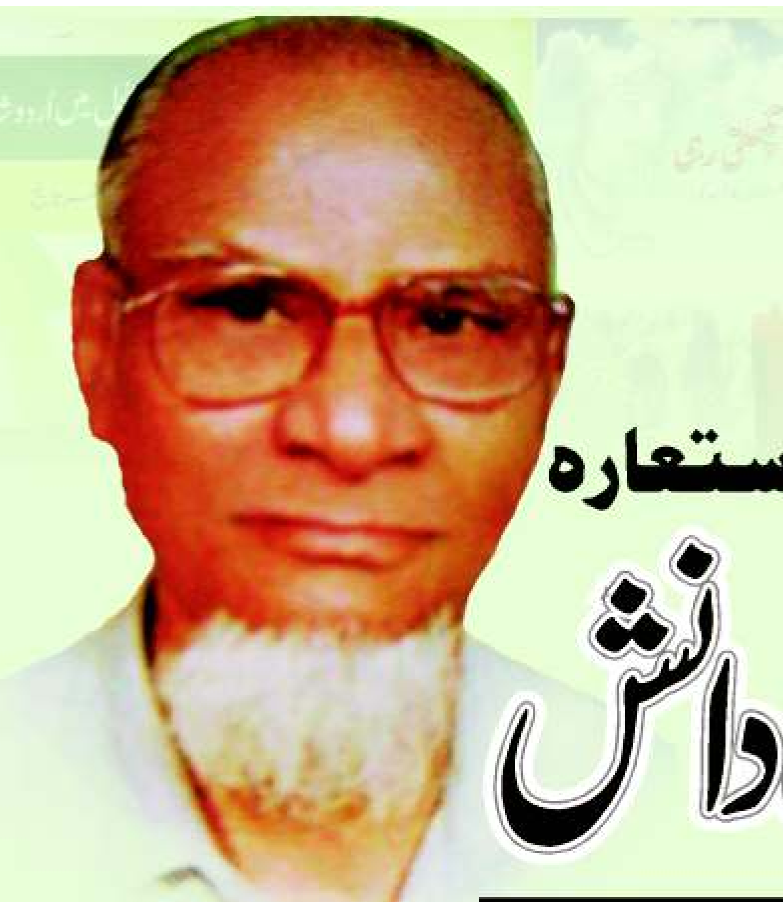

نعمان قیصر

علمی جستجو کا استعارہ

پروفیسر احمد حسن دانش

پروفیسر احمد حسن دانش کا مطالعہ وسیع تھا، اردو کے علاوہ ہندی، میتھلی اور انگریزی ادبیات پر بھی ان کی نظر تھی، وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، انھوں نے افسانے بھی لکھے اور تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنی عظمت و انفرادیت کا سکہ جمایا،اس کے باوجود ادبی دنیا میں انھیں وہ شہرت و مقبولیت نہیں مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

پروفیسر احمد حسن دانش کا نام ذہن میں آتے ہی ایک طرح کی سادگی، شگفتگی، لطافت، حلاوت اور قربت و اپنائیت کے احساس سے دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ان کی یادوں کی خوشبو سے مشامِ جان و دل معطر ہوجاتے ہیں۔ دانش صاحب کی ذات تواضع، انکساری، خلوص اور درد مندی کا مجسم پیکر تھی۔ انھوں نے پوری زندگی سماج کے لیے فیض رسانی کا کام کیا۔ان کی شخصیت خوشبو اور روشنی کا استعارہ تھی۔ ان کے علم وفکر کی روشنی اور ان کے گفتار و کردار کی خوشبو سے قرب و جوار ہی نہیں پورا سیمانچل گل گلزار رہتا۔ پورنیہ اور اس کے قرب و جوار کے اضلاع میں کوئی ادبی جلسہ ہو، ڈاکٹر احمد حسن دانش کی شرکت کے بغیر وہ ادھورا سمجھا جاتا۔ علالت ونقاہت کے باوجود وہ اس میں شریک ہوتے۔ سیمانچل جیسے دور دراز علاقے میں سکونت کے باوجود دانش صاحب نے علم وادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، شعروسخن کی دنیا آباد کی۔ اردو کا چراغ جلایا اور تشنگانِ ادب کی ذہنی وفکری آبیاری کی۔

پروفیسر احمد حسن دانش نے 10 جولائی 2023 بروز پیر تقریباً 78 سال کی عمر میں آخری سانس لی۔ مرحوم کا اصل نام احمد حسن تھا اور 'دانش' تخلص کرتے تھے۔ 13 ستمبر 1945 کو گاؤں کھا تکیہ، نو گچھیا، ضلع بھاگلپور (بہار) میں مولوی طیب علی کے یہاں پیدا ہوئے۔ لیکن ملازمت کی وجہ سے پورنیہ کو انھوں نے مستقر بنالیا اور وہ یہیں ہو کے ہو کر رہ گئے۔ دانش صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہی حاصل کی جب کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بہار یونیورسٹی مظفر پور کا رخ کیا۔ اردو و فارسی میں ایم اے کے علاوہ انھوں نے بی ایل اور بی ایڈ بھی کیا تھا، ایم اے اردو میں نمایاں پوزیشن کی وجہ سے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ ان کے اساتذہ میں پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر اختر قادری اور پروفیسر وہاب اشرفی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن دانش نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز پورنیہ کالج سے کیا۔ وہاں وہ صدر شعبۂ اردو رہے، بعد ازاں ترقی کر کے پروفیسر اور بی این منڈل یونیورسٹی سے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہوکر ستمبر 2005 میں سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے باوجود ان کے علمی و ادبی معاملات میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ان کا تحقیقی اور تخلیقی سفر تیز تر ہوگیا، ان کی نصف درجن سے زیادہ کتابیں، اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

پروفیسر احمد حسن دانش کا مطالعہ وسیع تھا۔ اردو کے علاوہ ہندی، میتھلی اور انگریزی ادبیات پر بھی ان کی نظر تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنی عظمت وانفرادیت کا سکہ جمایا۔ اس کے باوجود ادبی دنیا میں انھیں وہ شہرت ومقبولیت نہیں مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

دانش صاحب نے 'بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا' کے موضوع پر پروفیسر شمیم احمد کی نگرانی میں 1978 میں تحقیقی مقالہ جمع کیا، جو 1989 میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ مرحوم کی یہ کتاب جامعیت اور دستاویزی نوعیت کی وجہ سے بہار کی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔ دانش صاحب کی یہ کتاب ان کی شہرت وشناخت کا روشن ترین حوالہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تحقیق کے مقتضیات کو بروئے کار لاتے ہوئے بہار میں اردو مثنوی کے آغاز وارتقا پر مدلل اور مفصل بحث کی ہے۔ نیز انھوں نے مثنوی کے اوزان و بحور کے ساتھ اس کی زبان و بیان کے حوالے پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے اور جابجا اشعار

بھی نقل کیے ہیں تاکہ تعین قدر کی راہ آسان ہو سکے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کی معتبریت کے لیے ابتدائی ماخذ و مصادر کے ساتھ ساتھ ثانوی مراجع سے بھی رجوع کیا اور شعرا پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے معاصرین کا بھی تذکرہ کر دیا ہے تاکہ تحقیق کی مبادیات کی پاسداری ہو سکے۔

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی نے تمام تر شعری اصناف میں مثنوی کو سب سے زیادہ مفید اور کارآمد بتایا ہے چونکہ اس میں شاعر کسی بھی خیال کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے میں کلیتاً آزاد ہوتا ہے، یہ ایک جامع اور متنوع صنف ہے، جس میں ہر طرح کے مضامین اور فکر و فلسفے کے ساتھ ساتھ رزم و بزم اور عشق و محبت کے موضوعات کی بھرپور گنجائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا نے مثنوی کی طرف توجہ دی اور زہر عشق، گلزار نسیم، قطب مشتری، پھول بن اور ہر مزنامہ جیسی لازوال مثنویاں رقم کیں۔ ڈاکٹر احمد حسن دانش کا یہ کہنا ہے کہ بہار میں مثنوی کی روایت کافی قدیم ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق قاضی عبدالغفار بہار کے پہلے مثنوی نگار ہیں جنھوں نے 1116ھ مطابق 05-1704 میں 'جواہر الاسرار' کے نام سے ایک مثنوی لکھی، جس میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ صنف مثنوی کی ترقی کے باوجود بہار میں مثنوی نگاری کی تاریخ میں 'جواہر الاسرار' کو سنگِ بنیاد کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہار کے ابتدائی دور کے مثنوی نگاروں میں دوسرا نام انھوں نے اشرف علی کا لکھا ہے جو فغاں تخلص کرتے تھے۔ ان کے ایک ریختہ دیوان کے علاوہ ان کی دو مثنویوں کا ذکر کیا ہے لیکن نام ایک ہی مثنوی کا لکھا ہے، وہ ہجو یہ مثنوی جس کا عنوان ہے 'ہجو میر معصوم' اس میں کل 1430 اشعار ہیں۔ انھوں نے یہ ہجو یہ مثنوی کسی ضعیف شخص کی شادی کی خواہش پر لکھی تھی۔ تحقیق اور دریافت کے عمل سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر احمد حسن دانش نے اپنی اس تحقیق میں بہار کے تیس مثنوی نگاروں کی مثنویوں کا فکری، فنی لسانی اور موضوعاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ تذکرے اور تحقیقی کتابوں میں جن شاعروں کی سوانحی تفصیلات نہ مل سکیں ان کو انھوں نے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی، البتہ جن شاعروں کے سوانحی کوائف اور ان کی ذاتی زندگی کی تفصیلات کتابوں اور تذکروں میں دستیاب ہوئیں ان پر دانش صاحب نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں دو غیر مسلم اور ایک خاتون مثنوی نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لالہ جگر ناتھ، مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر عاشق اور راضیہ خاتون۔ لالہ جگر ناتھ کے حالات دستیاب نہیں، البتہ ان کی ایک قلمی مثنوی کا ذکر ملتا ہے، چار سو اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں قصہ ست کنور بیان کیا گیا ہے، یہ تقریباً دو سو سال قبل لکھی گئی ہے اس اعتبار سے اس کی تاریخی اہمیت ہے حالانکہ اس میں زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ اس کتاب میں دوسرے غیر مسلم مثنوی نگار جن کا ذکر دانش صاحب نے کیا ہے وہ ہیں، مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر عاشق۔ بہادر ایک زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی زبان میں بہت زیادہ اشعار کہتے تھے، اس میں کئی دیوان، قصائد اور مثنویاں ہیں لیکن اردو میں چند متفرق اشعار، ایک سہرا اور مثنوی کے علاوہ ان کا کچھ بھی دستیاب نہیں۔ تذکرے میں اس مثنوی کا نام 'زیبا' بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانش

نے 'بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا' میں جس خاتون مثنوی نگار کا ذکر تفصیل سے کیا ہے وہ ہیں بی بی راضیہ خاتون جبیلہ۔ وہ ایک ذی علم خاتون ہیں۔ یہ شمس العلما مولوی محمد کبیر الدین کی دختر اور خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے بانی خان بہادر خدا بخش کی اہلیہ ہیں۔ شعر و ادب کے باب میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ آٹھ جلدوں میں دیوان کے علاوہ 'حسن المطالب' اور 'عقد النرلین فی مناقب غوث الثقلین' کے نام سے ان کی اردو میں دو مثنویاں ملتی ہیں۔ دانش صاحب ان کی مثنویوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دونوں مثنویوں کی زبان یکساں ہے، طرز ادا میں بھی یکسانیت ہے۔ یہ مثنویاں دینی اور مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر لکھی گئی ہیں... دو میں سے کسی میں کہانی پن نہیں ہے، آغاز و عروج و انجام کا بھی التزام نہیں رکھا گیا ہے۔''

دانش صاحب نے گمنام شخصیتوں کے ساتھ ان قلم کاروں کی مثنویوں کا بھی اس میں احاطہ کیا ہے جن کے شعری کارناموں سے دنیا نا واقف ہے۔ صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، شوق نیموی، جمیل مظہری اور شمس عظیم آبادی وغیرہ ایسے ہی فن کار ہیں، جنھوں نے اپنی جودت طبع سے اردو مثنوی کو مالا مال کیا۔ دانش صاحب کی یہ کتاب بہار میں موضوع کے اعتبار سے نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ انھوں نے تحقیق کے لیے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جو انتہائی جاں گسل اور تھکا دینے والا تھا، لیکن متجس طبیعت اور علم و تحقیق سے ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے اس مرحلۂ دشوار کو انھوں نے کامیابی کے ساتھ پار کر لیا۔ اس کتاب کی بدولت بہار کے علمی اور ادبی حلقے میں انھیں اعتبار حاصل ہوا۔ مثنوی کی تحقیق سے دانش صاحب کو خاص دلچسپی تھی، اس موضوع پر ان کی تین کتابیں ہیں۔ 'بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا' کے علاوہ 'مثنوی کا فن اور بہار کی معروف مثنویاں' تیسری کتاب 'بہار میں اردو مثنوی کی تاریخ و تنقید' لیکن تینوں کتابوں کے موضوعات اور مشتملات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعد کی دونوں کتابیں پہلی کتاب کی توسیع ہیں۔

احمد حسن دانش کو شعر و سخن سے بھی گہری دلچسپی تھی 'پیکر سخن' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ شاعری کی ابتدا میں پروفیسر اختر قادری سے اصلاح لی، پھر انہی کی ایما پر آزادانہ طور پر شعر کہنے اور اسے شائع کرنے کی طرف راغب ہوئے لیکن چھپنے چھپانے کے معاملے میں زیادہ تندہی نہیں دکھلائی۔ ان کے شعری محاسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''مجھے احساس ہے کہ احمد حسن دانش اردو شاعری

کے فکری و فنی آفاق سے آگاہ ہیں، پھر ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات ہیں۔ ان کی شاعری ان کے اپنے شعور و وجدان کی مظہر ہوگی، اس کا مجھے یقین ہے۔''

ڈاکٹر احمد حسن دانش کی شاعری کی زنبیل میں غزلوں کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی شامل ہیں، لیکن ان کے تخلیقی وفور کا احساس ان کی نظموں میں زیادہ ہوتا ہے۔ برلن کی دیوار، انسانیت کی تجربہ گاہ، سوالیہ نشان اور 'اجودھا' ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں فکر و معانی کا تسلسل بھی ہے اور وحدت تاثر کی فضا بھی، جو قاری کو شروع سے آخر تک باندھے رکھتی ہے اور فنی سطح پر کسی نظم کی یہ ایک بڑی خوبی تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کی نظموں کا اختتام بھی ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ فن کہیں مجروح نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں کا اسلوبیاتی اور استعاراتی نظام بہت زیادہ دقیق اور گنجلک نہیں ہے کہ جس کی تفہیم کے لیے قاری کو زیادہ محنت کرنی پڑے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانش کی دو مختصر نظمیں ملاحظہ کیجیے۔

برلن کی دیوار
دیوار برلن
دو دلوں کے درمیان کھڑی تھی
دو دلوں کی دھڑکنوں کو بانٹتی تھی
جذبات کو چیرتی ہوئی
انسانیت کو کاٹتی تھی
اب جو دل مل گئے ہیں
دھڑکنوں کے سلسلے ایک ہو کر
جذبات کے طوفاں امڈ پڑے ہیں
اب
وہ دیوار کہاں گئی؟
مسمار ہو گئی ہے!
ایسے ہی جذبات درکار ہیں وطن کو
ایسے ہی طوفان درکار ہیں چمن کو
جو نفرتوں کو مسمار کر دے!
وطن کے دشمنوں کو سنگسار کر دے!!

اور

پیرہنِ کدورت کو چاک کر دے
پاک کو ہند اور ہند کو پاک کر دے!!

'پیکر سخن' احمد حسن دانش کے داخلی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے یہاں کہیں کہیں اچھوتی تشبیہیں بھی نظر آتی ہیں اور معانی و مفاہیم کی سطح پر جدت بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے ناقدین شعر و ادب کو احمد حسن دانش کے یہاں فنی سطح پر تازگی کی کمی محسوس ہو، لیکن

ڈاکٹر احمد حسن دانش کی شاعری کی زنبیل میں غزلوں کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی شامل ہیں، لیکن ان کے تخلیقی وفور کا احساس ان کی نظموں میں زیادہ ہوتا ہے۔ برلن کی دیوار، انسانیت کی تجربہ گاہ، سوالیہ نشان اور 'اجودھا' ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں فکر و معانی کا تسلسل بھی ہے اور وحدت تاثر کی فضا بھی، جو قاری کو شروع سے آخر تک باندھے رکھتی ہے اور فنی سطح پر کسی نظم کی یہ ایک بڑی خوبی تسلیم کی جاتی ہے۔

کلاسیکی رنگ و آہنگ اور داخلی جذبات و احساسات کی ترجمانی انھیں ضرور متاثر کرے گی۔ چونکہ 'پیکر سخن' میں معانی و مفاہیم کی وہی دنیا آباد ہے جو غزل کی روح یا جس میں غزل کی روح ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

شب غم تیرگی حد سے گزر جاتی ہے جب ہمدم
تو میں دل میں کسی کی یاد کی شمعیں جلاتا ہوں
تری نظر کی خلش دل کے پار اب بھی ہے
وہ سلسلۂ غم روزگار اب بھی ہے
وہی جو باعث جانِ حزیں ہے
وہی مرے رگ جاں کے قریں ہے

دانش صاحب کے یہاں غزل زندگی کی کہانی بھی ہے، زندگانی بھی اور واقعہ ناگہانی بھی۔ ان کے نزدیک غزل اردو شاعری کی شان اور جان ہے۔ ان کے خیال میں آشفتگی بھی ہے اور آشفتہ سری بھی اور زندگی کا عرفان بھی۔ 'پیکر سخن' کی تمام غزلوں میں ان کے یہی جذبات و احساسات نظر آتے ہیں۔ ان کی آشفتگی غزل کی شگفتگی سے مل کر غزل کو ایک نئے ذائقے، نئی لہر اور نئی روح سے آشنا کرتی ہے۔

احمد حسن دانش صاحب کی تصنیفات کی کل تعداد گیارہ ہے، دس کتابیں منزلِ اشاعت سے ہم کنار ہو چکی ہیں، ان کی آخری کتاب 'سیمانچل میں فارسی شاعری' ہے جو اب بھی اشاعت کی منتظر ہے۔

پیکر سخن (شعری مجموعہ 2011)، شمع پگھلتی رہی (افسانوی مجموعہ 2010)، جانچ پرکھ (ادبی مضامین 2015)، بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا (1989)

یہ کتاب ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس پر بہار یونیورسٹی، مظفرپور نے انھیں 1978 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔

مثنوی کا فن اور بہار کی مثنویاں (2010)، سُر سریتا (دیوناگری میں، اردو، ہندی غزلوں کا مجموعہ)، پورنیہ کا ساہتیک بھوگول (ادبی جغرافیہ، قدیم پورنیہ کی منظوم ادبی تاریخ)، جگ مگ دیپ جلے (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ، دیوناگری رسم الخط - 2021)، سیمانچل میں اردو شاعری (تاریخ و تنقید - 2019)، علامہ اقبال کے اردو کلام میں قرآن و حدیث کی ترجمانی (2021)، سیمانچل میں فارسی شاعری (غیر مطبوعہ)

پروفیسر احمد حسن دانش کا ارتکاز سیمانچل پر تھا۔ انھوں نے وہاں کے گمنام شاعروں ادیبوں کی خدمات سے ادبی دنیا کو متعارف کروایا۔ سیمانچل میں اردو شاعری کی مختصر تاریخ' لکھ کر وہاں کے شاعروں کو ادب کے مین اسٹریم سے جوڑنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سیمانچل اور وہاں سے متعلق متعدد ادبی شخصیتوں کے علمی اور تخلیقی کارناموں پر اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کروا کر سیمانچل کے لوگوں پر احسان کیا ہے۔ انھوں نے جن شخصیات پر تحقیق کروائی وہ درج ذیل ہیں:

مولانا عیسیٰ فرتاب: حالات اور شاعری (ڈاکٹر فرحت آرا) مثنوی ہر مزنامہ: ترتیب و تدوین (ڈاکٹر محمد ہاشم)، حکیم رکن الدین دانا کی ادبی خدمات (ڈاکٹر غلمان یزدانی)، مولوی سلیمان: حیات و خدمات (ڈاکٹر کلیم اللہ)، سرسید احمد خان کا اردو ادب میں مقام (ڈاکٹر ممتاز عالم)، اردو شاعری میں قدیم پورنیہ کی خدمات (ڈاکٹر عنصری بدر)، ڈاکٹر سلام سندیلوی: حیات اور شاعری (ڈاکٹر شاہینہ پروین)، ڈاکٹر سلام سندیلوی کی نثری خدمات (ڈاکٹر شبانہ پروین)، پروفیسر طارق جمیلی کی ادبی خدمات (ڈاکٹر سجاد اختر)، پورنیہ کے فارسی شعرا و ادبا (ڈاکٹر نسیم اختر)، اکمل یزدانی کی ادبی خدمات (ڈاکٹر شہنواز بابل)، سیمانچل میں اردو فکشن (ڈاکٹر شازیہ نسرین)

پروفیسر احمد حسن دانش کی علمی شخصیت کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا۔ ان کے علمی کارناموں پر ڈاکٹر محمد فرقان (سہرسہ) نے بی این منڈل یونیورسٹی مدھیپورہ میں 2021 میں 'احمد حسن دانش: حیات و ادبی خدمات' کے عنوان پر اپنا تحقیقی مقالہ جمع کیا جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر احمد حسن دانش کو ان کی کئی تصنیفات پر بہار اردو اکادمی نے اپنے گراں قدر انعامات سے بھی نوازا۔

■

Dr. Noman Qaisar
C-66, First Floor, Front Side
Shaheen Bagh, Jamia Nagar Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 813064324
Email.: noman.qaisar@gmail.com

اویس احمد

کافکا کا اکلوتا وارث

’میلان کنڈیرا‘

میلان کنڈیرا یکم اپریل 1929 کو برنو، چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لڈوک کنڈیرا چیک موسیقار تھے؛ انھوں نے ایک چیک موسیقی کار لیوجینک سے موسیقی سیکھی تھی اور اُن ہی سے پیانو بجانا بھی سیکھا تھا۔ لیوجینک 1948 سے 1961 تک برنو موسیقی اکادمی کے سرپرست تھے۔ کنڈیرا کو بھی چھوٹی عمر ہی سے موسیقی سکھائی گئی تھی۔ انھوں نے اپنے والد سے پیانو بجانا بھی سیکھ لیا تھا۔ بعد میں انھیں باقاعدہ موسیقی کی تعلیم دلوائی گئی۔ کنڈیرا پر موسیقی کا اتنا اثر رہا کہ جان کولک کے بہ قول وہ اثر اُن کی تحریروں پر بھی نمایاں طور پر دیکھا گیا۔ انھوں نے 1948 میں برنو میں سیکنڈری اسکول مکمل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے آرٹس فیکلٹی، چارلس یونیورسٹی سے ادب اور جمالیات میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ فلم اکادمی منتقل ہوئے جہاں انھوں نے فلم ہدایت کاری اور اسکرپٹ رائٹنگ کی کلاسز لیں۔ جان کولک کے مطابق اس کے بعد کچھ ایسا ہوا کہ کنڈیرا کو چند سیاسی وجوہات کی بنیاد پر پڑھائی کے سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔ بہر صورت گریجویشن کے بعد بہ حیثیت لیکچرر ان کا تقرر فلم اکادمی کے عالمی ادب میں ہوا۔ کنڈیرا چیکوسلواکیہ کے ان نوجوانوں میں سے تھے جو عالم گیر جنگ سے پہلے چیکوسلواکیہ سے پوری طرح آشنا نہیں تھے۔ ان کی فکری نشوونما دراصل دوسری عالم گیر جنگ کے تجربے اور

جرمنی کے قبضے سے متاثر ہو کر ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر جرمنی مطلق العنانیت کی فکر گرچہ دھندلے حقائق کے ساتھ ہی سہی، رچ بس گئی۔ اسی فکر نے انھیں مارکس واد اور کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کرنے کی ترغیب دلائی۔ اس طرح کنڈیرا نے نوعمری ہی میں یعنی 1948

میں چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت ان کی عمر محض 19 سال تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ کنڈیرا کا تعلق عجیب و غریب اور پیچیدہ تھا۔ کیونکہ 1948 میں کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے دو سال بعد ہی یعنی 1950 میں ان کے دوست جان ترافلکا سمیت ’پارٹی مخالف سرگرمیوں‘ کی وجہ سے پارٹی سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ پارٹی سے اس طرح کی بے دخلی سے اگر چہ وہ بہت حد تک متاثر ہوگئے؛ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہی بے دخلی ان کے پہلے سوانحی ناول ’دی جوک‘ 1967 کی تحریک بنی۔ اسی بے دخلی کو کنڈیرا کے دوست تریفلا

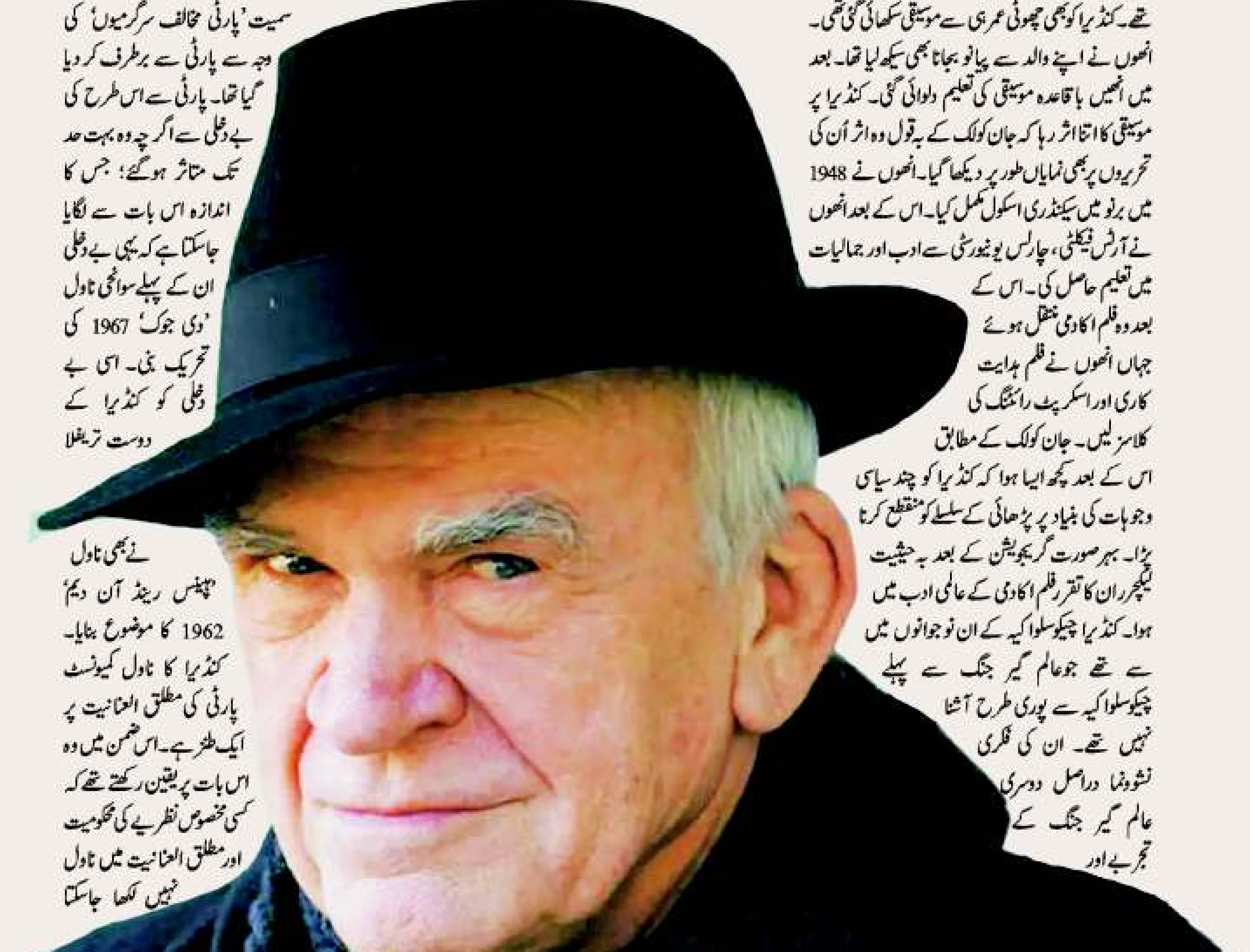

نے بھی ناول ’چانس رینڈ آن دیم‘ 1962 کا موضوع بنایا۔ کنڈیرا کا ناول کمیونسٹ پارٹی کی مطلق العنانیت پر ایک طنز ہے۔ اس ضمن میں وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کسی مخصوص نظریے کی محکومیت اور مطلق العنانیت میں ناول نہیں لکھا جاسکتا

ہے لیکن اُن کے نزدیک دنیا میں ناول ہی کی سب سے زیادہ ضرورت بھی ہے۔ مذکورہ بالا ناول کے علاوہ ان کے کئی ناول منصۂ شہود پر آئے:۔ لائف از ایلس ویئر 1969، دی فیئر ویل والٹز 1972، خندہ اور فراموشی کی کتاب 1979، وجود کی ناقابل برداشت لطافت 1984، بقائے دوام 1988، سلونیس 1995، پہچان 1998، اگنورینس 2000، دی فیسٹیویل آف سگنی فی کینس 2014 وغیرہ جیسے ناول شائع ہوئے۔

1956 میں کنڈیرا نے دوبارہ پارٹی میں شمولیت اختیار کی؛ لیکن 1970 میں دوسری بار انھیں نکال دیا گیا۔ کنڈیرا اپنی ہی ذات کے حصار میں بند رہتے تھے۔ یعنی وہ اپنی ذاتی زندگی کو کسی راز سے کم تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں کسی کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی رویہ ان کے یہاں ادب کی تخلیقیت بھی تھا کہ وہ خارجی عناصر کی دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔ اس بنیاد پر انھیں چیک ساختیات کے نظریے کا حامی قرار دیا گیا؛ جن کے نقطہ نظر سے ہر ادبی متن کی تشکیل انفرادی معیارات پر ہونی چاہیے۔ وہ نہیں چاہیے تھے کہ ان کی ذاتی زندگی سے ہر کس و ناکس واقف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تعارف کو دو جملوں پر مشتمل پسند کرتے تھے کہ ''میلان کنڈیرا 1929 میں چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوئے اور 1975 سے فرانس میں رہ رہے ہیں۔'' اس تناظر سے فلپ روتھ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''مجھے یونیورسٹی سے بے دخل کر دیا گیا۔ میں محنت کشوں کے درمیان رہا ہوں۔ اس وقت میں ایک جاز بینڈ کے ساتھ ٹرمپٹ بجاتا تھا۔ میں اکثر پیانو بجاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے شاعری کے ساتھ ساتھ مصوری کی۔ لیکن سب لایعنی تھا۔'' اس طرح انھوں نے 1950 اور 1960 کے درمیان لکھی گئی ہر تحریر کو 'ناپختہ' اور 'ناکامیاب' تصور کرتے ہوئے رد کر دیا۔ اس تعلق سے خالد جاوید کا خیال ہے کہ بعد میں اُن میں زیادہ پختگی آئی اور ان کا ذہن اب اُن تمام بندشوں یا تعصبات سے آزاد ہو چکا تھا؛ جو ان کے ابتدائی دنوں میں کسی نہ کسی طور پر موجود تھے۔ اس تعصب اور بندش کی ایک وجہ ان کی کمیونسٹ پارٹی میں شرکت بتائی جاتی ہے۔ اصل میں ہوا یوں کہ وہ 1967 میں جب کمیونسٹ نظام سے مایوس ہو گئے تو اُنھوں نے ایک کانفرنس میں ادیبوں کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے علاحدہ چیک شناخت کے تحفظ کی اہمیت پر زور دیا؛ جو صرف اس صورت میں ممکن تھا جب چیک ادب اور ثقافت کو مکمل آزادی کے ساتھ ترقی کی اجازت دی جا سکتی تھی۔ جب ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں 'سماجی حقیقت پسندی' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انھوں نے سیاسی پروپیگنڈے کو ایک تھیم کے طور پر مسترد کرنے کا رجحان پیدا کیا اور اُس کے برعکس انسانی تجربے اور انسانی قدروں کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کی شاعری میں مارکسی نظریے کا عکس اگرچہ واضح ہے لیکن مارکسی فکر کے کٹرپن سے بہرصورت آزاد ضرور ہے جو کہ اس وقت کی شاعری کا ایک جزو لاینفک تھا۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک محض پرولتاری طبقہ، طبقاتی جدوجہد اور سماجی حقیقت نگاری ہی سب کچھ نہیں ہے؛ بلکہ انھوں نے اپنی شاعری بالخصوص نظموں میں انسانی قدروں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ 'مین: اے وائڈ گارڈن 1953، دی لاسٹ مئی 1955، مونولاگ 1957 کے عنوان سے ان کے شعری مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ بعد میں انھوں نے اسی نوعیت کے ڈرامے بھی تحریر کرنے شروع کیے۔ یہ ڈرامے اسٹیج بھی کیے گئے اور خاصے مقبول بھی ہوئے۔ اس ضمن میں ان کے کئی ڈرامے جیسے دی آنرس آف دی کیز 1962، ٹو ایئرس ٹو ویڈنگس 1968، دی بلنڈر 1969 شائع ہوئے۔ بہرکیف کنڈیرا نے بہ حیثیت ادیب اپنی زندگی کے 30 سالوں کو رد کر دیا۔ یہ کنڈیرا جیسے ادیب کے لیے کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کیوں کہ اس وقت تک گمنام ہی سہی لیکن ایک چیک دانشور کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس ضمن میں وہ کہانیوں کے مجموعے 'مضحکہ خیز محبتیں' ہی کو اپنی پہلی تصنیف گردانتے ہیں۔ کہانیوں کا یہ مجموعہ 1958 سے 1968 کے درمیان لکھی گئی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ بہ حیثیت ایک ادیب اُن کی نئی ادبی زندگی کا آغاز اسی تصنیف سے ہوا ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ 'دی اپولو جائزز' کے عنوان سے 2015 میں ایک اور افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

کنڈیرا کش مکشِ زندگی میں عجیب طرح سے اسیر ہو گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے ہی اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ انھیں نہ صرف کمیونسٹ پارٹی سے بلکہ تدریسی عہدے سے بھی برخاست ہونا پڑا۔ درحقیقت وہ پارٹی میں کچھ تبدیلیوں کے خواہاں تھے؛ جس کے لیے اُنھوں نے اپنے دوست پال کو ہوت کے ساتھ کوششیں کیں۔ اس طرح کے بدلاؤ کو انھوں نے 'پراگ اسپرنگ' کے تحت انجام دینے کی کوشش کی۔ واضح رہے کہ 'پراگ اسپرنگ' ایک تحریک تھی جس کے سائے میں کمیونسٹ نظریے میں کنڈیرا جیسے ادیب چند فکری تبدیلیوں کے لیے کوشاں تھے۔ لیکن روس کے حملے کی وجہ سے یہ تحریک زوال کا شکار ہو گئی۔ تحریک کے زوال کے ساتھ ہی کنڈیرا کے حوصلے نہ صرف پست ہوئے بلکہ انفرادی سطح پر بھی انھیں تحریک کی زوال پذیری کا خمیازہ بھگتنا پڑا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں پراگ فلم اکیڈمی سے اس کے تدریسی عہدے سے بھی برخاست کر دیا گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی کتابوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ کتب فروشوں اور کتب خانوں سے ان کی کتابوں کی تمام کاپیاں واپس لے لی گئیں۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد انھیں اس بات کا فائدہ تو ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے بہ حیثیت مصنف مکمل آزادی کے ساتھ لکھنا شروع کیا؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب کوئی سنسر اُن کی کتابیں نہیں پڑھے گا۔ اس طرح 1975 میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ فرانس ہجرت کر گئے جہاں انھوں نے رینس یونیورسٹی میں پڑھایا۔ ہجرت کے بعد انھوں نے 'خندہ اور فراموشی کی کتاب' کے عنوان سے ناول لکھا؛ جس میں انھوں نے چیکوسلواکیہ میں رہتے ہوئے اپنے تلخ تجربات کو موضوع بنایا۔ لیکن اس ناول کے پیش نظر کنڈیرا کو چیکوسلواکیہ کی شہریت کو گنوانا پڑا۔ فرانس میں رہ کر ہی انھوں نے اپنا شاہکار ناول 'وجود کی ناقابل برداشت لطافت' شائع کیا۔ اس ناول کو بین الاقوامی سطح پر کافی سراہا گیا اور اسے کنڈیرا کا شہرہ آفاق ناول تسلیم کیا گیا۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں یہ ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ کنڈیرا کی شہرت کا ڈنکا تو 'خندہ اور فراموشی کی کتاب'

کنڈیرا کش مکشِ زندگی میں عجیب طرح سے اسیر ہو گئے تھے۔ اُنھیں نہ صرف کمیونسٹ پارٹی سے بلکہ تدریسی عہدے سے بھی برخاست ہونا پڑا۔ درحقیقت وہ پارٹی میں کچھ تبدیلیوں کے خواہاں تھے؛ جس کے لیے اُنھوں نے اپنے دوست پال کو ہوت کے ساتھ کوششیں کیں۔ اس طرح کے بدلاؤ کو انھوں نے 'پراگ اسپرنگ' کے تحت انجام دینے کی کوشش کی۔

کنڈیرا فرانز کافکا سے بہت حد تک متاثر تھے۔شاید اسی لیے کارلیوس فیونتیس نے انھیں 'کافکا کا اکلوتا وارث' کہا تھا۔ اپریل 2023 میں 'اے کڈنیپڈ ویسٹ' کے عنوان سے میلان کنڈیرا کی آخری کتاب شائع ہوئی؛ جس میں ولادیمیر پوتن کی طاقت کو بے اثر کرنے میں وسطی یورپ کے کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنی حیرت انگیز تحریروں سے عالمی شہرت حاصل کرنے والے ادیب میلان کنڈیرا 12 جولائی 2023 کو فوت ہوئے۔

کے بعد ہی سے بجنے لگا تھا۔اس کے بعد ان کا شمار نہ صرف دنیا کے بڑے ادیبوں میں ہونے لگا بلکہ یورپ کی ہر بڑی زبان میں ان کی تحریروں کے ترجمے ہونے لگے تھے۔

انسانی رشتوں پر کنڈیرا کی تنقید کمیونسٹ نظام پر تنقید کے ساتھ راست طور پر جڑی ہوئی ہے، جس نے انھیں اس وقت کافی غیر معمولی شہرت دلوادی۔کنڈیرا کے ناول اس لیے مقبول ہیں کیونکہ وہ مخصوص تناظر کے ساتھ کرداروں کو ایک طرح کی آفاقیت عطا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ بہرصورت کنڈیرا چیک زبان میں لکھتے تھے لیکن جیسے ہی وہ فرانس منتقل ہوئے تو انھوں نے 1993 کے بعد فرانسیسی زبان میں لکھنا شروع کیا۔لیکن اس سے پہلے ان کی کتابوں کے جو ترجمے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ہوئے؛ کنڈیرا ان سے مطمئن نہیں تھا۔ اس ضمن میں خالد جاوید کا یہ خیال ہے کہ ''کنڈیرا کا پریشان ہونا جائز تھا کیونکہ وہ اس قسم کا ناول نگار نہیں ہے جن کے یہاں کہانی یا واقعے کی ہی اہمیت ہوتی ہے۔ کنڈیرا جس قسم کا بیانیہ لکھتا ہے یا کہنا چاہیے کہ بیانیے میں توڑ پھوڑ کرتا ہے، لفظ کو جس سیاق وسباق میں استعمال کرتا ہے، ان سب کا ترجمہ کرنا بے حد عرق ریزی کا کام ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ کنڈیرا نے 1985 اور 1987 کے درمیان اپنی پہلی تحریروں کے فرانسیسی اور انگریزی تراجم کی نظر ثانی پر کام کیا۔ کیوں کہ اُنھوں نے اپنی کتابوں کے ترجمے ناقص اور اصل متن سے بھی دور پائے۔ ان کی کئی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں؛ جن کی اصل زبان چیک یا فرانسیسی ہے۔ یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان کا بیانیہ کس طرز کا ہے۔؟ خالد جاوید کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بہر صورت کنڈیرا کے حق میں ہمیں یہ بات تسلیم کرنا ہی پڑتی ہے کہ کنڈیرا کے یہاں بیانیہ کا عمل پیچیدہ ہے۔ بیانیہ کا عمل ہی کیوں بلکہ ان کے یہاں تو ناول کا تصور بھی عامیانہ نہیں ہے۔ کنڈیرا نے اپنی کتاب 'ناول کا فن' میں ناول کے فن پر اظہار خیال کیا ہے۔ کنڈیرا کے تصور ناول پر ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ ''کنڈیرا جس ناول کی بات کرتا ہے، وہ کوئی سادہ، دل چسپ کہانی پر مبنی ناول نہیں بلکہ اسے وہ کہیں 'پولی فونی' اور کہیں 'پولی ہسٹوریکل' کہتا ہے۔ ایسا ناول جس میں کئی متضاد چیزیں یک جا ہوتی ہیں، جس میں نہ تو انسانی وجود کی کوئی ایک حالت منکشف کی جاتی ہے، نہ زندگی کا محض ایک پہلو۔ نیز اس میں اصناف کی حدیں پگھلا دی جاتی ہیں: شاعری، تاریخ، آپ بیتی، فلسفہ، مضمون سب ناول کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس ادیب کے یہاں ناول کا تصور بھی پیچیدہ ہے؛ اس کے بیانیے میں بہ قول خالد جاوید ''توڑ پھوڑ ایک فطری عمل ہے۔'' کنڈیرا نے اپنی کتابوں کے ترجمے حیرت انگیز پائے؛ جیسے: مترجم نے اسلوب کی نقل کرتے ہوئے پورا ناول ہی گویا نئے سرے سے لکھ ڈالا، کئی فکری عبارتیں مترجم نے اپنی تن آسانی کے لیے حذف کردیں، موسیقی پر مشتمل ابواب بھی نکال باہر کردیے گئے وغیرہ وغیرہ۔ چلیے ان تراجم کے حق میں اتنا تو اچھا ہوا کہ کنڈیرا نے ان پر نہ صرف نظر ثانی کی بلکہ نئے تراجم ان کی نگرانی میں ہونے لگے۔ اب سوال اردو تراجم کا ہے۔ کیا اردو کے تراجم سے کنڈیرا مطمئن تھے؟ یا ہوسکتے تھے۔؟ بہر کیف کنڈیرا کئی بار ادب کے نوبل انعام کے لیے نامزد ہو چکے۔ 2019 میں ان کی چیکوسلواکیہ کی شہریت بحال کر دی گئی اور 2020 میں انھیں ان کے آبائی ملک کے ممتاز فرانز کافکا انعام سے نوازا گیا۔ بھلے ہی کنڈیرا جیسے ادیب کو نوبل انعام نہیں ملا؛ لیکن یہ بھی ایک آفاقی حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادیب محض کسی بڑے انعام کی بدولت زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اگر اُسے کوئی چیز زندہ رکھ سکتی ہے تو وہ اس کی 'داخلی آزادی' اور 'سچائی' ہے۔ کنڈیرا نے ادبی دنیا کو ایسی بصیرتوں سے روشناس کرایا جن کی اہمیت عالم گیر ہے اور سچائی سے بڑی کوئی عالم گیر بصیرت نہیں ہوسکتی ہے۔

اگرچہ کنڈیرا کی ابتدائی شاعری کیمونسٹ نظریے کی حامی نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس بات پر مصر تھے کہ وہ سیاست کا ڈنڈھورچی نہیں بلکہ محض ایک مصنف ہے۔ فلسفیانہ موضوعات کے علاوہ 'وجود کی ناقابل برداشت لطافت' کی اشاعت کے بعد سیاسی موضوعات ان کے ناولوں سے گویا غائب ہی ہوگئے۔ کنڈیرا کی افسانہ نگاری کا اسلوب جو فلسفیانہ ارتکاز سے جڑا ہوا تھا؛ رابرٹ موسل کے ناولوں اور نطشے کے فلسفے سے بہت متاثر تھا۔ مزید اس پر لارنس سٹرن، ہنری فیلڈنگ، ڈینس ڈیڈروٹ، رابرٹ موسل، وینولڈ گومبروکز، ہرمن بروچ، فرانز کافکا اور مارٹن ہائیڈیگر کے واضح اثرات ملتے ہیں۔

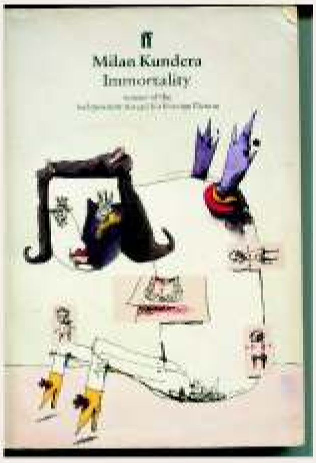

کنڈیرا کو اس کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا۔ 1985 میں انھیں یروشلم پرائز ملا۔ اسی طرح 1987 میں یورپی ادب کا آسٹرین اسٹیٹ پرائز جیتا۔ 2000 میں انھیں بین الاقوامی ہرڈر پرائز سے نوازا گیا۔ 2007 میں انھیں چیک اسٹیٹ لٹریچر پرائز سے نوازا گیا۔ 2010 میں کنڈیرا کو ان کے آبائی شہر برنو کا اعزازی شہری بنادیا گیا۔ 2011 میں انھوں نے Ovid پرائز حاصل کیا۔ 2020 میں انھیں فرانز کافکا انعام سے نوازا گیا؛ جو کہ ایک چیک ادبی ایوارڈ ہے۔ کنڈیرا فرانز کافکا سے بہت حد تک متاثر تھا۔ شاید اسی لیے کارلیوس فیونتیس نے انھیں 'کافکا کا اکلوتا وارث' کہا تھا۔ اپریل 2023 میں 'اے کڈنیپڈ ویسٹ' کے عنوان سے میلان کنڈیرا کی آخری کتاب شائع ہوئی؛ جس میں ولادیمیر پوتن کی طاقت کو بے اثر کرنے میں وسطی یورپ کے کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنی حیرت انگیز تحریروں سے عالمی شہرت حاصل کرنے والے ادیب میلان کنڈیرا 12 جولائی 2023 کو فوت ہوئے۔

■

Dr. Owais Ahmad Bhat
Asst. Professor, Deptt. of Urdu
Kashmir University
Phone: 9149958892

عربی ادب میں سفرنامہ نگاری کی روایت

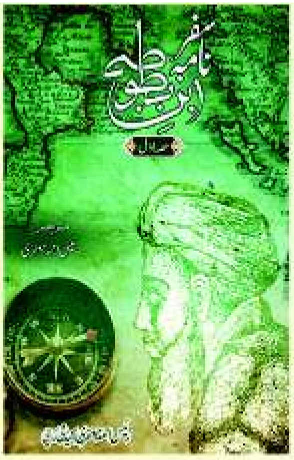

ثمامہ فیصل

عربوں میں زمانۂ قدیم سے سفر کا عام رجحان پایا جاتا تھا، ظہور اسلام سے قبل اہل عرب سفر کیا کرتے تھے لیکن اپنے سفرناموں کو انھوں نے تحریری شکل میں مرتب نہیں کیا۔ قرآن کریم میں بھی عربوں کے موسم سرما اور موسم گرما میں مختلف علاقوں کی طرف ہونے والے سفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ عرب قوم دراصل ایک بدو اور خانہ بدوش قوم تھی اور اکثر ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونا اس کی ضروریات زندگی میں شامل تھا۔ البتہ سبھی عرب باشندے اس انداز کی زندگی نہیں گزارتے تھے بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو شہروں میں مستقل طور پر آباد تھے اور مختلف اغراض ومقاصد کے لیے وقتاً فوقتاً سفر پر نکلا کرتے تھے۔

عربی زبان میں سفرنامہ لکھنے کی روایت باقاعدہ طور پر تیسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا عرب مصنف جس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی وہ ابن خرداذبہ تھا۔ اس کا پورا نام ابوالقاسم عبیداللہ بن احمد تھا۔ خرداذبہ دراصل اس کے دادا کا نام تھا جو اصلاً ایک مجوسی تھا اور اس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ابن خرداذبہ کا تعلق عراق سے تھا۔ اس کی پیدائش 205ھ (877) میں اور وفات 280ھ (893) میں ہوئی تھی۔ اس کی کتاب المسالک والممالک جو اس نے 262ھ میں لکھی تھی اس موضوع پر لکھی جانے والی عربی کی اولین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔

اسی دور یعنی تیسری صدی ہجری کا ایک اور عرب سیاح سلام الترجمان بھی کافی مشہور ہے۔ اس کا تعلق بھی عراق سے تھا اور عباسی خلیفہ الواثق باللہ نے اسے چین کے سفر پر روانہ کیا تھا تاکہ وہاں جاکر وہ قرآن میں یاجوج ماجوج کے قصے میں مذکور ذوالقرنین کے ہاتھوں تعمیر کردہ دیوار کا پتہ لگائے اور اپنے اس سفر کے حالات کو قلم بند کرے۔

تیسری صدی ہی کا ایک اور عرب سیاح بہت مشہور ہوا جو سلیمان التاجر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تجارت اس کا پیشہ تھا اور وہ چین اور ہندوستان کا تجارتی سفر کیا کرتا تھا اسی لیے اس کے نام کے ساتھ التاجر لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنا جو سفرنامہ لکھا وہ عربی زبان میں ہندوستان کا پہلا سفرنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

عباسی دور اسلامی تاریخ کے عروج کا دور تھا۔ اسے اسلامی تاریخ کا سنہری دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں عربوں نے ہر میدان میں ترقی کی اور مختلف علوم وفنون میں بے شمار قیمتی کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ سفرناموں کے باب میں بھی انھوں نے خوب طبع آزمائی کی۔

چوتھی صدی ہجری میں بہت سی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ لیکن اس صدی کی اس فن پر لکھی گئی زیادہ تر تصانیف پر جغرافیائی اور تحقیقی رنگ غالب تھا۔ چنانچہ وہ سفرنامے کم اور علم جغرافیہ کی کتابیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس دور کے مشہور اہل قلم جنھوں نے اس موضوع پر لکھا ان میں ابن فضلان کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ابن فضلان نے عباسی خلیفہ المقتدر باللہ کے دور حکومت میں بلغاریہ وغیرہ کا سفر کیا اور اپنا سفرنامہ تصنیف کیا۔ اس دور کے دیگر مصنفین میں ابن حوقل، المقلبسی، الاصطخری، ابو زید البلخی اور المسعودی وغیرہ قابل ذکر ہیں جنھوں نے دراصل علم جغرافیہ پر بیش قیمت کتابیں لکھیں لیکن کہیں نہ کہیں ان کا تعلق سفرناموں کے ادب سے بھی تھا۔

اب سفرنامہ لکھنے میں عرب قوم کو اچھا خاصا تجربہ اور خاطر خواہ مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد کچھ ایسے عرب سیاح سامنے آئے جن کی مثال سفرناموں کے ادب کی پوری تاریخ میں ملنا مشکل ہے، جنھیں اس میدان کا اگر شہسوار کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ پانچویں صدی ہجری میں البیرونی نے اپنا ہندوستان کا سفرنامہ لکھا، چھٹی صدی ہجری میں ابن جبیر نے اور آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ اور ابن خلدون نے اپنے سفرنامے لکھے۔ ان میں بطور خاص سفرنامہ ابن بطوطہ اور سفرنامہ ابن جبیر کو عالمی سطح پر بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں سفرنامے دنیا کے چند بہت ہی عمدہ سفرناموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سطور ذیل میں ان چاروں سفرناموں کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

سفرنامہ ابن بطوطہ

ابن بطوطہ کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ تھا۔ اس کی پیدائش مراکش کے شہر طنجہ میں 703ھ (1304) میں ہوئی تھی اور وفات 779ھ (1379) میں ہوئی۔ ویسے تو اس کو کئی علوم وفنون جیسے تاریخ، جغرافیہ، علم شریعت اور فقہ وغیرہ میں کمال حاصل تھا، لیکن سفرناموں کے میدان میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ عرب وعجم اور مشرق ومغرب کے تمام بڑے مؤرخین اور محققین نے ابن بطوطہ کے سفرنامے کو ایک بے مثال سفرنامہ قرار دیا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنی زندگی کے کم وبیش تیس سال سیر وسیاحت میں گزارے۔ اس نے اکیس سال کی عمر میں 725ھ (1325) میں اپنے وطن طنجہ کو الوداع کہا اور تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کلومیٹر کا سفر کیا اور 'تحفۃ النظار' کے نام سے اپنا سفرنامہ تصنیف کیا جو سفرنامہ ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہوا۔

سفرنامہ ابن بطوطہ کو چار مختلف مراحل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جسے اس نے سفر حج کے ارادہ سے شروع کیا۔ وہ سفر حج کی ادائگی کے لیے اپنے وطن طنجہ سے روانہ ہوا اور الجزائر، تونس اور مصر سے گزرتے ہوئے بحر احمر کے راستے حجاز پہنچا اور فریضۂ حج ادا کیا۔ پھر اپنے اس سفر کو جاری رکھتے ہوئے عراق اور بلاد فارس کا رخ کیا جہاں اس نے تبریز، نجف، بصرہ، اصفہان، شیراز اور خلافت عباسیہ کے دارالسلطنت بغداد کی زیارت کی۔ بغداد اور عراق کے مختلف مقامات پر ہلاکو خان نے جو تباہی مچائی تھی اس کا ذکر بھی ابن بطوطہ نے اپنے اس سفرنامے میں کیا ہے۔

اپنے سفر کے دوسرے مرحلے میں اس نے مشرقی افریقہ کا رخ کیا اور صومالیہ اور کینیا کے مختلف شہروں بطور خاص مقدیشو اور مومباسا کا سفر کیا اور وہاں کے حالات وواقعات ذکر کیے۔

تیسرے مرحلے میں اس نے ترکی، وسط ایشیا، قسطنطنیہ، بخارا، سمرقند اور افغانستان وغیرہ کا رخ کیا۔ اسی سفر کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ملک ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت میں دہلی کے قاضی کا عہدہ سنبھالا۔ شمالی ہند میں ایک طویل مدت گزار کر سلطان کی اجازت سے چین کے لیے رخت سفر باندھا اور اس کے لیے پہلے جنوبی ہند کا رخ کیا۔ کیرلا سے ہوتے ہوئے مالدیپ پہنچا اور وہاں کچھ وقت گزارا۔ پھر سری لنکا، چٹاگانگ، سوماترا اور ویتنام ہوتے ہوئے چین کی سرحد میں داخل ہوا اور وہاں کچھ وقت گزار کر واپس اپنے وطن کا رخ کیا۔ اس سفرنامے کا چوتھا اور آخری حصہ اندلس، مالی اور ٹمبکٹو وغیرہ کے سفر پر مشتمل ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں بطور خاص ان مساجد، مزارات اور مقبروں کا ذکر کیا ہے جہاں اہل علم ومعرفت اور صوفیا حضرات گوشہ نشین ہوا کرتے تھے اور لوگ وہاں جاتے تھے تاکہ ان سے ملاقات کی سعادت اور استفادے کا شرف حاصل ہو سکے۔ ابن بطوطہ نے امرا وسلاطین کے حالات، ان کے عادات واطوار اور ان کے طرز حیات کا بھی اپنے سفرنامے میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ مختلف قوموں کے رہن سہن، بودوباش اور خوردونوش کے طریقوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بہت سے عجیب وغریب واقعات اور قصے بھی بیان کیے ہیں جن میں سے کچھ کے حقیقت سے دور ہونے کا مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے۔ بہرحال یہ سفرنامہ عرب قوم کی تاریخ بلکہ پورے عالم کی تاریخ میں آج تک لکھے گئے سب سے عمدہ سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت ہمیشہ کی طرح آج بھی باقی ہے۔ بہت سی فلمیں اور ٹی وی سیریلز بھی اس سفرنامے پر تیار کیے گئے ہیں اور بہت مقبول بھی ہوئے ہیں۔ اس سفرنامے کا دنیا کی تقریباً سبھی مشہور زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

سفر نامہ ابن جبیر

ابن جبیر کا پورا نام ابوالحسن محمد بن احمد ابن جبیر تھا۔ اس کی پیدائش 540ھ میں اندلس کے شہر بلنسیہ میں ہوئی تھی۔ غرناطہ کے امیر ابو عثمان سعید بن عبد المومن کے دربار میں اس نے کچھ دن اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی دوران اس نے حج کرنے کا ارادہ کیا اور سفر کی تیاری شروع کردی۔ 578ھ (1183) میں اس نے اس سفر کے لیے رخت سفر باندھا اور شہر غرناطہ سے روانہ ہوا۔ بحر قلزم کے راستے مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پہنچا۔ پھر وہاں سے خشکی کے راستے حجاز تک کا سفر طے کیا اور فریضۂ حج ادا کیا۔ پھر عراق اور بلاد شام کا رخ کیا اور صقلیہ ہوتے ہوئے واپس اپنے وطن اندلس کا رخ کیا۔

اس نے اپنا سفرنامہ دراصل امیر غرناطہ کی خدمت میں اپنے حالات سفر کی روداد پیش کرنے کے لیے لکھا تھا۔ اس نے جس دور میں بلاد شام کا سفر کیا یہ وہی دور تھا جب اس خطے میں صلیبی جنگ جاری تھی چنانچہ اس نے اپنے اس سفرنامے میں شام کے مسلمانوں کے حالات کے ساتھ ساتھ صلیبی فوجوں اور عیسائی قوم کے حالات بھی ذکر کیے ہیں۔ دیگر سفرناموں کے مقابلے میں اس سفرنامے پر ادبی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ خاص طور سے سفرنامہ ابن بطوطہ کے مقابلے میں سفرنامہ میں ہمیں بہت زیادہ تفصیل اور غیر ضروری معلومات نہیں ملتی۔ اسی طرح جس قسم کی مبالغہ آرائی ہمیں سفرنامہ ابن بطوطہ میں نظر آتی ہے اس سے بھی یہ سفرنامہ کافی حد تک محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ ابن جبیر اگرچہ سفرنامہ ابن بطوطہ جتنا دلچسپ نہیں ہے اور اس قدر مشہور بھی نہیں ہے لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

البیرونی کا سفر نامۂ ہند

ابو ریحان البیرونی کی پیدائش 362ھ (973) میں خوارزم کے علاقے میں ہوئی اور وفات 440ھ (1048) میں ہوئی۔ وہ کئی علوم وفنون میں ماہر تھا جن میں خاص طور پر فلسفہ، علم فلک، تاریخ اور علم نباتات قابل ذکر ہیں۔ اس کو مختلف زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ وہ عربی، فارسی، خوارزمی، یونانی، سریانی اور سنسکرت زبانوں کی بہت اچھی معلومات رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف کی تعداد 180 سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کی سب سے مشہور تصنیف 'تحقیق ما للھند' ہے جو کتاب الہند کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اور اسی کتاب میں اس نے اپنے سفر ہند کا ذکر کیا ہے جس پر گفتگو کرنا یہاں مقصود ہے۔

البیرونی سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا اور ایک طویل مدت اس نے یہاں گزاری تھی۔ اس نے یہاں کی قدیم زبان سنسکرت سیکھی اور یہاں کے مذاہب اور تہذیب وثقافت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے اس علمی سفر کو نہایت عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اس کتاب کی شکل میں تصنیف کیا۔

سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر 17 مرتبہ حملہ کیا تھا اور 13 مرتبہ البیرونی اس کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا۔ البیرونی نے ہندوستانی تہذیب وثقافت، ہندو قوم کے طرز حیات، رسم ورواج، عادات واطوار، عقائد وعبادات وغیرہ کا تفصیل سے اپنی اس کتاب میں جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے طبقاتی نظام پر بھی گفتگو کی ہے۔ ہندو مذہب، اسلام، نصرانیت اور فلسفۂ یونان کے عقائد وتعلیمات کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ البیرونی نے اپنے سفرنامے میں سنسکرت زبان اور اس کے رسم الخط کا بھی ذکر کیا ہے۔ البیرونی کے اس سفرنامے میں فلسفۂ ادیان کے مباحث اس قدر غالب ہیں کہ اسے اگر اسی صنف کی ایک کتاب کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ لیکن عرب ناقدین نے اس کا ذکر سفرناموں کے ذیل میں ہی کیا ہے۔

سفرنامہ ابن خلدون

ابن خلدون کا اصل نام عبد الرحمٰن تھا۔ اس کی پیدائش تونس میں 732ھ (1332) میں ہوئی اور وفات 808ھ (1406) میں ہوئی تھی۔ اس کا سفرنامہ بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی مانی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کی مایہ ناز تصنیف مقدمہ ابن خلدون ہی اس کا سب سے اہم کارنامہ مانا جاتا ہے۔ مقدمہ ابن خلدون دراصل تاریخ پر لکھی اس کی ایک ضخیم کتاب کا مقدمہ ہے جو بذات خود کسی کتاب سے کم نہیں ہے۔ تاریخ کے علاوہ فلسفہ، علم سیاست، علم طب، علم نجوم وغیرہ پر بھی ابن خلدون کو عبور حاصل تھا۔

سفرناموں کے موضوع پر ابن خلدون کی جس کتاب کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے وہ دراصل اس کی خود نوشت سوانح حیات کا ایک حصہ ہے۔ اس کے ابتدائی سفر دراصل سیاسی اغراض ومقاصد کے لیے ہوئے تھے، چنانچہ اس نے پہلے اپنے وطن تونس سے نکل کر الجزائر، مراکش اور اندلس کا سفر اسی مقصد سے کیا۔ پھر فریضۂ حج کی ادائگی کا ارادہ کیا اور بحر قلزم کے راستے مصر کا رخ کیا اور اسکندریہ ہوتے ہوئے قاہرہ پہنچا جو اس دور میں بغداد اور قرطبہ جیسے عظیم الشان شہروں کے ہم پلہ تھا۔ جامعہ ازہر جیسا عظیم علمی مرکز اس شہر میں فاطمیوں کے ہاتھوں چوتھی صدی ہجری میں ہی قائم ہو چکا تھا جہاں دنیائے اسلام کے کونے کونے سے لوگ حصول علم کے لیے آیا کرتے تھے۔ ابن خلدون جب قاہرہ پہنچا تو وہاں سے واپسی کی طرف اس کی طبیعت مائل نہیں ہوئی، چنانچہ ایک طویل عرصہ اس نے اس شہر کی علمی فضا میں گزارا، اور جب پھر سے بیت اللہ میں حاضری کی خواہش جاگ اٹھی تو حجاز کا سفر اختیار کیا اور ادائگیٔ حج کے بعد پھر سے واپس قاہرہ آگیا۔ پھر فلسطین اور بلاد شام کا سفر کیا۔

ابن خلدون کے سفرنامے پر خود نوشت سوانح حیات کا طرز بیان غالب نظر آتا ہے۔ اپنے ذاتی تجربات کو وہ کافی اہتمام کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ بہرحال ابن خلدون جیسے عظیم اسکالر کی تصنیف خواہ وہ کسی بھی فن یا کسی بھی موضوع پر ہو اس کو ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہونا لازمی تھا، چنانچہ اس سفرنامے کو بھی عربی سفرناموں کے باب میں ایک اہم مرجع تصور کیا جاتا ہے۔

مراجع ومصادر

ادب الرحلات، حسین محمد فہیم، کویت 1978
ادب الرحلۃ عند العرب، حسنی محمود حسین، دار الاندلس، بیروت، 1983
ادب الرحلۃ فی التراث العربی، فواد قندیل، مکتبۃ الدار العربیۃ للکتاب، القاہرہ، 2002
الرحالۃ المسلمون فی العصور الوسطی، زکی محمد حسن، القاہرہ، 2013
الرحالون العرب وحضارۃ الغرب، نازک سابایارد، 1992
الرحلات، شوقی ضیف، دار المعارف، القاہرہ
الرحلۃ فی الادب العربی، ناصر عبد الرازق الموافی، القاہرہ، 1995
الرحلۃ والرحالون المسلمون، احمد رمضان احمد، دار البیان العربی، جدہ، سعودی عرب

Dr Sumama Faisal
Assistant Professor, Dept of Arabic, MANUU
Lucknow Campus, 504/122, Tagore Marg,
Lucknow- 226020, UP
Email: sumamaid@gmail.com,
Mob.: 8574976671

ہما کوثر

جن کتابوں نے متاثر کیا

ذہن وشعور کی پرورش اور پختگی کا سب سے اہم ذریعہ کتابیں ہیں۔ یہ صرف تنہائی کی بہترین ہمنشیں ہی نہیں بلکہ ان دیکھی دنیا کی سیر اور نئے جہانوں کی دید ودریافت کا سب سے کارآمد اور بہترین وسیلہ بھی ہیں۔ نئے اذہان اور خیالوں سے واقفیت، علم وآگہی کا حصول اور دماغ کی تربیت کتابوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کچھ کتابیں قرأت ختم ہونے کے ساتھ ہی قاری کے دماغ سے محو ہو جاتی ہیں اور بعض دیر اور دور تک قاری کے ذہنی سفر کی ہم سفر ہوتی ہیں۔ مطالعے کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک جو کتاب سب سے زیادہ متاثر کن لگی وہ مولانا آزاد کی 'غبار خاطر' ہے۔ کئی مرتبہ پڑھنے کے باوجود اس کے سحر واثر میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہر نئی قرأت کچھ نیا انکشاف کر کے تازگی کا احساس دلاتی ہے۔ کتابوں سے دوستی ہوئی تو ابتدا میں خودنوشتوں سے بڑی دلچسپی رہی۔ اس سلسلے میں ساجدہ زیدی کی 'نوائے زندگی' اختر حسین رائے پوری کی 'گرد راہ' نسیم انصاری کی 'جواب دوست' مسعود حسین خان کی 'ورود مسعود' اختر الایمان کی 'اس آباد خرابے میں' آل احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں' رشید احمد صدیقی کی 'آشفتہ بیانی میری' مولانا آزاد کی 'تذکرہ' تک رسائی ہوئی۔ یہ تمام خودنوشتیں مواد واسلوب کی رنگا رنگی لیے ہوئے ہیں۔ کسی میں زندگی کا سادگی بھرا بیان ہے تو کسی میں زندگی کی داستان کے ساتھ ساتھ تدبر وتفکر سے پر علمی بحث بھی نظر آتی ہے۔ کہیں پھڑکتے ہوئے جملوں کے ذریعے ہلکے پھلکے انداز لیے ہوئے واقعات سامنے آتے ہیں تو کہیں علمی سنجیدگی کا ماحول ہے۔

فکشن میں 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' اور 'آگ کا دریا' نے بے حد متاثر کیا۔ ذہنی الجھن اور زندگی کی تھکن کی صورت میں 'آگ کا دریا' اور 'غبار خاطر' کی نثر آج بھی علاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ فکر میں گھلی ہوئی شاعرانہ نثر کی مالک قرۃ العین حیدر کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات موضوع، اسلوب اور فنی تکنیک کے لحاظ سے خاصی پیچیدہ اور پہلودار ہیں۔ میرے بھی صنم خانے، آخر شب کے ہم سفر، چاندنی بیگم اور 'گردش رنگ چمن' میں متضاد عناصر کو جذب کیا ہوا تہہ دار اسلوب اپنی دلکش فضا میں قاری کو بہالے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انیس اشفاق کا ناول 'خواب سراب' مرزا اطہر بیگ کا 'غلام باغ' مستنصر حسین تارڑ کا 'خس وخاشاک زمانے' قابل ذکر ہیں۔ ناولوں کے علاوہ تارڑ کے سفرنامے 'نکلے تری تلاش میں' اور خصوصاً 'اندلس میں اجنبی' کی رومانیت سے بھرپور نیم خوابی کی فضا پڑھنے والے کو اپنے سحر میں لیتی ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر صاحب طرز، شاہکار اسلوب، منفرد اور جاندار نثر کے مالک مختار مسعود کا ذکر نہ کیا جائے۔ تعصب کی ہلکی لہر کے باوجود 'آواز دوست' اور ان کی بقیہ تینوں کتابیں قاری کو پوری طرح گرفت میں لینے اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تاثر کے حساب سے چاروں میں آواز دوست کو فوقیت حاصل ہے لیکن سفر نصیب' اور 'لوح ایام' کی ذہن کے دریچے کھولتی سلیس نثر، چھوٹے چھوٹے بامعنی جملے جہاں ایک طرف اسلوب کی تازگی کا احساس دلاتے ہیں وہیں فکر کی سطح پر بھی نیا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ تمام کتابوں کے ذکر سے فہرست طویل ہو سکتی ہے اس لیے ذیل میں مختلف موضوعات واصناف سے متعلق چند ایسی کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی سطح پر دیرپا اثرات کی حامل رہی ہیں۔

آپ بیتی: عباس محمود العقاد کی خودنوشت 'انا' جس کا ترجمہ مقتدی حسن ازہری نے بڑی خوبصورت اور علمی نثر میں 'آپ بیتی' کے نام سے کیا ہے۔ اس میں دانائی، درویشی، فلسفہ، جدوجہد اور خودداری کے عجیب وغریب رنگ بکھرے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ کسی بلندی پر بیٹھا ہوا کوئی درویش زندگی سے سیکھے ہوئے سبق بیان کر رہا ہے جس کا ہر لفظ موتی ہے۔ یہ خودنوشت بے نیازی اور غیر مشروط طریقے سے بسر کی ہوئی زندگی کی روداد ہے۔ اس کتاب کی خوبی ہے کہ اس میں واقعات کم، نتائج واسباق اور تجربے زیادہ ہیں۔ اکثر خودنوشتوں میں ادھر ادھر کے غیر ضروری واقعات اور بے مقصد بیانات صفحات کی تعداد میں اضافے اور مطالعے کی گرانی کا سبب بنتے ہیں لیکن عقاد کی اس خودنوشت میں ایک سطر بھی اضافی یا غیر ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ دانشورانہ شعور کی پرورش، خصوصاً قلم سے وابستہ افراد اور طالب علموں کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ علم کا شغف،

مطالعے کی غیر معمولی لگن، خود مختاری، ذہنی آزادی اور قناعت کا سبق ہر صفحے پر ملتا ہے۔

دلی کی شام: دلی کی بپتا، اس کے اجڑنے بسنے کا ذکر، اس کی دلکشی و رعنائی اور بربادی کے نوحے مختلف شاعروں اور مصنفین کے یہاں ملتے ہیں۔ میر کی شاعری میں دل اور دلی کی روداد ہو، غالب کے خطوط میں 1857 کے سانحے کا ذکر ہو، کئی چاند تھے سر آسماں میں مغلیہ حکومت اور اس عہد کے تہذیبی و ادبی منظرنامے کا بیان ہو یا پھر 'دلی کی شام' میں غروب ہوتی تہذیب کا ذکر، ان سب کے یہاں دلی اجڑتے، بستے، بکھرتے رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

دلی کی شام احمد علی کے ناول Twilight in Delhi کا ترجمہ ہے جسے ان کی بیگم بلقیس بانو نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ترجمہ اور اس کا اسلوب اتنا شاندار ہے کہ یہ خود اصل تخلیق کے قائم مقام ہو گیا ہے۔

میر نہال اور ان کے بھرے پرے خاندان کے کرداروں کے ارد گرد گھومتی یہ کہانی غدر کے بعد اور آزادی سے قبل کے زمانے کو محیط ہے۔ اس ناول میں دلی کی تہذیب، طرز معاشرت، پرانی دلی اور وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، گلی کوچے، محلے، کھیل اور کبوتر بازی سب کچھ اپنی جزئیات اور تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس کتاب کی اہم خوبی اس کا شاندار اور کلاسک اسلوب ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موضوع کی بہ نسبت اسلوب کے حوالے سے یہ کتاب زیادہ متاثر کن ہے۔ بامحاورہ زبان اول تا آخر تیز رو دریا کی مانند رواں نظر آتی ہے۔ چمکتی، سرسراتی اور متحرک زبان میں کئی جگہ منظر نگاری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

سن لائٹ آن اے بروکن کالم: اس ناول کی تخلیق کار عطیہ حسین ہیں، عطیہ حسین کا تعلق لکھنؤ سے تھا، تقسیم کے بعد ہندوستان چھوڑ گئیں اور لندن میں قیام کیا۔ عطیہ حسین نے تخلیقی اظہار کے لیے انگریزی زبان کو وسیلہ بنایا۔ ان کے ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' میں ایک تعلقدار خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ناول 1930 سے شروع ہو کر آزادی کے کچھ سالوں بعد کے زمانے پر ختم ہوتا ہے۔ اودھ کا تعلقدارانہ نظام، لکھنوی تہذیب، فسادات، تقسیم اور آزادی جیسے مسائل و موضوعات ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔ مصنفہ نے اپنے ناول میں کرداروں کی نفسیات، محبت و نفرت کے جذبے اور ان کی ذہنی کشمکش کو بڑی باریکی اور فنی چابک دستی سے گرفت میں لیا ہے۔

میرا داغستان: کچھ کتابیں اپنا دامن قیمتی موتیوں سے مالا مال رکھتی ہیں۔ ان کے خالص شفاف گوہروں میں کسی بھی خزف ریزے یا کنکر کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ میرا داغستان ایسے ہی در نایاب سے بھری ہوئی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف رسول حمزہ توف ہیں جن کی پہلی پہچان شاعری ہے، نثر میں انھوں نے صرف ایک کتاب لکھی ان کی اسی نثری تصنیف نے انھیں بے مثال اور لازوال بنا دیا۔ اجمل اجملی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مترجم کی ترجمہ نگاری کی داد بھی ضروری ہے جنھوں نے کتاب کو اس کی روح کے ساتھ اردو میں پیش کیا۔ میرا داغستان پہلی نظر میں مصنف کی خودنوشت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ایک خودنوشت کے ساتھ ساتھ ایک محب وطن کا اپنے ملک کے لیے محبت نامہ، ایک درویش کا وعظ نامہ اور ایک سیاح کا سفرنامہ بھی ہے۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں، مختصر واقعات اور ضرب الامثال کے ذریعے بڑی حقیقتوں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے گویا آئندہ کے تصنیفی عزائم میں شامل کسی کتاب کا ابتدائیہ یا پیش لفظ لکھا جا رہا ہے جس میں اس تخیلی کتاب کے متعلق مصنف اپنی رائے اور منصوبے قلمبند کر رہا ہے کہ وہ کتاب کیسی ہوگی، اس کا سرورق کیسا ہوگا، اس کے موضوعات کیا ہوں گے، اور یہ پیش لفظ نما منصوبہ پڑھتے پڑھتے قاری کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ کتاب کب ختم ہو گئی، نہ ہی اختتام پر کسی قسم کی تشنگی کا احساس ہوتا بلکہ حکایات اور نصیحتوں سے آراستہ ایک آسودہ قرأت نصیب ہوتی ہے۔

گل نغمہ: یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف 'گیتانجلی' کا منظوم ترجمہ ہے۔ ٹیگور کی گیتانجلی ادب کا ایک عظیم شاہکار ہے اس کے تراجم کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں گل نغمہ کے علاوہ اردو میں گیتانجلی کے منثور و منظوم دونوں شکلوں میں متعدد ترجمے ملتے ہیں جن میں نیاز فتحپوری، سید ظہیر عباس اور سہیل احمد فاروقی کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

عبدالعزیز خالد کا یہ ترجمہ ان کے خاص اسلوب میں ایک عظیم شعری کارنامے کا بہترین عکس ہے۔ ترجمے کا حسن ہے کہ ترجمہ، ترجمہ معلوم نہ ہو بلکہ اس پر اصل کا گمان ہو۔ عبدالعزیز خالد کا یہ ترجمہ بھی منفرد شعری حیثیت کا حامل اور ان کی قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک مغنی کی حضور الٰہی میں نوا سنجی کو خالد نے اسی تخلیق کی سی شورانگیزی، بلند آہنگی اور سماوی علویت کے ساتھ مترنم لہجے میں پیش کیا ہے۔

تو دیتا ہے جب حکم نغمہ سرائی
تو دل شدت شوق و فرط طرب سے

سماتا نہیں پہلوئے ناتواں میں
کہ جیسے اسے مل گئی ہو خدائی

گل نغمہ میں عربی و فارسی تراکیب کثرت سے استعمال کی گئی ہیں، کہیں کہیں پورا مصرع ہی عربی میں ادا ہوا ہے جس کی وجہ سے بعض جگہوں پر ترکیب آرائی اور شکوہ بیانی کا احساس ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر شعری سلاست اور موسیقیت میں کہیں کمی نہیں ہے۔ گل نغمہ میں خالد نے گیتانجلی کی تمام تر روحانیت، سرمستی، جذب و حال اور وجد کو نفسیاتی اور لسانی دونوں سطح پر سمیٹ لیا ہے۔ جذبے کا وفور، خیال کی تابانی اور وجدانیت شروع سے آخر تک قائم ہے۔

■

Huma Kausar
3214 kucha Tara Chand
Tiraha Bairam Khan Near Delhi Health Centre
Darya Ganj
Delhi - 110002

"ذہن و شعور کی پرورش اور پختگی کا سب سے اہم ذریعہ کتابیں ہیں۔ یہ صرف تنہائی کی بہترین ہمنشیں ہی نہیں بلکہ ان دیکھی دنیا کی سیر اور نئے جہانوں کی دید و دریافت کا سب سے کارآمد اور بہترین وسیلہ بھی ہیں۔ نئے اذہان اور خیالوں سے واقفیت، علم و آگہی کا حصول اور دماغ کی تربیت کتابوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کچھ کتابیں قرأت ختم ہونے کے ساتھ ہی قاری کے دماغ سے محو ہو جاتی ہیں اور بعض دیر اور دور تک قاری کے ذہنی سفر کی ہم سفر ہوتی ہیں۔"

افتخار احمد

زبانوں کے نصاب میں سائنسی علوم و فنون کی شمولیت ضروری ہے

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ھے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گھرا رشتہ نہیں ہوتا. اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ھے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا. زبان کی زمینی صورت حال کیا ھے اس سے آگھی کے لیے ضروری ھے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ھے. عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ھے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ھے؟

ماھنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارھی ھے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ھے اور وھاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرھی ھیں. جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا.

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: زبانوں کی موت کی سب سے بڑی وجہ خود اُس زبان کے لوگوں کی اپنی زبان سے محبت میں کمی ہے۔ اس کے علاوہ ماحول اور ملک میں زبانوں کی تعلیم کا غیر مناسب انتظام ہے۔ پرائمری سطح پر اُردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے سب سے پہلے اس کو روزگار سے جوڑنا چاہیے ایسا نصاب تیار ہو جو روزگار حاصل کرنے میں معاون ہو۔ اس زبان کے لوگوں کو متحرک ہونا چاہیے۔ اس کے بعد حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ کس علاقے میں اس زبان یا زبانوں کی تدریس و تعلیم کا مناسب انتظام کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ زبان کا اور 'ٹی وی' چینل وغیرہ ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے اپنی مادری زبان کے رسم الخط کی طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے اور ان زبانوں کے اخبارات، رسالوں اور کتابوں کو بھی خریدنا چاہیے۔

س: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: کوئی بھی زبان کسی خاص ملک کی تہذیب و ثقافت کی ہی پیداوار ہوتی ہے۔ زبانیں اپنی تہذیب و ثقافت کے اندر جیتی اور پروان چڑھتی ہیں اردو مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے اس لیے ہمیں اُردو کو زندہ رکھنے کے لیے مشترکہ تہذیب کو فروغ دینا ہوگا۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: کسی بھی انسانی گروہ یا قوم کی پہچان اس کی زبان سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس زبان میں ہی زبانی یا تحریری شکل میں اُس قوم یا اس گروہ کی وراثت موجود ہوتی ہے۔ اسی لیے اگر کسی زبان کی موت ہوتی ہے تو اس زبان کے بولنے والی قوم یا گروہ کی انسانی اخلاقی اور تہذیبی وراثت کی بھی موت ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسانی وراثت کے تحفظ کے لیے زبان کا تحفظ بھی ضروری ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے اس زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: کسی زبان میں سائنسی سماجی اور دوسرے علوم سے متعلق مواد کی کمی ہو جاتی ہے تو وہ زبان آہستہ آہستہ پسماندہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے زبانوں کے نصاب میں جدید اور سائنسی علوم و فنون کو داخل کرنے کی ضرورت ہے مثلاً کمپیوٹر سائنس، انفارمیشن ٹیکنالوجی وغیرہ

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ دور میں اردو زبان کو کئی طرح کے خطرات لاحق ہیں۔ مثلاً اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی۔ اردو کی جانب سے خود اردو والوں کی بے توجہی۔ اس لیے انگریزی اور ہندی کے مقابلے میں یہ زبان پسماندہ ہے۔ اور ان زبانوں کے لوگ اردو کو چھوڑ کر دوسری زبانوں کو تسلیم کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاست جموں و کشمیر کی کئی زبانوں مثلاً گوجری، ڈوگری، پہاڑی، لداخی وغیرہ میں سائنسی و سماجی مواد کی کمی ہے۔

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

ج: ملک اور ریاست میں اردو کا چہرہ بے شک مسخ ہو رہا ہے اردو زبان میں معیاری الفاظ کی جگہ بازاری الفاظ شامل ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اردو محاورات ختم ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے اردو زبان کی شکل بگڑتی جا رہی ہے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو ایک عالمگیر زبان ہے جو آج دنیا کے ساٹھ ممالک میں بولی اور سمجھی جانے والی رابطے کی زبان ہے۔ مرکزی حکومت کے زیر انتظام جموں و کشمیر میں اس کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور یہی آزادی سے لے کر تا حال ہے اردو کا ماضی روشن رہا ہے حال تسلی بخش ہے مستقبل کی صورت حال بھی درخشاں نظر آرہی ہے۔ ایک طرف یہ رابطے کی زبان ہے اور دوسری طرف اسے سرکاری زبان کا بھی فخر حاصل ہے۔ دور حاضر میں اردو اپنی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے ساری دنیا کی ترقی یافتہ ممالک کی الیکٹرانک میڈیا میں ایک رابطے کی زبان رہی جس سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس زبان میں بڑی وسعت ہے۔ اس کا ذخیرہ الفاظ کافی ہے، جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے بیس سال قبل ریاست کے تعلیمی نظام میں اردو کو ایک خاص مقام حاصل تھا ابھی چند برسوں قبل جموں و کشمیر کے دونوں صوبوں میں آٹھویں جماعت تک تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ سوشل سائنس کے مضامین کی تدریس دسویں جماعت تک اُردو میڈیم میں ہوتی تھی

لیکن اب اول جماعت سے ہی انگریزی پڑھائی جانے لگی ہے یہ زبان دو سو صدیوں سے اس ریاست کی رابطے کی زبان رہی ہے۔ اردو کا مستقبل غیر یقینی لگتا ہے کیونکہ اردو اساتذہ کو روزگار سے نہیں جوڑا گیا ہے۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کا مناسب انتظام نہیں اردو اکیڈمی نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمام نقصانات اٹھانے پڑ رہے ہیں۔ اردو ادارے کو زیادہ سرگرم کرنے کی ضرورت ہے اور اردو کے روشن مستقبل کے لیے جموں وکشمیر میں اردو اکیڈمیوں کا ہونا ضروری ہے جس کی شاخیں ہر ضلعے میں ہونی چاہیے نیز انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے کے لیے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لانا ہوگا ان سے اردو کی ترقی وترویج کی رفتار بڑھ سکتی ہے۔ دارالترجمہ، فورٹ ولیم کالج ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرز پر ہونا چاہیے یہاں اردو زبان کو فروغ ملے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کئی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک اردو میں معیاری نصاب کی تیاری، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں اردو پروگرام نشر و اشاعت، مدرسوں اسکولوں میں تجربہ کار اردو اساتذہ کی تقرری۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟ کیا یہ بات درست ہے۔

ج: یہ بات درست ہے کہ اردو کے ادارے اردو زبان سے زیادہ اردو ادب کے متعلق کتابیں شائع کر رہے۔ اردو شعر وادب زبان کی لغت املا محاورات فصاحت اور بلاغت شاعری اور نثری اصناف اردو زبان وادب کی تاریخ کی کتابیں بہت کم شائع ہو رہی ہیں۔ اس لیے طلبا اردو زبان کی بناوٹ الفاظ کے استعمال اور بحر و وزن، ردیف، قافیہ اور غیر موزوں کلام کے بارے میں نہیں جانتے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: اردو میں کلاسیکیت جدیدیت اور دوسرے ادبی نظریات پر گفتگو سے اردو زبان کے ادب کو یقیناً فائدہ ہوگا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اردو زبان اور ادب میں کس زمانے میں کون سی تحریک پیدا ہوئی اور اس کے سماجی اور ثقافتی اسباب کیسے تھے اور کون سے نظریات اور رجحانات سامنے آئے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: ہمارے علاقے میں (جموں) اردو ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ البتہ مدرسوں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے لیکن وہاں بھی اردو کے تربیت یافتہ اساتذہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زیادہ تر بڑے اسکولوں میں اردو کی تدریس کا کوئی انتظام ہی نہیں ہے اس لیے طلبا مجبور ہیں دوسری زبان پڑھنے میں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اُردو اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں اُردو میڈیم اسکولوں اور لائبریریوں کی بہت کمی ہے۔ ایک دو لائبریری ہیں مثلاً یونیورسٹی لائبریری، اُن میں چند انگریزی، ہندی کے اخبارات آتے ہیں لیکن اردو کے اخبارات نہیں آتے یا کبھی کبھار نظر آتے ہیں۔ ان دنوں لائبریریوں میں کوئی اردو کا رسالہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے اساتذہ نے شعبے کی لائبریری کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہیں دوسری طرف شعبے کے صدر محمد ریاض احمد لائبریری کو تحقیقی مرکز بنانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں دو تین تنظیمیں جیسے 'بزم فروغ اردو' نام سے سرگرم ہے۔ دوسری تنظیم 'تحریک بقائے اُردو' ہے، جو سمینار اور ویبینار کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ کی کوشش کرتی رہتی ہے اس کے علاوہ تحریک بقائے ادب ملک وبیرون ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو کرکے اردو والے تک پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ جموں وکشمیر حکومت کی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے بھی اردو کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے اردو شعبوں کی طرف سے بھی اردو کے فروغ اور ارتقا کے لیے کئی طرح کے پروگرام کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے علاقے میں اردو زبان وادب کا فروغ ہو رہا ہے۔ رسا جاودانی کمیٹی بھی اپنا پروگرام کرواتی رہتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: ہمارے علاقے جموں میں اردو کی کئی اہم شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف قومی سطح پر آج تک نہیں کیا گیا ہے۔ جیسے عرش صہبائی، احمد شناس، عشاق کشتواڑی، خورشید کاظمی، امین بنجارہ وغیرہ

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے میں زبانی طور پر سرکاری اسکول میں اردو اساتذہ کے تقرر کے لیے سیاسی اور سماجی سطح پر جدوجہد کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے شعبے میں قابل اساتذہ سے لیکچر کروا رہا ہوں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: میرے ذہن میں اردو کے فروغ کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اردو میڈیم سکول قائم کیے جائیں۔ اردو میں اسکول، کالج، یونیورسٹی سطح پر سائنسی ٹیکنالوجی اور دیگر مضامین سمینار ورک شاپ منعقد ہوں جہاں اردو طالب علم اپنی صلاحیت دکھا سکیں۔ ریاست اور ملک بھر میں پرائمری سطح پر اردو کی تدریس کا انتظام کیا جائے اور اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کی جائے اور جہاں اردو کے طالب علم ہیں وہاں تدریس کا انتظام کیا جائے۔ پرائمری سطح کے لیے معیاری کتابیں تیار کی جائیں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: ریاست جموں وکشمیر میں کئی علاقائی زبانیں ہیں: گوجری، لداخی، شنا، بھلیسی، پاڈری، سیراجی وغیرہ۔ اُردو کے فروغ کے لیے ان زبانوں میں اردو ادبی سرمایہ منتقل کیا جائے۔ اور معیاری کتابوں کا ترجمہ کروا دیا جائے۔ ورنکلیر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرز پر۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: ملکی سطح پر اور صوبہ جموں میں اگر سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں توجہ دیں تو ہر علاقے میں اردو کا فروغ تیزی سے ہوسکتا ہے اس سلسلے میں جموں اور کشمیر میں اردو کی انجمنیں قائم کی جائیں اور اس کے لیے NCPUL کا ایک Regional Center بھی قائم کیا جائے۔ اس کے لیے حکومت کی جانب سے پہل ہو تو بہتر ہوگا کیونکہ پرائیویٹ طور پر اٹھائے گئے قدم ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: صوبہ جموں میں جو بھی سنٹرل اسکول اور نوودے ودیالیہ اسکول ہیں، ان میں کوئی معقول انتظام نہیں ہے، صوبہ جموں میں کسی جگہ اردو کی تعلیم کا اطمینان بخش انتظام نہیں ہے۔ اس لیے تمام اسکولوں میں اردو کی تدریس کا انتظام ضروری ہے تاکہ طلبا آگے جاکر محکمہ مال، محکمہ جنگلات، محکمہ عدلیہ، محکمہ ماحولیات میں آسانی سے کام کرسکیں۔

■

Dr. Iftekhar Ahmad
Urdu Lecturer, Dept of Urdu
Online Distance Education
University of Jammu,
Gujarbasti, Jammu 180006 (J&K)
Mob.:9890204715

شعیب نظام

عرفان صدیقی

کچھ یادیں کچھ باتیں

شاید یہ 79 یا 80 کی بات ہے عرفان بھائی سے پہلی بار ایک سیمنار میں ملاقات ہوئی تھی۔ میرے دوست انتظام بھائی نے تعارف کرانے سے پہلے ڈھیرے سے بتایا تھا کہ یہ بہت اہم اور بڑے شاعر ہیں مگر پہلی نظر میں وہ مجھے بڑے اور اہم کیا سرے سے شاعر ہی نہیں معلوم ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ میں تازہ تازہ بارہ بنکی سے لکھنؤ وارد ہوا تھا اور خمار بارہ بنکوی اور شمسی مینائی کو تو چھوڑیے میں نے نگار اور عزیز بارہ بنکوی کو بھی کبھی شیروانی کے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے بڑے شاعر کا تصور شیروانی کے بغیر میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ عرفان بھائی ٹائی اور نفیس سوٹ میں ملبوس تھے۔

ان دنوں میں اردو میں ایم اے کر رہا تھا اور بارہ بنکی سے لکھنؤ روزانہ آتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی انتظام بھائی کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ ان کے والی صاحب اور عابد سہیل صاحب سے تقریباً دوستانہ مراسم تھے۔ امین آباد میں چند رسائل اور کبھی کبھار کچھ کتابیں خریدی جاتیں اور والی آسی صاحب کے یہاں کچھ شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں بھی ہو جاتیں جن میں شام کو اکثر عرفان بھائی بھی آجاتے۔ والی صاحب کے یہاں شعروادب اور شخصیات پر بے تکلف گفتگو چلتی رہتی تھی وہ اس زمانے میں پروین شاکر، ظفر اقبال، ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کے اچھے اچھے شعر خوب سناتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ان شعرا کے مجموعے شائع بھی کیے۔ شعروادب پر گفتگو کے بیچ بیچ میں مقامی اور بیرونی شخصیتوں پر کھل کر تبصرے روا بلکہ رواں رہتے جو تھوڑی دیر میں ذاتیات کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے موضوع گفتگو زیادہ تر مشاعروں کے شاعر اور شاعرات ہوتے تھے مگر کبھی کبھی اس دائرے میں ادیب اور دانشور حضرات بھی آجاتے تھے۔ گفتگو کی سطح کچھ بھی رہتی ہو مگر مزہ بہت آتا تھا۔ انھیں دنوں منور رانا نئے نئے والی آسی کے شاگرد ہوئے تھے۔ برابر آنے والوں میں رئیس انصاری، انور ندیم، حفیظ نعمانی، مسعود الحسن عثمانی، انجم ملیح آبادی اور حسن واصف عثمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زیادہ تر مشاعروں کے معروف شعرا بھی کسی مشاعرے میں جاتے ہوئے یا لوٹتے ہوئے والی صاحب کے یہاں بیٹھے ہوئے مل جاتے تھے۔ اسی دور میں انور ندیم صاحب نے مشاعروں پر مبنی اپنے تاثرات مضامین کی شکل میں قلم بند کرنے شروع کردیے تھے۔ جملوں کی کاٹ اور ان کی دھار دار نثر بہت دلچسپ ہوتی تھی بعد میں یہ مضامین 'جلتے توے کی مسکراہٹ' کے نام سے کتابی صورت میں شائع بھی ہوئے۔

عرفان بھائی دفتر سے واپسی پر زیادہ تر والی صاحب کی دکان پر رک جاتے تھے۔ میں نے دھیرے دھیرے ایک خاص تبدیلی سی محسوس کی بظاہر گفتگو پہلے کی طرح جاری رہتی مگر عرفان بھائی کے آنے پر کچھ لوگ محتاط سے ہو جاتے تھے۔ بہت فرمائش کرنے پر عرفان بھائی بھی شعر سنا دیتے تھے۔ اب انتظام بھائی کے ساتھ کبھی کبھی میں ان کے دفتر بھی جانے لگا تھا یہاں وہ بہت محبت سے ملتے تھے اور فرمائش پر اپنے شعر بھی آسانی سے سنا دیتے تھے اب میں امین آباد سے بہت نزدیک گوئن روڈ واقع اپنے ماموں کے مکان میں رہنے لگا تھا جہاں سے عرفان بھائی کا گھر اور والی صاحب کی دکان کا فاصلہ بہت تھوڑا سا تھا۔

میں ایم اے فائنل میں تھا۔ اسی سال اردو کے نو وارد طلبا میں شافع قدوائی، رفعت عزمی، ندیم اشرف اور محسن خان بھی آگئے۔ جلد ہی ہم سب کی دوستی ہوگئی۔ اب ہم اکثر عرفان بھائی کے گھر آنے لگے۔ تھوڑے دنوں بعد شافع قدوائی نے قومی آواز جوائن کرلیا اور مجھے بھی عرفان بھائی نے اپنے دفتر میں لگالیا۔ دفتر کے بعد میں زیادہ تر عرفان بھائی کے ساتھ ہی امین آباد تک آتا تھا دھیرے دھیرے عرفان بھائی دفتر سے سیدھے گھر آنے لگے اب والی صاحب کے یہاں رکنے کا سلسلہ خاصا کم ہوگیا تھا۔

گھر پر چائے وائے پینے کے بعد میں بھی عموماً ان کی طرف نکل آتا تھا وہ اکثر امین آباد کا ایک چکر لگانے کی فرمائش کرتے راستے میں وہ کبھی کبھی میر کا کوئی شعر سناتے اور پھر اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہتے۔ انھیں چکروں کے طفیل غالب کی غزل، محسن کاکوروی کی نعت گوئی پر عرفان بھائی کی گفتگو آج بھی میرے حافظے میں کم وبیش محفوظ ہے۔ واپسی پر وہ زیادہ تر عزائم کے دفتر کی طرف مڑ جاتے۔ جمیل مہدی صاحب سے ان کی کچھ عجیب سی دوستی تھی۔ عرفان بھائی کمرے میں داخل ہوتے جمیل صاحب سر اٹھا کر دیکھتے ذرا سا مسکراتے پھر اپنا کام کرنے لگتے۔ عرفان بھائی ٹیلی پرنٹر سے کاغذ پھاڑتے اور محمد مسعود سے باتیں کرتے ہوئے ایک خبر ترجمہ کرتے اور کاغذ وہیں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے جمیل صاحب سر اٹھا کر انھیں جاتے ہوئے دیکھتے اور پھر لکھنے میں مشغول

ہو جاتے۔ ملاقات کا یہ عجیب سا سلسلہ برابر جاری رہتا میں حیران کہ یہ کون سا رشتہ ہے۔ کا ہے کی دوستی ہے ایک دن صبر جواب دے گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا بھائی، جمیل صاحب آپ کے دوست ہیں مگر آپ لوگوں میں گفتگو تو ہوتی ہی نہیں ہے عرفان بھائی مسکرا کر بولے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور میں پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد انڈیا قلفی ہاؤس کی بالائی منزل پر پابندی کے ساتھ بیٹھک ہونے لگی۔ یہاں ایک میز تقریباً مخصوص ہو گئی تھی۔ اس نشست میں عرفان بھائی کے ساتھ عمر انصاری، انجم ملیح آبادی، عرفان لکھنوی، شمس فرخ آبادی، افسر بسوانی صاحبان اور یاد دہلوی صاحب تقریباً روز ہی بیٹھنے لگے۔ شعروشاعری کے علاوہ اِدھر اُدھر کی گفتگو رہتی جس میں ادب، تاریخ ملکی اور ادبی سیاست اور ماضی کی یادیں، سب کچھ شامل رہتا۔ میں یہاں تقریباً سامع کے فرائض انجام دیتا رہتا۔ اب امین آباد جانے کا راستہ الٹا ہو گیا تھا۔ یعنی عرفان بھائی اور میں والی صاحب کی دکان پر دو چار منٹ رکتے ہوئے عزائم کے دفتر جاتے چند منٹ جمیل صاحب کو دیکھنے کے بعد نشست گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔ یہ نشست ساڑھے آٹھ کے آس پاس برخواست ہوتی۔ میں امین آباد ہی میں رک جاتا اور عرفان بھائی شمس صاحب کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ اس کے بعد شافع قومی آواز سے آجاتے اور دس پانچ منٹ کے فرق سے ندیم اشرف اور محسن بھی اور ہم لوگ دیر رات تک کسی بے نام ہوٹل میں نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں الجھے رہتے۔ مگر ان دنوں ہم لوگ پڑھتے بہت تھے۔

عرفان بھائی کے گھر کا دھیرے دھیرے میں بھی ایک حصہ بن گیا جو آج تک قائم ہے۔ وہ جب پاکستان جانے لگے تو مجھے گویا گھر کی ذمے داری دے گئے تھے کہ جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ سب آپ کو دیکھنا ہے ان کی واپسی تک میں اُن کے یہاں ہی رہا، واپسی پر وہ میرے لیے بھی تحفتاً سلیم احمد کا مجموعہ اکائی اور کئی رسائل اور شرٹیں لائے تھے۔

عرفان بھائی مزاج کے اعتبار سے بہت زود رنج واقع ہوئے تھے۔ والی آسی صاحب اپنے مجموعہ شہد کے فلیپ پر ان کی آرا شامل کرنا چاہتے تھے مسلسل اصرار پر عرفان بھائی نے تحریر لکھ دی جو پہلے چھپ بھی گئی مگر ان کے کچھ شاگردوں اور دوستوں نے انھیں بتایا کہ عرفان بھائی بڑے شاعر ضرور ہیں مگر وہ کوئی نامور ناقد تو ہیں نہیں اس لیے فلیپ پر ان کی رائے کے بجائے کسی بڑے ناقد کی رائے ہونی چاہیے۔ بہر حال مجموعے کا ٹائٹل پیج بدل دیا گیا۔ عرفان بھائی ایک دن والی صاحب کے مکتبہ میرے ساتھ گئے اور باہر سے ہی دریافت کیا کہ والی صاحب اگر آپ کو میری آرا فلیپ پر نہیں دینی تھی تو اس کے لیے اتنا اصرار کر کے آپ نے لکھوایا ہی کیوں تھا۔ والی بھائی کہتے رہے عرفان بھائی بیٹھ جائیں مگر عرفان بھائی نے کہا پہلے آپ جواب دے دیجیے میں مطمئن ہو جاؤں گا تو بیٹھ جاؤں گا۔ ظاہر ہے والی بھائی کے پاس جواب نہیں تھا اس دن کے بعد عرفان بھائی والی آسی صاحب کے مکتبہ پر کبھی نہیں گئے۔

اسی دوران سید محمد اشرف آئی اے ایس میں منتخب ہو کر ٹریننگ کے سلسلے میں لکھنؤ آگئے تھے۔ وہ عرفان بھائی کے عزیز ہوتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی ان کا افسانہ 'ڈار سے بچھڑے' گفتگو میں شائع ہو کر لکھنؤ آ چکا تھا اور عرفان بھائی کی نشاندہی پر ہم لوگ پڑھ چکے تھے۔ ویسے بھی اس افسانے کا ادبی حلقوں میں خاصا چرچا تھا۔ اشرف صاحب کی شکل میں ہم لوگوں کے ہاتھ ایک ابھرتا ہوا کیا پوری طرح سے ابھرا ہوا افسانہ نگار لگ گیا تھا۔ ان کے ساتھ متعدد نشستیں برپا کی گئیں۔ ان کے افسانوں پر جو داد وصول ہوئی تھی اس میں ہم لوگ بھی اپنے حصے کی خوشیاں تلاش کر لیتے تھے۔ اشرف صاحب عرفان بھائی کی شاعری کے پرستار کیا تقریباً عاشق تھے اور انھیں عرفان بھائی کا بہت سا کلام حفظ تھا۔ ان کے افسانے 'منظر' میں ایک کردار عرفان بھائی کا بھی ہے جسے بہت خلوص سے پیش کیا گیا ہے۔

اکثر شام کو اور خصوصاً اتوار کو عرفان بھائی کے گھر پر محفل سی رہتی تھی، جس میں سید محمد اشرف صاحب، شافع، ندیم اشرف اور کبھی کبھی محسن خاں بھی شریک رہتے تھے۔ ان محفلوں میں عرفان بھائی کا رویہ سرپرستوں والا ہوتا تھا۔ وہ گفتگو میں شریک بھی رہتے تھے اور نہیں بھی۔ ہاں ہم لوگوں سے فرمائش کر کے شعر بھی سنتے تھے اس زمانے میں شافع بھی شعر کہتے تھے۔ دوسروں کے عیب وہنر گنوانے کا کام تب تک اس عزیز نے شروع نہیں کیا تھا۔ ہاں ندیم اشرف نے شعر گوئی کے ساتھ چھوٹی موٹی حرکتیں بھی شروع کر دی تھیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کر لیتا ہوں۔

عرفان بھائی اپنے گھر کے نیچے والے کمرے میں غزل سنا رہے تھے ابھی وہ مطلع ہی پر تھے۔

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچیے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

ندیم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے 'جی پرندہ اچھا'

عرفان بھائی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بولے میں پہیلیاں نہیں بجھا رہا ہوں۔ کمرے میں ایک سناٹا۔ مگر چند لمحوں کے بعد وہ خود ہنس دیے اور اس دن ہم لوگ بقول شاعر بس ڈوبتے ڈوبتے بچ گئے۔

عرفان بھائی ہی کی سفارش پر ہم لوگوں نے پہلا ٹی وی پروگرام پیش کیا تھا۔

ہم لوگوں کے علاوہ عرفان بھائی کے گھر پر آنے والوں میں آس زیدی، تصور حسین زیدی، شہنشاہ مرزا، وقار ناصری، محمد مسعود اور انجم ملیح آبادی خاص طور پر شامل تھے۔ انجم صاحب سے ان کے گھریلو مراسم تھے۔ جب کبھی شہریار صاحب آجاتے تھے تو عرفان بھائی کے گھر پر بڑی رونق رہتی تھی اور وہ بھی خوب شعر سناتے تھے۔

عرفان بھائی تحت میں شعر بہت عمدہ پڑھتے تھے ان کے پڑھنے کا انداز بہت پر تاثیر اور دلکش ہوتا تھا اور شعر کی پوری معنویت روشن ہو جاتی تھی۔ اب تک بہت سی غزلوں کے ساتھ ان کے پڑھنے کا مخصوص انداز کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تخلیقی عمل ایک پراسرار تجربہ ہے وہ ایک نشست میں کئی کئی شعر آسانی سے کہہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایک رات میں پوری غزل مکمل ہو جاتی تھی۔ ان کی پہلی سامع زیادہ تر بی یعنی ان کی اہلیہ ہوتی تھیں جو خود بھی بہت صاحب ذوق خاتون ہیں۔ وہ شعروں میں رد و بدل بہت کم کرتے تھے میں نے انھیں مصرعہ نوٹ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے پورا شعر ہی ان پر نازل ہوتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہوگی کہ جب تک ایک خاص کیفیت ان پر طاری نہیں ہو جاتی تھی وہ شعر نہیں کہتے تھے۔

دفتر میں جب زیب غوری اور ابوالحسنات صاحب یا شہریار صاحب آجاتے تھے تو کچھ گھنٹوں کے لیے ان کا کمرہ ڈرائنگ روم میں تبدیل ہو جاتا تھا میں بھی خاموشی سے آ کے بیٹھ جاتا۔ شعروشاعری اور ادب پر خوب خوب باتیں ہوتیں۔ ابوالحسنات صاحب بولتے کم تھے مگر عرفان بھائی کو چاہتے بہت تھے۔ ویسے بھی زیب کی خوش گفتاری کے سامنے کسی اور کو بولنے کا موقع مشکل ہی سے ملتا تھا۔ زیب غوری زندگی سے بھرپور بہت نفیس اور وضعدار انسان تھے وہ جب بھی لکھنؤ آتے نیر بھائی اور عرفان بھائی سے ضرور ملتے تھے۔

نیر مسعود صاحب کے گھر پر ہم لوگ چھوٹی چھوٹی مخصوص نشستیں منعقد کیا کرتے تھے جن میں نیر بھائی کی ہدایت کے مطابق شرکا کی تعداد آٹھ نو سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سید محمد اشرف صاحب لکھنؤ آنے کے بعد نیر بھائی کے یہاں جانے لگے "ڈار سے بچھڑے" نیر صاحب پڑھ ہی چکے تھے دوسرے افسانوں سے بھی وہ متاثر ہوئے تھے اور ان کی زبان و کہانی کی بنت کی خوب تعریف کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس دور میں اشرف بھائی جیسی زبان لکھ رہے ہیں وہ دوسروں کے یہاں دیکھنے کو اب نہیں ملتی۔

ان میں میرے اورعرفان بھائی کے علاوہ شہنشاہ مرزا، وقار ناصری، انیس اشفاق، شافع قدوائی اور کبھی کبھی تصور حسین زیدی، عثمان غنی، محسن خاں اور انیس انصاری صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ شروع شروع میں عرفان بھائی گفتگو میں شریک بھی ہوتے تھے۔ شعر بھی سناتے تھے مگر کھل کر بے تکلفی سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ یہ عام طور پر ان کا مزاج بھی تھا مگر دھیرے دھیرے نیر صاحب ان کے بہت اچھے اور بے تکلف دوست بن گئے۔ نیر بھائی بھی کبھی کبھی عرفان بھائی کے گھر آجاتے تھے۔ دونوں ادب کے علاوہ ملبوسات، فلم ڈرامے تاریخ پتہ نہیں کن کن موضوعات پر ڈھیروں گفتگو کرتے رہتے۔ اس دوستی کے پیچھے مزاج اور اقدار کی ہم آہنگی اور ادب سے گہری وابستگی بنیادی وجہ رہی ہوگی۔ اسی دوران شمس الرحمن فاروقی صاحب بھی پی ایم جی ہوکر لکھنؤ آگئے۔ اب دو کے بجائے تین دوست لکھنؤ میں یکجا ہوگئے تھے۔ یہ دور ادبی اور ذہنی آسودگی کے لحاظ سے عرفان بھائی کی زندگی کا سب سے بہترین دور کہا جاسکتا ہے۔ شب خون اور سوغات کے صفحات پر ان کی غزلیں اور نثری تحریریں اسی دور کی یادگار ہیں۔ ریڈیو پر تفہیم شعر کے سلسلے کی ان تینوں حضرات کی گفتگو معرکے کی چیز تھی۔ شعر کی تفہیم کے موضوع پر اس سطح کی علمی گفتگو بڑے بڑے سیمناروں میں بھی شاید ہی کبھی سننے کو ملتی ہو۔ بعد میں اس گفتگو کا بڑا حصہ تحریری شکل میں بھی شب خون میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

وہ اپنی شاعری کی طرح عام گفتگو میں بھی لفظوں کو بہت سلیقے اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اپنے چند مخصوص دوستوں کے علاوہ وہ احباب سے بھی زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے پن کے احساس کے ساتھ ایک خاص طرح کا حجاب بھی درمیان میں پڑا رہنے دیتے تھے۔ اس لیے دور سے دیکھنے والوں کو وہ تھوڑے خشک مزاج سے نظر آتے تھے مگر در حقیقت وہ بہت نرم مزاج، شفیق اور وضعدار انسان تھے۔ ہاں جذبات کے بے محابا اظہار سے انھیں وحشت ہوتی تھی۔ مگر ان کا چہرہ آئینہ مثال تھا اس میں ہر طرح کے جذبات فوراً اپنا عکس دکھادیتے تھے ناگواری اور خوشی ان سے چھپائے نہیں چھپتی تھی۔

عرفان بھائی لکھنؤ سے بہت پیار کرتے تھے ان کا شعر ہے۔

چار طرف رمیدہ خوپائے ہوا صدائے ہو
میرے بغیر لکھنؤ دشت غزال کے بغیر

اور یہ واقعہ ہے کہ جب ان کا ٹرانسفر دوردرشن دہلی میں بحیثیت انگریزی نیوز ایڈیٹر کے ہوگیا تو وہ بہت افسردہ ہوگئے تھے جبکہ اس پوسٹ پر رہتے ہوئے مرکزی وزرا اور اعلیٰ افسران سے مراسم کے امکانات خاصے روشن تھے کیونکہ تب تک ڈش چلن میں نہیں آیا تھا اور دوردرشن کی خبریں پورے ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ مگر عرفان بھائی کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ طمع کا ایک ذرہ بھی اس مٹی میں شامل نہیں تھا۔

ان کے جانے کے کچھ دنوں بعد میرا ایک انٹرویو کے سلسلہ میں دہلی جانا ہوا۔ ظاہر ہے کہ میں سیدھا عرفان بھائی کے گھر گیا۔ انھیں آر کے پورم میں ایک کشادہ سا سرکاری مکان مل گیا تھا مگر مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ کئی کمرے بند ہیں اور ایک کمرے میں عرفان بھائی بستر لگائے تقریباً مسافرت کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ بیوی بچوں سے کہہ کر آئے ہوں کہ بھائی تم لوگ بیٹھو میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ انھوں نے دہلی جاتے ہی لکھنؤ واپسی کی کوشش شروع کردی تھی۔ اسی زمانے کا ان کا شعر ہے۔

ابھی کھلا بھی نہ تھا رخت شوق دلی میں
کہ پھر ہمیں کششِ لکھنؤ بلانے لگی

اور واقعی تھوڑے ہی دنوں بعد واپس لکھنؤ آگئے اور پھر وہی ہم وہی امین آباد۔

کچھ برسوں بعد ایک بار پھر ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔ میں ملازمت کے سلسلے میں پہلے ہی کانپور آگیا تھا۔ خوشی ہوئی کہ اب خوب ملاقاتیں رہیں گی مگر صرف تین ملاقاتیں ہی ہوسکیں کیونکہ جب میں کالج سے فرصت پاکر ان کے دفتر پہونچتا تو پتہ چلتا کہ وہ لکھنؤ روانہ ہوچکے ہیں تھوڑے دنوں بعد وہ پھر لکھنؤ پہنچ گئے۔ لکھنؤ میں ملاقات ہوتی تو وہ کچھ اس طرح خوش نظر آئے جیسے کوئی دشوار اور لمبے سفر سے گھر واپس آکر خوش ہوتا ہے۔

دفتر میں ان کا رویہ کچھ اس طرح کا تھا کہ لوگ ان کے سامنے مؤدب اور محتاط سے رہتے تھے۔ ہر چند وہ کسی کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتے تھے مگر وہ اپنے اسٹاف کے ساتھ صرف اتنی ہی گفتگو کرتے تھے جتنی ضروری ہوتی اس لیے اپنے پن کے احساس کے ساتھ ایک خاص طرح کی دوری بھی قائم رہتی تھی۔

عرفان بھائی دفتر سے گھر تقریباً روز ہی فون کرکے بی بی (اپنی اہلیہ) باتیں ضرور کرتے تھے۔ فون پر ان کی آواز سرگوشی سے بلند شاید ہی کبھی ہوئی ہو یہاں تک کہ میز کی دوسری طرف بیٹھنے کے باوجود مجھے کچھ ادھورے لفظ یا بے ربط جملوں کے علاوہ پوری گفتگو کبھی نہیں سنائی دی۔ وہ ویسے بھی فون پر بلند آواز میں گفتگو کرنا تو دور سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دن دفتر ہی کے ایک صاحب فون پر باآواز بلند کسی سے ہم کلام تھے۔ عرفان بھائی ادھر سے گزرتے ہوئے رک گئے جب گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تو بولے ''آپ ذرا سی اور کوشش کرلیتے تو فون کے بغیر بھی گفتگو ہوسکتی تھی''۔ وہ عام طور پر نمبر ڈائل کرنے کے لیے انگلی کے بجائے قلم کا استعمال کرتے تھے۔

ایک دن عرفان بھائی اور ہم لوگ نیر بھائی کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران ذکر میر اور مصحفی کی شاعری میں محبوب کے سراپا کا بیان نکل آیا۔ نیر بھائی کا اور عرفان بھائی کا بھی حافظہ بہت عمدہ تھا کئی کئی شعر میر اور مصحفی کے سنائے گئے اور ان کا تجزیہ بھی ہوتا رہا گفتگو کے آخر میں نیر بھائی نے کہا عرفان صاحب آج کل کے شاعروں کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بیچاروں نے شاید عورت کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے اچھی عشقیہ شاعری تو دور کی بات ہے۔ عرفان بھائی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ نیر صاحب دیکھیے یہ فقیر کچھ کوشش کرتا ہے۔

اس کے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد شب خون اور سوغات میں عرفان بھائی کی بالکل نئی طرح کی شاعری سامنے آنے لگی۔ جو ان کے دوسرے مجموعوں سے بہت مختلف تھی یہاں عشق کے مختلف ابعاد پر مشتمل بہت پراثر اور خوبصورت شاعری سامنے آرہی تھی اور ان کے پرستار خوب خوب داد دے رہے تھے۔ سوغات کے مدیر محمود ایاز کا خیال تھا کہ عرفان صاحب کسی سے عشق میں مبتلا ہوگئے ہیں یہ شاعری اسی کا ثمرہ ہے۔ وہ خطوط میں نیر بھائی کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ انھیں چھیڑا نہ جائے۔ عشق کی بدولت بہت اہم شاعری وجود میں آرہی ہے یہ بڑی شاعری ہے اس لیے ان سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ کی جائے یہ شاعری 'عشق نامہ' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے عہد میں اس طرح کی شاعری کسی اور شاعر کے یہاں آپ کو نہیں ملے گی۔ چند شعر دیکھیے۔

بتانِ شہر سے یہ دل تو زندہ ہو نہیں سکتا
بہت ہوگا تو میری خواہشیں بیدار کردیں گے

دیکھتے ہیں تو لہو جیسے رگیں توڑتا ہے
ہم تو مر جائیں گے سینے سے لگا کر اس کو

چمک گیا تھا کبھی ہجر پیرہن اُس کا
بدن سے لپٹی ہوئی بے حجابی رہ گئی ہے

کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدر منیر
ہم تو سمجھتے تھے کہ سورج کو گہن لگنے لگا

تمام تاب و تبِ عاشقی بہانہ ترا
بدن کسی کا بھی ہو وصل جاودانہ ترا

ترے سوا کوئی کیسے دکھائی دے مجھ کو
کہ میری آنکھوں پہ ہے دستِ غائبانہ ترا

عجب گداز پرندے بدن میں اڑتے ہوئے
اسے گلے سے لگائے زمانہ ہوتا ہوا

تم کیا شررِ عشق لیے پھرتے ہو صاحب
اس سے تو زیادہ پہ پروانہ اٹھالے

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جان من اور نہاں
دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ سب مرے
رازدانوں میں ہیں

اگر عرفان بھائی صرف 'عشق نامہ' جیسا مجموعہ اُردو دنیا کو دے جاتے تب بھی میرا خیال ہے کہ ادب میں ان کا نام اتنی ہی عزت اور احترام سے لیا جاتا جیسے لیا جارہا ہے۔ اس طرح کی شاعری صرف اور صرف عرفان بھائی سے منسوب ہے اس کی کوئی دوسری مثال ہمارے سامنے نہیں ہے۔

عرفان بھائی دوستوں کے جملوں اور لطیفوں پر بھی مسکرادیتے تھے دل کھول کر ہنستے۔ میں نے انھیں بہت کم موقعوں پر دیکھا اس وقت مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ہم لوگ ایک اتوار نیر صاحب کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران حسب دستور چائے آگئی عرفان بھائی نے چائے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ صاحب چائے تو عمدہ ہے ہی کراکری بہت نفیس ہے۔ نیر صاحب مسکرادیے۔ دیر تک زہر کے اقسام اور درندوں کی فطرت جیسے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ میں سامع کے فرائض انجام دے کر عرفان بھائی کے ساتھ واپس آگیا۔ تقریباً ہفتہ بھر بعد نیر صاحب نے عرفان بھائی کے یہاں آنے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھ سے کہا پوچھ لیجیے گا کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔ عرفان بھائی بہت خوش ہوئے کہنے لگے بتادیجیے گا درویش دن بھر انتظار کرے گا۔ صبح نیر صاحب طے شدہ وقت پر آگئے ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا خیر دیر تک گفتگو جاری رہی جاتے وقت نیر صاحب نے تھیلے سے اخبار میں لپٹی ہوئی ایک بھاری سی چیز نکال کر میز پر رکھ دی اور بولے یہ میں آپ کے لیے لیتا آیا تھا۔ عرفان بھائی نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا کیا چیز ہے۔ نیر صاحب بولے آپ نے اس دن کراکری کی تعریف کی تھی۔ اتفاق سے اسی کا دوسرا سیٹ مل گیا تو آپ کے لیے لیتا آیا۔ عرفان بھائی کچھ کہنا چاہتے تھے پھر چپ ہوگئے۔ نیر صاحب کے جاتے ہی تصور حسین زیدی صاحب آگئے۔ ان کی نظر پیکٹ پر پڑی۔ عرفان بھائی نے مختصراً اس کی آمد کی روداد بیان کردی اور بولے نیر صاحب اتنے شریف آدمی ہیں کہ اب ان کی کسی چیز کی تعریف کرنے سے پہلے سوچنا پڑے گا۔ زیدی صاحب برجستہ بولے۔ بھائی نیر صاحب کی شرافت اپنی جگہ مگر ٹی سیٹ سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ آپ ان کی جس چیز کی تعریف کردیں گے وہ اسے تحفتاً آپ کو پیش ہی کردیں گے۔ عرفان بھائی دل کھول کر دیر تک ہنستے رہے پھر بولے نہیں بھائی وہ واقعی بہت شریف آدمی ہیں۔

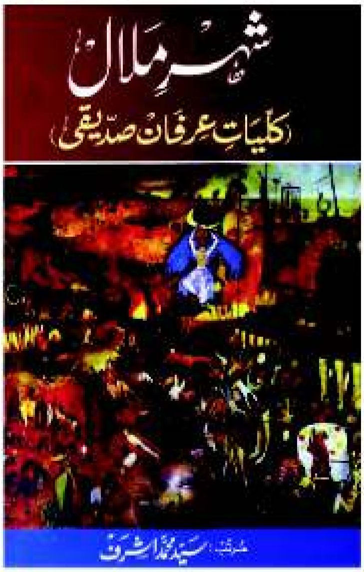

ہم لوگوں نے عرفان بھائی کے دہلی تبادلے کے موقع پر "ایک شام عرفان صدیقی کے نام" عنوان سے ایک پروگرام کا انعقاد بھی کیا تھا جس میں انھوں نے ایک شرط بھی رکھ دی تھی کہ میں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ بس شریک ہو جاؤں گا۔ پروگرام بھی ٹھیک ٹھاک ہوا بعد میں انھوں نے ہم سب کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ مگر اب احساس ہوتا ہے کہ وہ پروگرام ان کے شایان شان نہیں ہوسکا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ تقریباً پچیس سال ادھر لکھنؤ میں ادب اور قدروں کی صحت بہت اچھی تھی ہم جیسے نو واردان ادب کی دعوت پر بھی تمام نامور ادباء اور شعراء پروگراموں میں برابر شریک ہوتے تھے اور بھرپور حوصلہ افزائی کرتے تھے مگر اب پتہ نہیں فاصلے حائل ہوگئے ہیں یا لوگ سچ مچ بہت مصروف ہوگئے ہیں۔ بہر حال اپنا لکھنؤ دھیرے دھیرے گزشتہ لکھنؤ یا گم شدہ لکھنؤ بنتا جارہا ہے، خیر کم وبیش یہی صورت حال دوسرے شہروں کی بھی ہے۔

عرفان بھائی اپنے تازہ شعر نیر بھائی کو سنا کر بہت مطمئن ہو جاتے تھے نیر بھائی کی سخن فہمی کے وہ بہت قائل تھے مگر دلچسپ صورت یہ ہوتی کہ نیر بھائی ان کے اشعار کی خوبیوں پر مجھے مخاطب کرکے بتاتے رہتے کہ دیکھیے اس شعر میں کیا اور کس طرح کہا گیا ہے۔ شاید ایک دو مثالوں سے میری بات واضح ہوسکے۔ عرفان بھائی حضرت علیؓ پر اپنی منقبت نیر صاحب کو سنا رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

اک پافگار رہ گزری اور راہ میں
انبوہِ گرگ، مجمع اژدر علی علی

تو نیر بھائی نے مجھے مخاطب کیا کہ دیکھیے گرگ اور اژدر کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ خون کی بو پر دوڑتے ہیں عرفان صاحب نے کس سلیقے سے شعر کہا ہے۔ آپ لوگوں کو یہ نزاکتیں نظر میں رکھنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

اور اس شعر پر۔

نصرت کہ ہو چکے ہیں سزاوار ذوالفقار
میری زمیں کے مرحب وعنتر علی علی

نیر بھائی مجھے مرحب اور عنتر کی بہادری اور ناموری کے بارے میں بتاتے رہے اور کس جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا سامنا ہوا اور کس طرح وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے یہاں وہ عرفان بھائی سے مخاطب ہونے کے بجائے شعری محاسن پر مجھ سے مخاطب ہوتے تھے کہ دیکھیے اچھا شعر کن بنیادوں پر اچھا ہوتا ہے۔

روشن ترے چراغ یمین و یسار میں
دونوں حوالے میرے منور علی علی

نیر بھائی یمین و یسار کے ساتھ چراغ کی معنویت پر مجھے سمجھانے کے لیے روشنی ڈالتے رہتے اور عرفان بھائی کا چہرہ دمکتا رہتا۔

یا دوسری منقبت کا یہ شعر۔

آئینے خوش ہیں کہ اڑ جائے گی سب گردِ ملال
شہر میں رقصِ ہوا ہوگا علی آنے کو ہیں

یہاں آئینے کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھے ہی مخاطب کرتے۔

اور افق تک ہر طرف روشن چراغوں کی فصیل
داغِ دل کا سلسلہ ہوگا علی آنے کو ہیں

داغِ دل کو چراغوں کی فصیل کہنے پر بھی وہ داد عرفان بھائی کو دینے کے بجائے مجھے سمجھاتے کہ کس سلیقے سے شعر کہا گیا ہے۔

عشق نامے کے شعروں کی داد بھی وہ اسی طرح دیتے تھے اصل مخاطب عرفان بھائی ہوتے تھے مگر شعروں کی خوبیاں مجھے بتائی جاتی تھیں۔ صرف ایک شعر پر بات ختم کرتا ہوں۔

بتانِ شہر سے یہ دل تو زندہ ہو نہیں سکتا
بہت ہوگا تو میری خواہشیں بیدار کردیں گے

مضمون کے نئے پن کی داد بھی میرے حوالے سے ہی عرفان بھائی تک پہنچی تھی۔ یہ نیر بھائی کا عرفان بھائی کے ساتھ خاص انداز تھا۔

عرفان بھائی کے تصور حسین زیدی صاحب کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم تھے دونوں میں قدر مشترک میر کی شاعری تھی دونوں حضرات میر کی شاعری پر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ مجھے کچھ شعروں پر ہونے والی گفتگو کے کچھ حصے اب تک یاد ہیں۔ مثلاً پیکر تراشی کے حوالے سے میر کے درج ذیل شعر پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

نشوونما ہے اپنی جوں گرد باد انوکھی
بالیدہ خاک رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

دونوں حضرات اس بات پر متفق تھے کہ پیکر تراشی کا ایسا عمدہ شعر جدید شاعروں کے یہاں بھی آسانی سے نہیں مل سکتا۔ خاک رہ کو شجر بنانا اور اس میں بالیدگی کا تصور پیدا کرنا میر کا اعجاز ہے۔ وغیرہ

دوسرا شعر میرے حافظے میں یہ ہے۔

کیا جانے چشم تر کہ پرے جی کو کیا ہوا
کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

چشم تر کے پرے یعنی اُدھر اور سمندر کے پار کی خبر کا نہ معلوم ہونا اور چشم تر اور سمندر کے مناسبات پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور اس طرح کے بہت سے شعر ہیں جو میرے حافظے میں موجود ہیں یہاں صرف نمونے کے لیے دو شعر ہی پیش کیے گئے ہیں۔

جہاں شمس الرحمٰن فاروقی کی تفہیم میر سے عرفان بھائی پوری طرح متفق کبھی نہیں ہوسکے۔ ان کا خیال تھا کہ فاروقی صاحب نے غالب کی شاعری کو پرکھنے کے لیے جو پیمانے وضع کیے تھے ان کا اطلاق میر پر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس پیمانے کے اطلاق سے میر کی کیفیت والے شعروں کا خون ہوجاتا ہے۔ اُن کے خیال میں میر کے بہت سے شعر سن کر یا پڑھ کر اچھا قاری صرف خاموش ہوسکتا ہے اور اُس کیفیت کا لطف لیتا ہے۔ تشریح سے یہ لطف غارت ہوجاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'شعر شور انگیز' کا جب میں نے لکھنؤ میں رسم اجرا کیا تو عرفان صدیقی نے فاروقی سے یہ سوال پوچھا تھا اس کے جواب میں فاروقی صاحب کوئی معقول دلیل نہیں پیش کر پائے۔ انھوں نے اتنا ضرور کہا تھا کہ میں کیفیت کی تعریف ضرور لکھوں گا پتہ نہیں آپ لوگ کیفیت سے کیا مراد لیتے ہیں؟ مگر اپنے آخری وقت تک میری معلومات کی حد تک کیفیت کی تعریف کہیں تحریر نہیں کی ہے۔

لکھنؤ سے 86 میں کانپور آنے کے بعد عرفان بھائی سے میرا رابطہ برابر قائم رہا۔ ان کی بیماری کے دنوں میں بھی ان سے دو تین ملاقاتیں رہیں۔ اسی دوران وہ کانپور کی ایک مخصوص ادبی نشست میں بھی شہر یار صاحب کے ساتھ شریک ہوئے تھے مگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے اس پروگرام میں نہیں جاسکا تھا۔ جس کا مجھے اب تک افسوس ہے اسی کے تھوڑے دنوں بعد میں شاہد اختر اور ظفر غازی کے ساتھ عرفان بھائی کے گھر گیا۔ ملاقات پر وہ بہت خوش اور زندگی سے بھرپور نظر آئے اور بتایا کہ آپریشن کامیاب رہا۔ اب اوڈین سنیما ہال کے پاس کسی اچھے ہومیو پیتھ کا علاج چل رہا ہے جس سے وہ پوری طرح مطمئن ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہوا۔

دوسری مرتبہ شافع قدوائی اور ڈاکٹر عارف ایوبی کے ساتھ ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا اور دیر تک کانپور کے احباب اور علی گڑھ کا ذکر رہا۔ وہ شاید خود بھی اپنی بیماری کو بھول گئے تھے ہم لوگوں کو بھی اس کا ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا مگر تیسری بار شاید اختر اور ظفر کے ساتھ میں نیر صاحب کی مزاج پرسی کے لیے لکھنؤ گیا تو انھوں نے بتایا کہ عرفان صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہم لوگ عرفان بھائی کے گھر گئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور جمیلہ بھابھی بھی عیادت کے لیے ان کے گھر آئے ہوئے تھے مگر وہ دوا کے اثر سے نیند اور غفلت کی ملی جلی کیفیت میں تھے ملاقات نہیں ہوسکی بی بہت گھبرائی ہوئی تھیں ہم لوگ انھیں کھوکھلی سی تسلی دے کر مایوس واپس آگئے۔ کچھ دنوں بعد ایک دوپہر ضیا فاروقی نے لکھنؤ سے فون پر اطلاع دی کہ عرفان بھائی کا انتقال ہوگیا ہے وہ وہیں ہیں اور مٹی اٹھنے والی ہے اور اتنا وقت نہیں ہے کہ میں کانپور سے آکر ان کے آخری سفر میں شریک ہوسکوں۔ اس وقت میرا ہی ایک شعر میری کیفیت کی ترجمانی کر رہا تھا۔

بس ایک خبر سنی تھی کہ محسوس یوں ہوا
کچھ تھا جو میرے سینے کے اندر نہیں رہا

انھیں شروع سے ہی لکھنؤ کی سرزمین بہت پرکشش لگتی تھی اور آخر آخر وہ اسی زمین کا پیوند ہوگئے۔

شاعری میں وہ کسی گروپ کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں جدید شعرا کی سکہ بند لفظیات دور دور تک نظر نہیں آتیں۔ یہاں نہ صحرا ہے نہ سایا ہے نہ بے چہرگی ہے۔ نہ ان کے یہاں ترقی پسندوں والی انسان دوستی۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ظالم اور مظلوم کا رشتہ ہے جسے انھوں نے پوری تخلیقی توانائی اور فنکاری کے ساتھ برتا ہے۔ شاید یہی موضوع انھیں کربلا کے استعاروں کی طرف لے گیا۔ وہ ماضی کی طرف لالچ بھری نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ماضی کی شعری اور تہذیبی روایات ان کی شاعری کی پشت پر ہمیشہ موجود رہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بغیر بڑی شاعری ممکن ہی نہیں ہے مگر اردو والوں کی بھی تو اپنی روایت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ دیر سے جاگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب سورج سر پر آگیا ہے۔ اب اردو والوں کو جاگنا ہی ہوگا۔

علم کے ساتھ ان کا معاملہ بہت ذاتی اور داخلی نوعیت کا تھا انگریزی کے ساتھ فارسی اور سنسکرت ادبیات سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ کالی داس کی دو تخلیقات رت سنگھارم اور مالویکا اگنی مترم کا انھوں نے بہت عمدہ منظوم ترجمہ پیش کیا۔ رابطہ عامہ پر انگریزی کی ایک مشہور کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ تقسیم کے پس منظر میں ایک ناول بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہجرت کے موضوع پر تو خاصا کچھ لکھا گیا ہے مگر وہ جو یہاں رہ گئے اور راتوں رات جن کی دنیا بدل گئی اور پشتوں کے روابط اور مشترکہ تہذیب ایک ہی پل میں بے معنی ہوگئی۔ ان کا المیہ بھی ہجرت کرنے والوں سے کم نہیں ہے۔ یہ ایک بڑے ناول کا موضوع ہوسکتا ہے مگر اپنی مصروفیات یا شاعری سے گہرے سروکار کی وجہ سے وہ یہ ناول لکھ نہیں سکے ورنہ شاید اردو کو ایک اور اہم ناول مل جاتا۔

عرفان بھائی 15 اپریل 2004 کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ وہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان کے ادبی حلقوں میں مقبول تھے اور وہاں کے ایک پبلشر کے اصرار پر ان کا ایک نامکمل کلیات 'دریا' کے نام سے ان کے رہتے شائع ہوا جس سے وہ بہت مطمئن نہیں تھے۔

عرفان بھائی کے جانے کے بعد سید محمد اشرف صاحب نے ارادہ کیا کہ ہندوستان میں ان کا ایک کلیات شائع ہونا چاہیے۔ انھوں نے بی (عرفان بھائی کی اہلیہ) سے کچھ ایسی غزلیں بھی حاصل کرلیں جو کسی مجموعے یا رسالے میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے حکم پر جو بھی کلام مجھے دستیاب ہوا سب ملا کر ممکن حد تک ان کا سارا کلام یکجا ہوگیا۔ پروف ریڈنگ قاری قاسم حبیبی اور میں نے مکمل کرلی۔

اشرف صاحب نے 'شہر ملال' کے نام سے جو ان کی شاعری کے لیے ہر لحاظ سے نہایت موزوں ہے۔ بہت خوبصورت کلیات 2016 میں شائع کردیا کلیات کی خوبصورتی عرفان بھائی سے سید محمد اشرف صاحب کی محبت اور عقیدت کا اعلانیہ ہے۔

■

Shoeb Nizam
105/591 Hafiz Hleem Compound
Bhannana Purwa, Chaman Ganj,
Kanpur- 208001 (UP)
Mob.: 8960416841

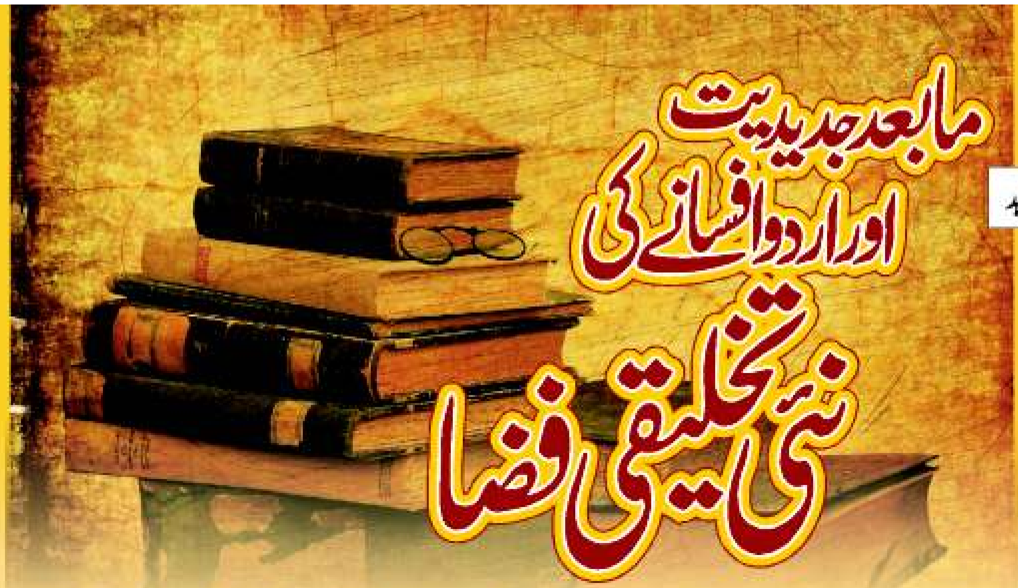

مابعد جدیدیت اور اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا

پیرزادہ محمد زاہد

اردو افسانہ اپنے آغاز سے ہی زمانے کی تغیر پذیر صورت حال کو منعکس کرنے کی پوری قوت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف ابتدا سے لے کر مابعد جدید دور تک مختلف ادبی رویوں کے زیر اثر پروان چڑھی۔ اس صنف نے ہر دور میں تغیر پذیر معاشی و معاشرتی صورت حال کا ساتھ دیا۔ چونکہ ہر زمانے کا ادب اپنے تخلیقی اظہار کے لیے بعض امتیازی نشانات کا تعین ضرور کرتا ہے اس لیے افسانہ بھی اپنے تخلیقی اظہار میں مختلف رویوں اور رجحانات سے وابستہ ہو کر مختلف اور متنوع تصورات کو نشان زد کرتا ہے۔

جس طرح جدیدیت ترقی پسندی کے بعد کا زمانہ ہے اور اس سے انحراف بھی، نیز اسی طرح مابعد جدیدیت جدیدیت کے بعد کا زمانہ ہے اور اس سے انحراف بھی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مابعد جدیدیت نظریہ نہیں، نظریوں کا رد ہے۔ دوسرے لفظوں میں آزاد تخلیقیت جس پر نئی پیڑھی زور دیتی ہے اس کا دوسرا نام مابعد جدیدیت ہے۔ اس اعتبار سے مابعد جدیدیت کی راہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے الگ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی سکہ بند نظریے کو نہیں مانتی لیکن آزادانہ آئیڈیولوجی کے تخلیقی تفاعل کی منکر بھی نہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد کے (یعنی مابعد جدید) ادب کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس میں سماجی سروکار ابھرا اور سطحی نہیں کیونکہ وہ کسی پارٹی مینی فیسٹو کا محتاج نہیں بلکہ فنکار کی تخلیقی بصیرت کا پروردہ ہے۔''

(نارنگ، گوپی چند، جدیدیت کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2005، ص 91)

مابعد جدید دور میں آنے والے تنقیدی نظریات دراصل ادب کو پرکھنے اور جانچنے کے مختلف اور متنوع tools ہیں جو حسن و قبح سے زیادہ فن پارے کی کثیر الجہتی اور وسیع المعانی کی ترجیحی صورتوں پر دال ہے، اور جب فن پارے کے پرکھنے اور جانچنے کے رویے اور تصورات تغیر و تبدل سے گزر جاتے ہیں تو تخلیق ادب کے طریقے بھی از خود بدلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح 1980 کے بعد بھی تخلیق ادب کے طریقوں نے کروٹ لی جسے ہم مابعد جدید ادب کے نام سے جانتے ہیں۔ اگرچہ مابعد جدید دور سے قبل بھی مابعد جدید تصور ادب کی مثالیں ملتی ہیں لیکن تب اس کی صورتیں انفرادی سطح پر دیکھی جا سکتی ہیں اور اب اس نے ایک جماعت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مابعد جدیدیت اپنے سابقہ رویوں کی فارمولائی تعریفوں کے انکار کا ایک نیا رجحان ہے۔ اس رویے نے ترقی پسندی کے شدت پسندانہ اور رومانی تصور پر کاری ضرب لگا دی اور دوسری طرف جدیدیت کی داخلیت کے محدود نظریے کو بھی رد کیا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ رجحان کلی طور پر ماقبل رویوں کے رد عمل میں سامنے آیا بلکہ اس نے پہلے سے قائم شدہ نظریوں کی ادعائیت اور جبریت کا توڑ کر کے نئے طرفوں کو منکشف کرنے کا کھلا اور آزادانہ رویہ پیش کیا۔ مابعد جدیدیت نے کلیت پسندانہ رویے سے اختلاف کرتے ہوئے تخلیقیت کے آزادانہ رویے کا پرچار کیا اور ہر طرح کی ضابطہ بندی اور فارمولہ سازی کی جبریت کا انہدام کرتے ہوئے کھلی اور آزاد فضا میں سانس لینے کا تصور رائج کیا۔ مابعد جدیدیت سے قبل اردو افسانے کے منظرنامے پر روایتی، ترقی پسندی اور جدیدیت کے قائم کردہ تصورات رائج تھے اور افسانہ انہی تصورات کی حد بندیوں کا اظہار تھا۔ ابتدا میں حب الوطنی، مشرقی تہذیبی روایات اور اخلاقی اقدار کے علاوہ رومان پرور فضاؤں، حسن و محبت کے جذبات، تخیل کی آزادانہ روایت اور زبان کی شعریت کا سہارا لیا لیکن اس نے جلد ہی حقیقت پسندانہ رویہ اپنا کر سماجی قربت حاصل کی اور یوں افسانے کی وہ صورت ماند پڑ گئی جو محض رنگین بیانی اور شاعرانہ انداز بیان سے عبارت تھی۔ رفتہ رفتہ سماج کے نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل کو مرکزیت مل گئی۔ ترقی پسندوں کی انقلابی آواز نے ہم عصر ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی مسائل کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر کے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے بہترین عناصر کو افسانوی ادب کا حصہ بنایا۔ اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی ترسیل میں در آنے والی تمام رکاوٹوں کا خیال کرتے ہوئے بیانیہ کا راست اور وضاحتی طریقہ کار اپنایا۔ تحریک سے وابستہ فنکاروں نے اجتماعیت کی انقلابی آواز بننے میں فرد کی ذات کو سرے سے نظر انداز ہی کر دیا۔ افسانہ میں خطابت، نعرہ بازی اور اشتہاریت سازی نے جگہ پائی اور افسانہ ادبی اظہار کے بجائے پروپیگنڈہ کی صورت اختیار کر گیا۔ انتہا پسندی کی اس صورت نے نئے فنکاروں کو جنم دیا جنھوں نے اپنے سابقہ رویے کی تخلیقی شناخت سے انحراف کرتے ہوئے نہ صرف موضوعی سطح پر تبدیلیوں کو افسانے کا لازمی جز و تصور کیا بلکہ اسالیب بیان میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں لا کر بیانیہ کے نئے اجزائے ترکیبی متعین کیے۔ تنہائی، بے گانگی، اجنبیت، کرب و اضطراب، اخلاقی قدروں کا زوال، نئی قدروں کی تعمیر اور ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو جگہ دے کر فرد کے داخلی مسائل کے بیان کی طرف مراجعت کی۔ علامت، تمثیل، تجرید اور ابہام کی ناقابل فہم صورتیں افسانے کی ذات کا حصہ بن گئیں۔ جس کی وجہ سے افسانے کے ترسیل میں رکاوٹوں نے جگہ پائی اور افسانہ قاری سے دور ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ گوپی چند نارنگ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''موجودہ حالات میں اس بات پر ضرور غور کر لینا چاہیے کہ اگر نئی کہانی، کہانی نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ بعض حضرات تو اس کا کوئی دوسرا 'اچھا سا' نام ڈھونڈتے پھرتے ہیں کیونکہ ایسی ناپختہ تحریروں کو نہ کہانی کہا جا سکتا ہے نہ انشائیہ، اگرچہ ایسے افسانوں میں جو کوشش ملتی ہے، وہ انشا پردازی ہی کی ذیل میں آتی ہے۔ دراصل تقلید کے جوش میں یاروں نے بستیاں بہت دور بسا لی ہیں اور کہانی کے بنیادی تقاضوں ہی کو فراموش کر دیا ہے یا پیرایۂ اظہار یا وسیلۂ بیان ہی کو مقصد بالذات سمجھ لیا ہے۔''

نارنگ، گوپی چند، فکشن شعریات تشکیل و تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

دہلی، 2009، ص 277)

جدید افسانہ جس فکری و فنی اجتہاد کا اظہار کرتا ہے اس میں سیاسی، سماجی اور عصری حالات کے ساتھ ساتھ فلسفہ وجودیت کے نمایاں اثرات کا نتیجہ شامل ہے اور فنی و تکنیکی سطح پر علامت، تمثیلیت، تجریدیت اور ماورائیت کے بڑھتے رجحان کا حصہ ہے۔ لیکن 1970 کے بعد ہی فیشن زدہ علامت نگاری اور ناقابل فہم تجریدیت سے بیزاری اور انحراف کا دور شروع ہوا اور اب فنکاروں کو یہ احساس ہونے لگا کہ بات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں شوکت حیات رقم طراز ہیں:

''انامیت اور انام افسانے کے توسط سے دراصل کہانی میں اس کے بنیادی صنفی اوصاف کی بازآفرینی خصوصاً 'کہانی پن' کی مراجعت پر اصرار کرکے ایک اجتہادی کارنامہ انجام دیا گیا۔ افسانے کو معروضیت، بیانیہ اور سماجی سروکار کے وصف سے لیس کرتے ہوئے اسے اس کے بنیادی خدوخال واپس کیے گئے۔''

(شوکت حیات، 'مابعد جدید افسانہ' مشمولہ، ادب کا بدلتا منظرنامہ، اردو مابعد جدید پر مکالمہ، مرتبہ، گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی، دہلی 2011، ص 314)

اس طرح مابعد جدید افسانے کی شروعات ہوئی اور یوں کہانی پن، ترسیل کی اہمیت، بیانیہ کی واپسی، معنوی اور تاثراتی ارتکاز جیسے صنفی نشانات روشن تر ہونا شروع ہو گئے۔

شوکت آگے حیات لکھتے ہیں:

''ایسا نہیں کہ 70 کے بعد والوں نے جدید افسانے سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس نسل کے بڑے بھائیوں سے پروپیگنڈہ، نعرے بازی اور اشتہاریت سے گریز کا سبق مبتدی کی طرح سیکھا۔ مخصوص عہد کے تناظر میں 'چچویشن سیریز' کی اہمیت سمجھی اور برأت کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ کر 'چچویشن سیریز' کے افسانے لکھ کر زندگی کے بدلے ہوئے سنگین منظرناموں کو گرفت میں لیتے ہوئے سماجی سروکاروں اور مسائل اور سیاسی بصیرتوں سے اپنے فن کو آمیز کیا۔ ان کی بغاوت کو افسانوی نوٹس کا حصہ بناتے ہوئے اسے روایت کا درجہ دیا۔ دیگر امور مثلاً منفی داخلیت، کہانی پن کے انہدام اور مربوط بیانیہ کی غارت گری کے خلاف انھوں نے ضرور بغاوت کی اور انھیں مابعد جدید افسانے کی روایت کا حصہ بنایا۔ یعنی 70 کے بعد جینوئین افسانہ نگاروں نے بیک وقت انحراف اور تسلسل دونوں رویوں سے کام لیا۔'' (ایضاً، ص 317)

گویا مابعد جدید افسانے کا رویہ انحراف سے زیادہ انجذاب کا ہے۔ یہ ادبی روایات کا پاسدار ہے لیکن اس سلسلے میں یہ کسی رویے یا کسی تحریک کے قائم کردہ اصولوں اور طے شدہ نظریات پر اپنی بنیاد قائم نہیں کرتا ہے بلکہ تخلیقیت کے آزادانہ رویے کی حمایت کرتا ہے۔ مابعد جدید افسانہ نگاروں نے تخلیقیت کا ایسا معتدل رویہ اپنایا جس میں ترقی پسندی اور جدید افسانوں کے مثبت عناصر کے تشکیلی پہلوؤں کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

مابعد جدید افسانہ زندگی کی ہر نوع کی حقیقتوں سے مکالمہ کرتا ہے۔ سائنس، تیکنالوجی، تغیر پذیر معاشرتی حالات، زندگی کی جدوجہد، رنگارنگی اور تحرک کو مابعد جدید افسانہ نئے لب و لہجے میں پیش کرتا ہے۔ بیانیہ کی تشکیل میں اینٹی پلاٹ، اینٹی کردار، اینٹی کہانی، ابہام یا داخلیت محض کے منہدم اسٹرکچر کی نئی تعمیر کی اور افسانے کے اجزائے ترکیبی لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے پلاٹ، کردار، کہانی پن اور آفاقیت کے بجائے سماجی مسائل پر زور دیا۔ اس نے جدیدیت کی فیشن زدہ علامت نگاری، تجریدیت کے بڑھتے رجحان اور بیانیہ کے مبہم انداز کو بھی رد کیا اور ایسی تخلیقی روش اختیار کی جو ترقی پسندی اور جدیدیت سے الگ ہوتے ہوئے بھی ان میں شامل مثبت عناصر کا اعلان نامہ بھی ہے۔ یہ رویہ اپنے اندر موضوع اور اسلوب کی سطح پر تنوع کو پسند کرتا ہے۔

مابعد جدید افسانوں میں روایتی اصولوں کے تحت داخلیت و خارجیت کے زاویوں سے انسانی زندگی کو سمجھنے اور اسے پیش کرنے کا نظریہ نہیں ملتا بلکہ ان دونوں کے باہمی امتزاج سے ایک ایسے نظریے کی تشکیل کی جس میں حقیقت اور فینٹسی دونوں شامل ہوتے ہوئے زندگی کا حقیقی اور واضح رخ سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں فنی اصول و ضوابط کا خیال کرتے ہوئے مبہم انداز بیان سے انحراف اور ترسیل کا وضاحتی اور راست طریقۂ اظہار نظر آتا ہے۔ اس دور نے اپنے موضوعات کے لیے پیچیدہ قسم کے موضوعات کے بجائے عصری مسائل کو زیادہ اہمیت دی۔ لیکن مابعد جدید افسانہ نگاروں نے سماج کو ترقی پسند زاویۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ سماجی مسائل کو تمام تر حقائق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے خطابت، اشتہاریت، اور نعرہ بازی سے بھی گریز کیا۔ انسان کی داخلی زندگی کو پیش کرنے کا وہ رویہ اپنایا کہ وہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی صورت حال کا ترجمان بن گیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے اصولوں کا خیر مقدم کرنے کے بجائے عصری حقیقت کی طرف رخ موڑ دیا۔ اس طرح انھوں نے زمانے کی نبض ٹٹول کر اس میں شامل مختلف النوع سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کی تصویر کھینچ کر افسانے کو زندگی سے فرار کے بجائے واپس زندگی کی جانب قدم کا وسیلۂ اظہار بنایا۔

مابعد جدید افسانہ نے اپنے موضوع کی تشکیلات میں محدود ہونے کے بجائے آزاد تخلیقیت کا رویہ اختیار کیا اور ترقی پسندی کی عصری حقیقتوں اور جدید افسانے کی آفاقی حقیقتوں کے اظہار محض تک خود کو مرتکز نہیں کیا بلکہ دونوں نظریوں کی آمیزش سے زندگی کے نئے معنوی ابعاد تلاش کرنے کی سعی کی۔ سماج اور فرد کو الگ الگ زاویوں سے پیش نہیں کیا بلکہ انھیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ٹھہرایا۔ اس لیے مابعد جدید افسانہ سماج سے ہوتے ہوئے فرد کی ذات تک جا پہنچتا ہے اور فرد کے اظہار میں سماجی معنویت کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی اور اس کی سچائی کو اپنے نظریے کی اصل تصور کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مابعد جدید افسانے میں محض حقیقت کی تصویر کشی پر اکتفا نہیں ملتا بلکہ حقیقت میں داخل ہو کر معنوی ابعاد دریافت کرنے کی سعی ملتی ہے۔ فنکار تمام مسائل کو سماجی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھتا ہے اور تہذیب کے ان دھاروں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے جنھیں عمومی طور پر ہماری نظریں نہیں دیکھ پاتیں۔ اس لیے مابعد جدید دور کے افسانہ نگاروں نے کسی تحریک یا رجحان کی فارمولہ سازی کے بغیر اپنی الگ اور آزادانہ فکری روش اختیار کرکے ہر طرح کے مسائل کو اہمیت دی جو اجتماعیت سے لے کر انفرادیت اور کائنات سے لے کر ذات تک کے مسائل کو ترجیحی صورتوں میں افسانوی موضوعات کا حصہ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں موجود ہر نئے اور اچھوتے موضوع کو قابل بیان سمجھا جانے لگا۔ بے روزگاری، سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی بحران، دہشت گردی، فرقہ وارانہ فسادات، نسلی اور جنسی امتیازات، مذہبی تعصبات، سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ تباہ کاریاں نیز مشرقی تہذیب سے بیزاری اور مغربی تہذیب کا بڑھتا ہوا اثر وغیرہ جیسے موضوعات پر کثیر افسانے لکھے گئے۔

مابعد جدید افسانہ نگاروں نے موضوعاتی سطح پر اردو افسانے کو آزاد فضا میں سانس لینے کی راہ دکھائی اور ان کا واضح رجحان تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی ترجمانی رہا اور بیشتر فنکاروں نے اس کی خوبصورت مثالیں بھی پیش کیں۔ سید محمد اشرف ہوں یا شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود ہوں یا سلام بن رزاق ہر ایک نے ایسے متعدد افسانے تحریر کیے جو زندگی کے ایسے نقوش پیش کررہے ہیں جو ہماری تہذیبی اور ثقافتی میراث کا حصہ ہیں۔

جدیدیت سے وابستہ فنکاروں نے جو بیانیہ قائم کیا تھا وہ بے حد پیچیدہ، مبہم اور علامتی تھا جس کی وجہ قاری تک کہانی کی ترسیل کافی حد تک مشکل ہوگئی تھی، اس دور کے فنکاروں نے یہ رویہ اپنا کر یہ بتایا کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اپنے لیے لکھ رہا ہے، اسے قاری سے کیا غرض۔ وہ کسی بھی

قسم کی شراکت داری برداشت نہیں کرسکتا۔ مابعد جدید فنکاروں نے کہانی پن کی مسخ شدہ صورت پھر سے بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی اور کہانی کو اس طرح راست بیانیہ سے ملبوس کیا کہ یہ دور بیانیہ کی واپسی کا دور کہا جانے لگا۔ مابعد جدید فنکاروں نے جس بیانیہ کو تخلیقی عمل کا حصہ بنایا وہ از سر نو قاری سے اپنا رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہ بیانیہ ترسیل میں رکاوٹیں پیدا نہیں کرتا بلکہ قاری کی شراکت داری کو لازمی تصور کرتا ہے اور قاری کی اس شمولیت نے افسانے میں درآنے والی غیر ضروری علامتوں اور تمثیلوں کو کہانی کا حصہ بننے نہیں دیا۔ موضوعاتی تنوع اور راست بیانیہ کے ساتھ ساتھ تکنیک کی سطح پر بھی نئی نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس حوالے سے سید محمد اشرف یوں رقم طراز ہیں:

''1980 کی دہائی جدید ٹیکنالوجی کو برصغیر میں عروج پاتا دیکھتی ہے۔ یہ ٹیکنالوجی خلائی سرگرمیوں سے لیکر میڈیا تک پھیلی ہوئی ہے عام انسانوں کی زندگی سے ٹیلی ویژن قریب ہوا اور افسانہ نگاری نے اپنی کہانی میں ویڈیو تکنیک کی نیرنگیاں دکھائیں۔ فوٹوگرافی تکنیک، فلیش بیک کے نئے انداز، بات کو ادھورا چھوڑ کر ایک نئے سین کے ساتھ دوسری بات شروع کرنا، چہرے کے تاثرات کو بعینہ کاغذ پر اتار دینا، خارجی زندگی کے مظاہر کی مدد سے داخلی زندگی کے معاملات کی ترجمانی کرنا وغیرہ وغیرہ............ اور اب چیزیں کیسی نظر آتی ہیں یا ہم انھیں کس روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، اس پر بیانیہ کی تکنیک کی بنیاد رکھی گئی''

(محمد اشرف، سید، 'اردو میں مابعد جدید افسانے کے تشکیلی عناصر کی شناخت۔ کچھ اشارے' مشمولہ ادب کا بدلتا منظرنامہ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ، گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی، دہلی 2011، ص 308)

مابعد جدید دور سے قبل لکھے گئے افسانوں میں زیادہ تر ڈائلاگس پر فوکس ملتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دوران ہمارے سماج میں ریڈیو کا تصور عام تھا اس لیے افسانے میں آوازوں کے ذریعے متاثر کرنے والے ڈائلاگس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن بعد میں ویڈیوز اور ٹیلی ویژن کے تصور نے فنکاروں کو ایسی کہانیاں لکھنے پر مجبور کیا جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ ہم چیزوں کو سننے سے زیادہ اسے اصلی روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ مابعد جدید دور میں ایسی کئی کہانیاں لکھی گئیں جس میں اس طرح کی تکنیک (فلمی تکنیک) کا استعمال کیا گیا۔ محسن خان کے افسانہ زہرا کو دیکھیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فلم چل رہی ہو۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''واپسی کے سفر میں جمیل نے کہا۔''کھڑکی کی طرف بیٹھ جاؤ۔''

''ادھر ہوا آتی ہے۔'' اس نے کہا۔ حالانکہ اس وقت بڑا حبس تھا۔ اس کے انکار سے جمیل کے چہرے پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں ہوا وہ اک اطمینان کے ساتھ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔

''یہ سیب پکڑو۔'' انھوں نے پالی تھین اس کی طرف بڑھائی اور سنگی دبا کر شیشے کا فریم اوپر چڑھایا پھر گریبان کے بٹن کھول کر کالر پشت کی طرف اچھال دیا۔ منھ زور ہوا تو جیسے شیشے کے اس طرف پر تولے کھڑی تھی بھرا مار کے اندر آگئی۔

''بھائی جان جس راستے سے گئے تھے اسی راستے سے واپس آئے۔ وہی'

خوب اونچی سی عمارت... وہی بڑی سی پارک... گندی تصویروں والا سینما ہال... آہستہ آہستہ چلتا ہوا خوب بڑا سا پنکھا اور... وہی سب چیزیں جو جاتے وقت دیکھی تھیں...''

(محسن خان، 'زہرا' مشمولہ خواب کہانی، نیو پبلک پریس دہلی 1993، ص 28)

الغرض اس افسانے کی قرأت کے دوران یہ احساس ہوتا ہے کہ پوری کہانی ایک فلم کی طرح چل رہی ہے اور قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کہانی پڑھ نہیں رہا بلکہ دیکھ رہا ہے۔ اس طرح کی تکنیک کا استعمال مابعد جدید دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ ساجد رشید، سلام بن رزاق، انور خان وغیرہ ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی کئی کہانیوں میں فلمی تکنیک کا خوبصورت استعمال ملتا ہے اور یہی مابعد جدید افسانے کا طرۂ امتیاز بھی ہے کہ کہانی میں مختلف طریقوں سے قاری کی involvement کو برقرار رکھا جائے۔

مابعد جدید افسانے کے متن میں کرداروں کی تشکیل میں بھی نئی کوشش ملتی ہے۔ جہاں جدیدیوں نے کرداروں کی مسخ شدہ تصویر قائم کی تھی وہیں مابعد جدید فنکاروں نے کرداروں کو ان کے چہرے واپس کیے اور انھیں فطری اور اتفاقی طور پر بغیر کسی منصوبے کے تحت از خود نقل و حرکت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انھوں نے کرداروں کی تخلیق میں اس بات کا خیال رکھا کہ وہ بطور ماہر نفسیات سامنے نہ آئیں بلکہ انھیں اپنے فطری عمل میں پیش کرکے ان کے نفسیاتی عمل سے گزرنے کی راہ اختیار کی۔

مابعد جدید افسانہ نگاروں نے غیر ضروری تفصیلات و جزئیات سے گریز کرتے ہوئے قاری کی شمولیت کو کہانی کا لازمی جزو تصور کیا، جو بات قاری کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے اسے نظر انداز کرکے متن کے تفاعل، منظر کشی اور جزئیات نگاری کے اس اشاراتی اسلوب کو دریافت کیا جو فنکار کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی اس منظر کی تصویر بنانے کے تخلیقی عمل میں شامل کرسکے۔ طارق چھتاری مابعد جدید کہانی کے اس امتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''جدید افسانے کے متن میں معنی ڈھونڈنا قاری کی مجبوری تھی مگر مابعد جدید افسانے کی تشکیل کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ قاری اور مصنف مل کر متن میں معنی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے لیے مصنف متن کی تشکیل میں شعوری یا لاشعوری طور پر یہ التزام رکھتا ہے کہ قاری پڑھتے وقت متن کے Construction کو توڑ سکے اور مصنف کے اور اپنے تجربے کے امتزاج سے نئے متن کی تشکیل کرسکے، یا Creative Reading کے عمل سے گزرتے ہوئے متن میں کوئی معنی پیدا کرسکے۔ ایسا کرتے وقت قاری اس تخلیق میں برابر کا حصہ دار بن جاتا ہے۔''

طارق چھتاری، 'مابعد جدید افسانہ، اردو کے تناظر میں' مشمولہ، ادب کا بدلتا منظرنامہ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی، دہلی 2011، ص 327)

ژاک دریدا اس بات پر مصر تھا کہ حقیقت کی تلاش تو کی جاسکتی ہے جو کوئی مشکل عمل نہیں لیکن جو چیز سامنے موجود نہ ہو اسے غیاب سے جوڑ کر پر اسرار معنی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ مابعد جدید افسانے میں اسی غیاب کی اہمیت زیادہ ہے کیونکہ غیاب ہی وہ شے ہے جس کی تلاش متن میں موجود مضمر معانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے جو موجود ہے یہاں اس بات کی اہمیت کم ہوکر غیر موجودہ شے کی پیش منظریت قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ قاری اس غیر موجودگی (پس منظریت) کا توڑ کرکے پوری طرح تخلیقی عمل میں شریک ہوجاتا ہے۔ مابعد جدید دور میں ایسی کئی کہانیاں سامنے آئیں جن سے غیاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مابعد جدید افسانہ کئی معنوں میں ماقبل رویوں سے مختلف ہے اور تہہ دار بھی۔ اس کا ارتکاز تجربوں سے زیادہ فن کے بنیادی تصورات پر ہے۔ تجربات کا عمل اسے کہانی کے بنیادی اسٹرکچر سے منسلک رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت سے وابستہ فنکاروں نے بیانیہ کے اس نئی نہج کو قائم کرتے ہوئے فنکاروں کی ایک بڑی جماعت کو جنم دیا جنھوں نے کثیر تعداد میں افسانے لکھ کر افسانوی روایت میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ مابعد جدید اردو افسانے کو پروان چڑھانے میں جن افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا ان میں مشرف عالم ذوقی، سلام بن رزاق، مرزا حامد بیگ، بیگ احساس، طارق چھتاری، معین الدین جینابڑے، حسین الحق، انور خان، ذکیہ مشہدی، شفق، شموئل احمد، قمر احسن، پیغام آفاقی، شوکت حیات، محمد منشا یاد، سید محمد اشرف وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

■

Peerzada Mohd Zahid
Research Scholar, Dept of Urdu
Kashmir University, Hazaratbal
Srinagar- 190006 (J&K)
Mob.: 9906682005

صدام حسین مضطر

منفرد لب و لہجے کا شاعر
شجاع خاور

یوں تو میر اور غالب کی دلّی میں ایسے ہزاروں شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اردو شاعری کی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ مگر ایسے شعرا کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے جو شعرا کی اس بے تحاشا بھیڑ میں اپنی منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ جیسے جیسے سماجی و معاشرتی حالات کی تبدیلیوں نے شاعری کے مزاج پر اپنی چھاپ چھوڑی ویسے ویسے شعرا کا مزاج بھی تبدیل ہوا۔ خاص طور پر 1935 یعنی ترقی پسند تحریک کے وجود کے بعد اردو شاعری کا پورا منظر نامہ ہی تبدیل ہوگیا۔ آگے چل کر حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت نے اردو شاعری کے مزاج کو قدرے متاثر کیا۔ اس گہما گہمی کے دور میں ہر شاعر نے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق شاعری میں نئے نئے رنگ بھرنے اور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی، اس کوشش میں کچھ شعرا کامیاب ہوئے تو کچھ وقت کے ساتھ ساتھ گم نامی کا شکار ہوگئے۔ شجاع خاور کا شمار ان باکمال شعرا میں ہوتا ہے جو مکمل طور پر اپنی منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔

شجاع خاور بیسویں صدی کے نصف آخر کی دہلی کا وہ اہم شاعر ہے جس نے دور حاضر کے اردو ادب کے نامور ناقدین سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ وہ 24 دسمبر 1948 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے گلی کوچوں میں پلے بڑھے اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کی۔ 1973 میں UPSC کا اعلیٰ امتحان پاس کرکے IPS کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 20 سال تک اسی عہدے پر اپنی خدمات انجام دے کر استعفیٰ دے دیا۔ اسی دوران ان پر فالج جیسی جان لیوا بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ سولہ برس کی طویل مدت تک آپ اس بیماری سے دوچار رہے۔ آخرکار 20 جنوری 2012 کو دل کا دورہ پڑنے پر انھوں نے اس دار فانی کو الوداع کہہ دیا۔

شجاع خاور نے اپنی شاعری کے ذریعے جن سربرآوردہ ناقدین کی توجہ اپنی جانب مرکوز کی ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ظ۔ انصاری، پروفیسر محمد حسن، آل احمد سرور، خلیق انجم، مظفر حنفی اور شمیم حنفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دہلی کے اس باکمال شاعر کو ناقدین نے کہیں قلندر تو کہیں دہلی کے البیلے شاعر کے نام سے یاد کیا۔ یقیناً جس ڈھنگ سے شجاع خاور نے اپنے جذبات و احساسات کو شاعری کی لڑی میں پرویا وہ ایک بے باک اور قلندرانہ طبیعت کا مالک ہی انجام دے سکتا ہے۔ شجاع خاور نے اردو شاعری میں صرف زبان و بیان کی سطح پر ہی انفرادیت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ موضوعات کی سطح پر بھی اپنا منفرد انداز اختیار کرکے قارئین کے سامنے چونکا دینے والے تجربات پیش کیے۔ شجاع خاور کو الفاظ کے استعمال پر بے پناہ قدرت حاصل تھی، وہ جا بہ جا اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور لفظوں کے آڑے ترچھے استعمال سے اپنے کلام میں ایک اجنبیت سی پیدا کردیتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن اپنے مضمون 'شجاع خاو اور مصرع ثانی' میں ان کے اس انداز کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایک جملے میں کہنا ہو تو شجاع خاور کی شاعری کو مانوس اجنبیتوں کی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ ہر لفظ مانوس جانا پہچانا ہے۔ مگر شجاع خاور کو کچھ ایسا گر یاد ہے کہ یہی مانوس جانے پہچانے لفظ انوکھے بانکے ترچھے اجنبی سے ہو جاتے ہیں اور ان میں طرفگی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے ان مانوس اجنبیتوں کے سہارے شاعر نے ست رنگی دنیا سجائی ہے۔" (رسالہ ادب ساز: جنوری تا مارچ 2015، ص 99)

یقیناً شجاع خاور کو ایسا گر یاد ہے جس کے استعمال سے وہ سامنے کی باتوں کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان میں مانوسیت ہوتے ہوئے بھی اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے اور بسا اوقات یہی اجنبیت قاری کے لیے لطف اندوزی کا سبب بھی بنتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یا تو جو نافہم ہیں وہ بولتے ہیں ان دنوں
یا جنھیں خاموش رہنے کی سزا معلوم ہے

یہ واقعی بڑے ہی تعجب کی بات ہے
دنیا اسی جگہ ہے قیامت کے باوجود

شجاع خاور نے اپنے اشعار میں جھوٹے اور بناوٹی دلاسوں کی بخیہ صاف گوئی اور اچھوتے پن سے ادھیڑی ہے یقیناً یہ کام وہی شاعر انجام دے سکتا ہے جس کو زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ لوگوں کے اذہان سے بھی بلا کی واقفیت ہو۔ مزید یہ کہ بے ساختگی، بے باکی اور صاف گوئی شجاع کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں بے خوف و خطر اور بے تکلف انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دل کی باتیں دوسروں سے مت کہو لٹ جاؤ گے
آج کل اظہار کے دھندے میں ہے گھاٹا بہت

کل یہ منصوبہ بنایا ہم نے پی لینے کے بعد
آسمانوں کو زمینوں پہ اتارا جائے گا

مرے حالات کو بس یوں سمجھ لو
پرندے پر شجر رکھا ہوا ہے

'لٹ جاؤ گے'، 'دھندھے' اور 'گھاٹے' جیسے الفاظ کا اتنی خوبصورتی سے استعمال وہ بھی بلا کسی تکلف، غیر سنجیدگی، تصنع اور بناوٹ کے اور مزید یہ کہ آسمانوں کو زمینوں پر اتارنے کا منصوبہ اور وہ بھی پی لینے کے بعد اور پرندے پر شجر رکھ دینے کا ہنر شجاع خاور ہی جانتے ہیں۔ آسمانوں کو زمینوں پر اتار لانے کا عمل اتنا آسان نہیں ہے جتنا شاعر نے اس شعر میں کر دکھایا ہے یعنی یہ وہ مشکل کام ہے جسے انسان عالمِ خودی میں انجام نہیں دے سکتا لیکن عالمِ بے خودی میں جا کر اسے سر کرنے کا حوصلہ ضرور رکھتا ہے۔ دراصل یہاں سے شاعر داستانوی دنیا کی جانب سامانِ سفر باندھتا ہوا نظر آتا ہے یہ وہ رویہ ہے جسے روایت کی پاس داری یا اپنی روایت کی طرف پلٹنے کے عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان اشعار میں کچھ ایسا انوکھا پن ہے کہ شاعری سے تھوڑا بہت شغف رکھنے والا شخص بھی ان اشعار کو بار بار پڑھنے اور سر دھننے پر مجبور ہوتا ہے۔

عام انسانوں میں رہ کر عام انسانوں کی زبان میں شاعری کرنا تو آسان ہو سکتا ہے البتہ عام لوگوں کی زبان میں شاعری کرنا اور اس میں ادبی حسن کو برقرار رکھنا قدرے مشکل کام ہے۔ شجاع خاور نے اس مشکل کام کو آسان بنا کر پیش کیا اور کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ شعرا کی بھیڑ میں ان کو ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے شناخت بھی حاصل ہوئی۔

یہ تو سبھی کہتے ہیں کوئی فکر نہ کرنا
یہ کوئی بتاتا نہیں ہم کو کہ کریں کیا؟

اب پھرتے ہو بے یار و مددگار میاں جی
ہاں اور بنو صاحبِ کردار میاں جی

شجاع خاور کی شاعرانہ انفرادیت میں جو چیز مزید اضافے کا سبب بنی ہے وہ ان کا طنزیہ مزاج ہے۔ چونکہ شجاع خاور زمینی سطح پر کام کرنے والے شخص ہیں، انھوں نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کو بہت قریب سے دیکھا، جانچا اور پرکھا ہے اور مختلف طرح کے تجربوں سے دوچار بھی ہوئے ہیں۔ انھی تجربوں نے شجاع کے مزاج میں ایک طنز والی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے، لیکن شجاع کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس طنزیہ کیفیت سے شاعری میں نئے نئے رنگ تو بھر دیے مگر اس کیفیت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کے پاس اپنی بات کہنے کا جو انداز ہے اس میں انھوں نے میانہ روی سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے حالات کو طنز کا نشانہ تو بناتے ہیں لیکن کچھ اس انداز کے ساتھ کہ طنز کا تیر سیدھا دل میں گھاؤ نہ کر کے ایک کسک اور گداز کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت قاری کے لیے لطف اندوزی کا سامان بھی مہیا کرتی ہے اور قاری کو اپنا مجموعی جائزہ لینے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ چند اشعار پر غور کیجیے۔

ایمان بھی ہے ختم نبوت پہ ہمارا
محسوس بھی کرتے ہیں پیمبر کی ضرورت

تم لوگ اب بھی نیک ہو حیرت کی بات ہے
تم کو کسی گناہ کا موقع نہیں ملا

شجاع خاور اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ سچا، کھرا اور ایماندار شخص محض اوروں کی ہی ذات کو اپنے طنز کا نشانہ نہیں بناتا بلکہ وہ وقفے وقفے سے خود کی ذات پر بھی طنزیہ نظر دوڑاتا رہتا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

شجاع تیری گنہ گاری کے پیچھے
ہمیں حج کا ارادہ لگ رہا ہے

لوگوں نے ہم کو شہر کا قاضی بنا دیا
اس حادثے نے ہم کو نمازی بنا دیا

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شجاع خاور کی زبان، منفرد لب و لہجے اور ان کے طنزیہ اسلوب پر کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''شجاع کا شعری سفر میرے سامنے کا ہے۔ انھوں نے اپنی آواز کو پانے کے لیے مسلسل سعی و جستجو سے کام لیا ہے۔ یہ چونکہ Doxa یعنی فرسودہ رسمیات کے خلاف ہے اور Subversion کی زبان ہے، اس لیے طنز اور تعریض اس کے خاص حربے ہیں جن سے لہجے میں ایک سفاکی سی در آئی ہے اور تیکھا پن پیدا ہو گیا ہے۔ شجاع کو سطحی رومانیت، بے تہہ جذباتیت اور خود ترحمی سے جو روایتی شاعری کا Stock-in-Trade ہے یک گونہ چڑ ہے۔ ان کے یہاں شاعری زندگی کے کارنوال پر ایک خاص بے تعلقی اور بے نیازی سے نظر کرتی اور ان دیکھے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی چلتی ہے۔ اس میں ایک قلندرانہ وضع ہے لیکن نظیرا کبر آبادی کی سیر بینی اور تہذیبی دید بازی نہیں۔ اسی طرح کا کاٹ دار اور تیکھا لہجہ یگانہ کی یاد تو دلاتا ہے لیکن شجاع کے یہاں تلخی نام کو نہیں۔ تیور البتہ ہیں اور دہلی کی مڑک بھی۔''

(رسالہ ادب ساز، جنوری تا مارچ 2015، ص 90)

شجاع خاور کا زمینی تجربہ بے حد وسیع ہے وہ داخلی حقائق کے ساتھ ساتھ خارجی حقائق پر بھی مضبوطی کے ساتھ اپنی پکڑ بنا کر رکھتے ہیں اور ان کو وقتاً فوقتاً اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ مثلاً:

شور کرتے ہیں یہ مؤذن جب
سننے دیتے نہیں اذان تلک

ذات کا گھر چھوٹا ہے بہت
خاور اور کوئی گھر دیکھ

تیکھے تیور یا مزاج کا طنطنہ یہ وہ خصوصیات ہیں جو عام طور پر ہر کسی کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ خواہ وہ اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں یا درمیانی اور نچلے طبقے سے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا کم پڑھے لکھے، اونچے عہدوں پر فائز ہوں یا پھر محنت و مزدوری کرنے والے لوگ، ہر طبقے کا فرد زندگی میں مزاج کی برہمی اور حالات سے بے زاری کی کیفیتوں سے گزرتا ہے، لیکن جہاں تک ان کیفیات سے متعلق اظہار کا تعلق ہے تو اس کی نوعیت قدرے مختلف ہوتی ہے۔ جیسے جیسے انسان کی حیثیت اور مرتبے میں تبدیلی آتی ہے ویسے ویسے اس کے محسوسات کا پیمانہ بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ شجاع خاور ایک اعلیٰ شاعر، اعلیٰ انسان اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز شخص تھے، ان کے مزاج پر بھی اس کیفیت کے اثرات نمایاں ہیں لیکن نہ تو اس میں کہیں چڑچڑا پن نظر آتا ہے اور نہ ہی خواہ مخواہ کسی کو اپنے تیکھے تیور اور طنطنے کا بے جا نشانہ بنانے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ شجاع نے جس انداز سے اپنی اس فطری خصوصیت کو شاعری میں برتا اور اس سے کام لیا ہے اس میں ایک قلندرانہ شان پیدا ہو گئی ہے جو غلط کو صاف لفظوں میں منھ پر غلط کہنے کی طاقت رکھتی ہے اور کچھ اس نرالے انداز کے ساتھ کہ سننے اور پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں بھی نہیں گزرتی اور قاری پر سلیقے سے مسرت بخش رعب اور دبدبے کی چھاپ بھی چھوڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پڑے رہیں تو قلندر اٹھیں تو فتنہ ہیں
ہمیں جگایا تو نیندیں حرام کر دیں گے

اردو شاعری کے اوراق عشق و محبت کے موضوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ جس شاعر کا جیسا تجربہ رہا اس نے ویسے ہی اس موضوع کو شعری جامہ پہنا کر پیش کر دیا۔ شجاع نے یہاں بھی اپنی الگ راہ نکالنے کی کوشش کی

ہے۔شعر دیکھیے۔

پہلے ہوا جو کرتے تھے ہم وہ نہیں رہے
دیکھو شبِ فراق ہے اور رو نہیں رہے

علاج تیرے تغافل نے کر دیا دل کا
بہت دنوں سے دماغ آسماں پہ تھا دل کا

جس طرح کلاسیکی شاعری میں عشقیہ واردات کی دوہری ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے اسی طرح شجاع خاور کے یہاں بھی عشقیہ واردات کی ترجمانی میں دورنگ نظر آتے ہیں لیکن یہاں حقیقی ومجازی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ اس دورنگی ترجمانی میں ایک رنگ وہ ہے جو نئے دور کی عشقیہ واردات کا ترجمان ہے اور دوسرا وہ جس پر کلاسیکی عشق کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔دراصل یہ وہ طریقہ کار ہے جو شاعر کی آزادیٔ فکر اور گہرے مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے اور قاری کے لیے ایک ایسی دلچسپ اور کھلی فضا قائم کرتا ہے جس میں کسی طرح کی گھٹن اور ریوریت کا احساس تک نہیں ہوتا۔اس دورنگی ترجمانی میں ایک خاص توازن برقرار رکھا گیا ہے یعنی کچھ دیر کے لیے قاری کا ذہن روایتی عشق کے لوازمات سے بھی روشناس ہوتا ہے اور دورِ حاضر کے انا گزیدہ عاشق کی عشقیہ واردات سے بھی۔اس حوالے سے چند شعر اور ملاحظہ کیجیے۔

یاں تیرے تغافل سے پریشان ہیں ہم بھی
یہ طنز کے تیور تو دکھانے کے لیے ہیں

تم سامنے ہو پھر بھی چلے آتے ہیں لب پر
وہ گیت جو تنہائی میں گانے کے لیے ہیں

دو شعر دیکھیے جو دورِ حاضر کے ایک انا گزیدہ عاشق کی عشقیہ واردات کے ترجمان ہیں۔

حالت اسے دل کی نہ دکھائی نہ بیاں کی
خیر اس نے نہ کی بات تو ہم نے بھی کہاں کی

اس کو نہ خیال آئے تو ہم منہ سے کہیں کیا
وہ بھی تو ملے ہم سے ہمیں اس سے ملیں کیا

درد کی کیفیت کا اظہار دیکھیے کس انوکھے پن سے کیا گیا ہے۔

اس کے آنے پہ بھی نہیں آئی
درد میں کچھ کمی نہیں آئی

درد میرے بعد بالکل جوں کا توں باقی رہا
جیسے مجنوں مرگیا لیکن جنوں باقی رہا

شجاع کی عشقیہ شاعری میں یوں تو محبوب بھی ہے اور حسن

بھی، بے وفائی بھی ہے اور تغافل بھی، شبِ فراق بھی ہے اور وصال بھی، چاک گریباں بھی ہے اور جیب جنوں بھی، دل کے داغ بھی ہیں اور مرہم بھی۔غرض یہاں ہر وہ سامان موجود ہے جو ہماری عشقیہ شاعری میں روزِ اول سے چلا آ رہا ہے۔اگر غور کیا جائے تو ان موضوعات کے پیشِ نظر یہاں روایت کی پاسداری بھی نظر آتی ہے لیکن اندازِ بیان بالکل منفرد اور چونکا دینے والا ہے۔یعنی یہاں نہ تو اگلوں کی طرح محبوب کی بے وفائی پر ماتم منانے کی کوشش ہے نہ شبِ فراق میں گھٹ گھٹ کر مرجانے کا ارادہ اور نہ ہی اپنے دل کے زخموں کو دوسروں کے سامنے نمائش کرنے کی بے جا کوشش۔ یہاں ایک اطمینان کی صورت ہے جو عشق کے ہر پہلو کے بیان میں شدتِ جذبات سے بالکل پاک نظر آتی ہے۔شجاع خاور کی عشقیہ شاعری کے تمام ترضمنی موضوعات سے قطع نظر ہجر و وصال کی جو کیفیت ہے وہ بالکل مختلف اور چونکا دینے والی ہے۔مثال ملاحظہ فرمائیں۔

برپا ترے وصال کا طوفان ہو چکا
دل میں جو باغ تھا وہ بیابان ہو چکا

آرزو کا شور برپا ہجر کی راتوں میں تھا
وصل کی شب کو ہوا جاتا ہے سناٹا بہت

تشنگی کا ایک اک پہلو ابھارا جائے گا
وصل کی شب کو بھی فرقت میں گزارا جائے گا

یہاں وصال طوفان برپا کر رہا ہے، شبِ ہجر میں آرزوؤں کا شور برپا ہے، وصل کی شب میں سناٹا ہے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شبِ وصل کو بھی فرقت میں گزار دینے کا ارادہ ہے۔یعنی یہ کیفیت روایتی عشق کے بالکل برعکس ہے،

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا شاعر کو وصال سے زیادہ فرقت عزیز ہے۔ان اشعار میں ایک طرح کی توڑ پھوڑ تو نظر آتی ہے لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود روایتی قسم کا کوئی شور اور واویلا نظر نہیں آتا۔ان تمام اشعار کے مطالعے سے ایک بات تو صاف ہے کہ شاعر کا مقصد محض لذتِ وصل حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ کسی اور ہی لذت کا طلب گار ہے جس کی جستجو اسے وصال کی سرحد پر آ کر ٹھہرنے نہیں دیتی۔ان اشعار میں شاعر کا ہجر و فراق سے اس درجہ لگاؤ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہجر و فراق کے لمحات میں شخصیت سازی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں یعنی ہجر و فراق کی صعوبتیں انسان کے اندر ہلچل اور بے چینی کے عناصر پیدا کرتی ہیں۔انسان مسلسل حرکت وعمل میں رہتا ہے اور مسلسل حرکت وعمل میں رہنا ہی اس کی شخصیت سازی کے لیے کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ہجر و وصال کی دنیا شجاع خاور کے یہاں بے حد طویل ہے جس میں وصل کی بآسانی فراہمی بھی موجود ہے۔وصل کے حوالے سے عشقیہ لوازمات کی بدلتی صورتِ حال کی ایسی ترجمانی کی گئی ہے جس میں عشق محض لذتِ جسمانی تک پہنچنے کا ایک آسان ذریعہ نظر آتا ہے۔اور اصل عشق پر جمود کی کیفیت طاری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔اس ترجمانی میں عاشق و معشوق کے درمیان اعلیٰ تہذیبی و سماجی اقدار کی دیوار بھی مسمار ہوتی دکھائی پڑتی ہے۔بہر حال یہ اور اس طرح کے تمام اشعار اپنے آپ میں ایک طویل بحث اور توجہ کے طالب ہیں۔حاصل کلام یہ ہے کہ شجاع خاور اپنے دور کے ایک باکمال شاعر تھے۔انھوں نے شاعری کی بنی بنائی ڈگر سے انحراف کا ایسا راستہ اختیار کیا جس میں اپنے عصری ماحول کی حقیقی داخلی و خارجی ترجمانی کے ساتھ ساتھ تہذیبی و مذہبی اقدار کی پاسداری اور سماج سے ختم ہوتی اعلیٰ قدروں کو ازسرِ نو تشکیل دینے کی عمدہ اور کامیاب کوشش بھی شامل ہے۔شجاع خاور نے اردو شاعری وار اردو زبان کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ قابلِ داد اور ناقابلِ فراموش ہیں۔شجاع نے گرے پڑے، مستعمل اور غیر مستعمل لفظوں کو جس نرالے اور اچھوتے انداز سے اپنی شاعری میں برت کر جو نیا اور منفرد لہجہ خلق کیا ہے وہ شجاع خاور کو ایک صاحبِ طرز اور صاحب اسلوب شاعر ہونے کی سند عطا کرتا ہے۔

■

Saddam Hussain
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:9520208720

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➤ editor@ncpul.in ➤ urduduniyancpul@yahoo.co.in

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار

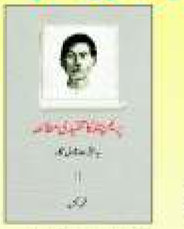

مصنف: قمر رئیس

صفحات: 378، قیمت: 220، دوسری اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: زیبا خان

62، بڑی بازار گوپامئو، ضلع ہردوئی۔ 241404 (اترپردیش)

پروفیسر قمر رئیس اردو ادب میں ماہر پریم چند کی حیثیت سے خاصے معروف ہیں۔ انھوں نے پریم چند کی تصانیف کا نہ صرف عرق ریزی سے مطالعہ کیا بلکہ اسی مطالعے کی روشنی میں پریم چند پر کئی کتابیں لکھیں۔ جو اردو ادب میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار' انہی میں سے ایک ہے۔ جو پروفیسر قمر رئیس کا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں انھوں نے پریم چند کی تخلیقی صلاحیتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ان کے ناولوں کے روشنی میں پیش کیا ہے۔

کتاب کی فہرست میں رشید احمد صدیقی کا تعارف نامہ، پہلے ایڈیشن کا دیباچہ اور تیسرے اور چوتھے ایڈیشن کا پیش لفظ بھی شامل ہے۔ فہرست ابواب کو دس زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) سوانحی حالات، (2) ذہنی اور فکری پس منظر، (3) فن اور فکر کا ورثہ، (4) ابتدائی دور کے ناول 1916 - 1903، (5) دوسرے دور کے ناول، (6) تیسرے دور کے ناول، (7) زبان اور طرز بیان، (8) پریم چند کا تصور حیات، (9) پریم چند کے ہیرو، (10) پریم چند کا مرتبہ: بحیثیت ناول نگار۔ ان ابواب کو مزید ذیلی زمروں میں تقسیم کرکے پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کی مختصر سوانح عمری سے لے کر ان کی ذہنی و فکری نشو نما، فن اور فکر پر دیگر ناول نگاروں کے اثرات، ان کی ناول نگاری کے ادوار، زبان و بیان، اور تصورات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اس وقت ملک کی کئی یونیورسٹیوں کے بی اے اور ایم اے کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

پہلے باب میں سوانحی حالات کے فن میں پروفیسر قمر رئیس نے منشی پریم چند کے بچپن، ابتدائی تعلیم، ملازمت، شادی، تبادلہ، مدرسی کا نیا دور، گورکھپور قیام، بمبئی کی ملازمت سے لے کر بیماری اور وفات تک کا احاطہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں پریم چند کے ذہنی و فکری پس منظر کو اقتصادی حالات، مذہبی اور سماجی حالات، قومی بیداری اور سیاسی جد و جہد جیسے زمروں میں تقسیم کرکے پریم چند کی فنی اور فکری نشو نما کے پروان چڑھانے میں معاون اس وقت کے عام عوامی حالات و واقعات و تحریکات کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ تیسرا باب جو فن اور فکر کے ورثے کے عنوان سے قائم کیا ہے اس میں ڈاکٹر نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ چوتھا باب پریم چند کے 'ابتدائی دور کے ناول 1916-1903' ہے، جس میں پریم چند کے ابتدائی دور کے ناول 'اسرار معابد اور ہم خرما و ہم ثواب' اور 'جلوۂ ایثار و بیوہ' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے پریم چند کے ابتدائی دور کی ناول نگاری کی فنی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ نیز ان ناولوں کا اس سے پہلے وجود میں آئے ناول امراؤ جان ادا، فسانۂ آزاد، وغیرہ سے فنی تجزیہ کرتے ہوئے پریم چند کے ان ناولوں کی فنی تکمیل، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے معیار سے فائدہ نہ اٹھا سکنے پر افسوس اور تعجب کا اظہار کیا ہے:

''یہ دونوں ناول (جلوۂ ایثار اور بیوہ) 'امراؤ جان ادا' کی اشاعت کے کئی سال بعد لکھے گئے۔ اس لیے یہ دیکھ کر کچھ تعجب ہوتا ہے کہ پریم چند نے اس ناول کی فنی تکمیل، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے اعلیٰ معیار سے فائدہ نہیں اٹھایا۔'' (ص 109)

پانچویں باب میں پریم چند کے ناولوں کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جس میں بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، نرملا اور غبن جیسے ناول منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں پریم چند کی ناول نگاری کافی حد تک نکھر کر سامنے آ چکی تھی۔ ان کا طرزِ فکر ناولوں میں نمایاں ہو کر نظر آنے لگا تھا۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس باب میں جہاں ایک طرف بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، نرملا اور غبن کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے پریم چند کی نکھری ہوئی طرزِ فکر، بیدار ہوتے ہوئے شعور کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں پریم چند کے ناولوں کی کمزور کردار نگاری کو بھی زیرِ بحث لائے ہیں۔ ناول نرملا کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلیانی، نرملا، طوطا رام، ڈاکٹر بھون موہن، رکمنی اور سدھا سب ایسے کردار ہیں جن سے قاری دیرینہ شناسائی محسوس کرتا ہے۔ لیکن چند کردار ناول میں ایسے بھی ہیں جو

قاری کو مطمئن نہیں کرتے اور جن کے وجود کے بارے میں قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ قصے کو ایک خاص سمت کو موڑنے یا کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔'' (ص 171)

چھٹا باب پریم چند کے ناولوں کا تیسرا دور ہے۔ اس دور میں منشی پریم چند نے چوگان ہستی، پردۂ مجاز، میدان عمل، گودان، منگل سوتر جیسے مشہور ناول لکھے۔ اس دور میں لکھے گئے ان ناولوں میں پریم چند نے چوگان ہستی کو اپنا سب سے بہترین ناول قرار دیا۔ قمر رئیس نے چوگان ہستی کو ان کے دوسرے ناولوں کی بہ نسبت زیادہ فنکارانہ مانتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک اچھے ناول کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے عہد کی زندگی کی وسعتوں اور گہرائیوں کا احاطہ کرتا ہو۔ اس لحاظ سے بھی 'چوگان ہستی' کو پریم چند کے دوسرے ضخیم ناولوں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کے کردار ہر طبقہ اور ہر مسلک کے نمائندہ کردار ہیں۔'' (ص 183)

اس دور کے ناولوں میں پریم چند زندگی کے بنیادی مسائل، سیاسی اور سماجی مسائل، حقیقت نگاری اور غربت و جہالت کی مصوری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس گودان کو پریم چند کا سب سے بہترین ناول مانتے ہیں۔ جس میں پریم چند کا تمام تر فکری شعور سمٹ کر قاری کے سامنے آ گیا ہے۔

ساتواں باب زبان اور طرز بیان ہے جس میں ناولوں میں زبان و بیان کے ارتقا کو ادوار میں منقسم کر کے بیان کیا ہے۔ قمر رئیس ناولوں میں واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، ظرافت نگاری کا عنوان قائم کر کے اسلوب کی سادگی، بے تکلفی، سلاست و روانی، صاف و شستہ زبان، مناظر قدرت کے موثر بیان اور ظریفانہ انداز بیان کو پریم چند کا خاص وصف گردانتے ہیں۔ آٹھویں اور نویں باب میں پریم چند کے تصور حیات اور پریم چند کے ہیرو پر تنقیدی گفتگو کی گئی۔ دسواں باب 'پریم چند کا مرتبہ بحیثیت ناول نگار ہے' جس میں پریم چند کے فکر و نظر اور فن پر مجموعی گفتگو ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں پروفیسر قمر رئیس نے 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' بہ حیثیت ناول نگار میں پریم چند کی ناول نگاری کی تمام صفات کا ذکر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے کی روشنی میں پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب اردو ادب میں پریم چند کی ناول نگاری کو سمجھنے کے لیے اسکالرز اور طلبا کے لیے کافی مفید ہوگئی ہے۔

اخبار کی کہانی

مصنف: غلام حیدر

صفحات: 134، قیمت: 95 روپے، پانچویں طباعت 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد فیصل خان، ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈیجیٹل میڈیا کے اس دور میں پرنٹ میڈیا کا چلن خاصا کم ہوگیا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج ہمیں قومی یا بین الاقوامی ہر طرح کی خبریں انٹرنیٹ کے ذریعے موصول ہو رہی ہیں۔ لیکن یہاں ایک بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں ڈیجیٹل میڈیا نسبتاً کم معتبر سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ڈیجیٹل میڈیا پر پوسٹ یا شیئر کی گئی کوئی بھی خبر کسی بھی وقت ڈیلیٹ کی جاسکتی ہے، ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ یہ خبریں سرسری یا غیر تحقیقی بھی ہوتی ہیں اور اس کے بعد یہ تصور قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس طرح کی کوئی پوسٹ ہماری طرف سے شیئر ہی نہیں کی گئی۔ جب کہ پرنٹ میڈیا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے یہاں پر شائع شدہ تمام خبریں تحقیق کے بعد ہی کسی اخبار یا رسالے میں جگہ پاتی ہیں، جس میں دیرپا فوائد پوشیدہ ہوتے ہیں جو بطور حوالہ یا دلائل کے استعمال کی جاتی ہیں۔ حالانکہ ڈیجیٹل میڈیا کی برق رفتاری اور وسیع تر حلقوں تک بآسانی رسائی نے کافی سہولتیں فراہم کر رکھی ہیں جس بنا پر اس کے فوائد سے انکار یا فرار بھی ممکن نہیں۔

آج دنیا بھر کی تقریباً تمام زبانوں میں پرنٹ میڈیا کا دائرہ کم ہوگیا ہے اور ساتھ ہی طبع شدہ مواد دور حاضر میں عہد رفتہ کی یادگار مانے جا رہے ہیں۔ لیکن زمانے کا یہ رخ ہمیں قطعی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے پسندیدہ اخبارات اور رسائل وجرائد یا پھر اچھی کتابوں کو خرید کر نہ پڑھیں اور معتبر و معیاری علم و معلومات سے نابلد رہیں۔ غلام حیدر صاحب کی تصنیف اور زیر تبصرہ کتاب ''اخبار کی کہانی' بھی اسی کی ایک کڑی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہماری نوجوان نسل اور نونہالوں کا وہ طبقہ جو لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتا ہے۔ اخبارات کے مطالعے میں بھی دلچسپی لے اور خاطر خواہ قدر کرے تاکہ ہمارے اسلاف نے اخباروں کی ترقی کے لیے جو کاوشیں کی ہیں اور جو مشقتیں اٹھائی ہیں ان کا حق ادا ہو سکے۔

'اخبار کی کہانی' پہلی بار قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 2000 میں شائع ہوئی تھی یہ اس کی پانچویں اشاعت ہے۔ اس سے مذکورہ کتاب کی اہمیت و معنویت کے علاوہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، کیونکہ کسی بھی کتاب کا دوسرا، تیسرا یا پھر اس سے زائد ایڈیشن کا شائع ہونا قارئین کی خواہش اور ڈمانڈ کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ تصنیف چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'چوتھی طاقت' کے عنوان سے ہے جس میں دو ذیلی عنوانات 'کاغذی دیو' اور 'پیغام سے خبروں تک' کے ذریعے اخباروں کی اہمیت اور اس کی ابتدائی تاریخ کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ جس میں اکبر الہ آبادی کا ایک شعر بھی موجود ہے جو مزاحیہ انداز میں اخبار کی طاقت و قوت کا بھرپور پتا دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو　　گر توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

دوسرا باب 'اخباروں کے بزرگ' کے عنوان سے ہے جس میں سات ذیلی عنوانات قائم کیے گیے ہیں۔ کتاب کے اس حصے کا مطالعہ کرنے سے ہمیں اخباروں کی روایت کا علم ہوتا ہے اور ہم بہت سے غیر ملکی اخبارات اور پریس کی ایجاد وغیرہ کی معلومات پرلطف کہانی کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں۔

تیسرا باب 'نئے اخبار' کی سرخی کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جس میں دس الگ الگ عنوان کی کہانیوں کے ذریعے اخباروں کی گوناگوں خصوصیات سے روشناس کرایا گیا ہے تاکہ قارئین کے دل میں ان کی عظمت کا احساس پیدا ہو اور وہ اخباروں کے مطالعے میں دلچسپی لیں۔

چوتھے باب کا سرنامہ 'ہندوستان اور اخبار' کے نام سے ہے، اس میں بھی سات ذیلی عنوانات ہیں جن کے ذریعے ہم ہندوستان کی صحافتی تاریخ اور اس کی ابتدا و ارتقا اور دیگر بہت سے اخبارات سے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں۔

پانچویں باب کی سرخی 'بغاوت اور بغاوت کے بعد' کے نام سے ہے، جیسا کہ سرنامے ہی سے ظاہر ہے کہ اس باب میں بغاوت کے دوران اور اس کے بعد نکلنے والے اہم اخبارات کا ذکر ہے۔ کتاب کے اس حصے میں بھی چھ ذیلی عنوانات کے ذریعے جنگ آزادی سے متعلق اخبارات کے علاوہ چند باغی اخباروں کی بھی کہانی بیان کی گئی ہے جنھوں نے آزادی کے لیے بغاوت کا علم بلند کیا۔

چھٹا باب 'اخبار کی دنیا' کے عنوان سے ہے، جس میں دو ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا عنوان 'ہم اور اخبار' کے نام سے ہے، جس میں ہمیں اخبار کی اہمیت بتائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں کہ بچوں سے متعلق چند مخصوص اخبار نکالے

جانے چاہئیں۔ دوسرا عنوان 'اخباروں کی ذمے داری' کے نام سے ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اخبار ہمارے سماج اور معاشرے کو کس طرح فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

اس کے بعد کتاب کے آخر میں 'ضمیمہ جات' کے عنوان سے ایک سرخی قائم کی گئی ہے اور چار مختلف ضمیموں کے ذریعے غیر ملکی، ہندوستانی اور مختلف زبانوں میں نکلنے والے اخباروں کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے جو قابل تعریف عمل ہے۔ اس سے مصنف کی محنت، لگن اور جستجو کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آخر میں 1619 میں لندن سے چھپے ہوئے 'کورانتو' کے پہلے صفحے اور 'آکسفورڈ گزٹ' کے ایک صفحے کا عکس بھی موجود ہے۔ قوی امید ہے کہ کتاب کا تازہ ایڈیشن بھی حسب سابق مقبولیت حاصل کرے گا۔

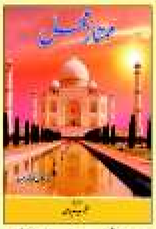

ممتاز محل

مصنف: سریش کمار ورما، مترجم: فہیم احمد

صفحات: 442، قیمت: 210 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: جمیر اعالیہ، ندوہ کیمپس، ٹیگور مارگ، لکھنؤ۔ 226007 (یوپی)

ممتاز محل مغل خاندان کا وہ نام ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ ایسی عظیم خاتون تھی جس کے اعزاز میں تاج محل جیسا شاہکار قائم کیا گیا۔ لیکن افسوس کہ ایسی مشہور و معروف ہستی کے ساتھ تاریخ نے بھی بڑی ناانصافی کا ثبوت دیا اور اس کا ذکر محض اس کے مقبرے کے ساتھ محدود کردیا گیا۔ ممتاز محل جیسی وفادار، سمجھدار اور اطاعت شعار ملکہ کہیں پس منظر میں رہ گئی اور نور جہاں جیسی چالاک، بے باک اور متحرک ملکہ نے تاریخ کے صفحات پر ہلچل مچادی۔ المیہ تو یہ ہے کہ اس غیر معمولی صلاحیت کی حامل ملکہ پر اردو زبان میں اب تک کوئی باقاعدہ ناول نہیں لکھا گیا۔

حال ہی میں ہندی زبان کے مصنف سریش کمار ورما کا ناول 'ممتاز محل' منظر عام پر آیا جس کا اردو ترجمہ فہیم احمد نے کیا ہے۔ اس ترجمے کو قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کی جانب سے دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ سریش کمار ورما نے اس ناول میں ممتاز محل کا حق ادا کردیا۔ فکشن اور تاریخ کے امتزاج سے تیار شدہ ممتاز محل کی یہ کہانی تاریخ کے کئی نہاں اوراق ہمارے سامنے عیاں کرتی ہے۔ ناول کا قصہ بظاہر ممتاز محل کے گرد بنا گیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ممتاز کی زندگی میں نور جہاں کے عمل دخل کو بھی بخوبی اجاگر کیا ہے۔ ناول کی ابتدا ہی نور جہاں (مہر النساء) اور جہاں گیر کی شادی سے ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ممتاز محل اور شاہ جہاں کی زندگی میں آنے والی کئی بڑی مشکلات کی وجہ نور جہاں تھی۔ نور جہاں کا حاکمانہ مزاج اور انا پوری اسے اپنی ہی بھتیجی ممتاز محل سے حسد اور برابری پر اکساتی تھی۔ لیکن ارجمند بانو عرف ممتاز محل کی زود فہمی اور انسان دوستی کی بنا پر اس نے کبھی نور جہاں سے کھل کر اختلاف نہیں کیا اور نور جہاں کے زوال تک اسے بھرپور عزت واحترام دیا۔

سریش کمار ورما نے جس خوبصورتی کے ساتھ ممتاز محل کی زندگی کے نشیب و فراز کو ناول کے قالب میں ڈھالا ہے اسی خوبصورتی کے ساتھ فہیم احمد نے ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ فکشن کا ترجمہ یوں بھی مشکل ہوتا ہے کہ اس میں محض لفظی ترجمے سے بات نہیں بنتی بلکہ ترجمہ نگار کو اپنی تخلیقیت بروئے کار لاتے ہوئے متن کی دلکشی و معنویت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ فن پارے کے جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ متن اور ترجمے کے درمیان دیانتداری بھی قائم رکھنی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ دوسری زبان کے الفاظ کے ساتھ اس کا تہذیبی و ثقافتی پس منظر بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ حالانکہ میرے سامنے اصل متن نہیں ہے لیکن مذکورہ ناول دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ فہیم احمد نے ترجمہ نگاری کے تمام لوازمات کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے، کیونکہ ناول کی زبان میں کہیں بھی ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ناول اسی زبان میں تخلیق کیا گیا ہو۔ ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''شہزادہ نے اس کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ حور جیسا رنگ وروپ دیکھ کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔'' مرحبا! مرحبا!! خیام یا رومی، جانے کس طرح خواب کی دل افروز تعبیر ہو تم۔ ارجمند دنیا کی ساری خوب صورتی تمھاری پناہ میں آگئی ہے۔ تمھارے بارے میں خوب سنا تھا۔ دیکھا تو کہیں زیادہ پایا۔ تمھاری شکل میں مغل حرم کو ایسا جنت نظیر پھول نصیب ہوا ہے جو اس کی تاریخ میں ہمیشہ رنگ وبو بکھیرتا رہے گا۔'' (ص 70)

ناول نگار نے ناول کی تخلیق میں تاریخی اعتبار کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ایک غیر مسلم ناول نگار کی جانب سے ایک مغل ملکہ کی حیات کو اس قدر سچائی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ تاریخی ناول میں تاریخ کے ساتھ تخیل کی آمیزش تو ناگزیر ہے، لیکن اس کے باوجود ناول کی تاریخی حیثیت پر کوئی اشکال نہیں ہوسکتا ہے۔ سریش کمار ورما نے خود اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں پوری طرح سے تاریخی حقائق کا لحاظ رکھا اور انھیں برتا گیا ہے۔ ممتاز محل سے متعلق مواد کی قلت کی وجہ سے تخیل کا سہارا بھی لینا پڑا لیکن جہاں کہیں تخیل کی رو رہی ہے وہاں تاریخی شعور بھی ہے۔''

ناول کے تاریخی حقائق معروف مؤرخ ڈاکٹر سریش کمار مشر کی مدد سے جمع کیے گئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ناول محض سنی سنائی تاریخ یا تخیل سے گڑھا ہوا کوئی قصہ نہیں ہے بلکہ مستند و معتبر حوالوں سے جمع کیے گئے واقعات پر مبنی ایک ایسا فن پارہ ہے جس میں ادبی چاشنی بحسن وخوبی گھول دی گئی ہے۔ ناول نگار نے تعصب کی عینک پہنے بغیر ہر کردار کو اس کی عادات واعمال کے آئینے میں تخلیق کیا ہے۔ محلوں کے بلند و بالا گنبدوں کے نیچے کیسی گھٹیا اور خطرناک سازشیں وجود پاتی ہیں، تخت وتاج کی ہوس کس طرح باپ کو بیٹے اور بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتی ہے، جاہ وحکومت کی طلب کس طرح محل کی عورتوں کو نت نئی چالیں چلنے پر مجبور کرتی ہے، یہ تمام تلخ حقیقتیں اس ناول میں پوری سفاکیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔

یہ ناول سنگ مرمر کی حسین عمارت کے نیچے سوئی ہوئی ایک ایسی ملکہ کی کہانی ہے جس نے اپنی جوانی اپنے شوہر اور بچوں کے لیے وقف کردی تھی۔ اس نے ہر مشکل اور آزمائش کے وقت میں شاہ جہاں کا ساتھ دیا تھا اور اپنی محبت وخلوص سے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ چودھویں بچے کی پیدائش کے بعد جان سے گزر جانے والی ممتاز محل لوگوں کی نظروں میں ایک عظیم الشان ملکہ تھی لیکن محل کے اندر وہ صرف ارجمند بانو تھی جسے شاہجہاں سے بے حد محبت تھی اور وہ ایک عام عورت کی طرح اس کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے کی خواہش رکھتی تھی جو وقت کو منظور نہ تھا۔

فہیم احمد نے ناول ممتاز محل کا جس خوش اسلوبی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ شاہی خاندان کے افراد کے مکالموں کی ادائیگی میں وہی نفاست اور ادبیت روا رکھی جائے جو مغلوں کا خاصہ تھی۔ محل میں مختلف عہدوں کے حامل افراد کے ذریعے بولی جانے والی زبان کو اس کی تمام تر لوازمات کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے ہندی متن کا بے حد آسان اور رواں ترجمہ کیا ہے جس میں ثقیل الفاظ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ترجمے کی زبان سادگی کے باوجود دلکشی کی حامل ہے۔ اس عمدہ ترجمے کے لیے فہیم احمد کو بے حد مبارکباد۔

تحقیق و تنقید

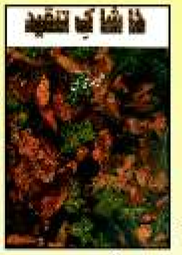

خاشاک تنقید

مصنف: شمیم قاسمی
صفحات: 272، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، پرانی منصفی، دربھنگہ
مبصر: ظہیر انور، 10/1، اہیری پوکر، فرسٹ لین، کولکاتا۔ 700019

'خاشاک تنقید' مشہور شاعر شمیم قاسمی کے نئے پرانے مضامین کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے مختلف اوقات میں قلم بند کیا ہے۔ اس مجموعے میں کل 23 مضامین ہیں۔ ان مضامین کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ سارے مضامین ناول، افسانے، شاعری، سفر نامہ، ناول تنقید، ناولٹ، صحافت، تاریخ کے علاوہ کچھ ادبی اور شخصی طور وطرز پر لکھے گئے ہیں۔ اس میں تازہ کار ناول نگار، شاعر ادیب کے علاوہ چند نہایت معتبر ناموں کو بھی نئے زاویے سے دیکھا گیا ہے۔ ان میں بعض ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار قاسمی صاحب کے ہم عصر بھی ہیں، سینئر بھی اور جنھوں نے حالیہ زمانوں میں شعر و ادب کی دنیا میں منفرد طرزِ اظہار اور لب ولہجہ کے سبب اپنی پہچان بنائی ہے۔

شمیم قاسمی صاحب کی تنقید ذرا مختلف ڈگر پر رواں ہوتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے تنقید اور ادب کا خاصا مطالعہ کر رکھا ہے یہاں تک کہ فاروقی، نارنگ، وہاب اشرفی، کلیم الدین احمد کے ساتھ ساتھ ادب میں افسانے اور بہترین ناول کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ان کا وسیع المطالعہ ہونا ان کی تحریروں میں بڑے اعتماد کے ساتھ نظر آتا ہے۔ تنقید اور ادب کے مطالعے کے بعد بھی ان کی تنقیدی زبان میں انفرادیت ہے، شعریت ہے، کسی فارمولا، ازم یا تحریک کا اثر نظر نہیں آتا۔ کتاب میں شامل 23 مضامین کے علاوہ شمیم قاسمی صاحب نے 'کہتی ہے خلقِ خدا' کے عنوان کے تحت اپنی خدمات، تخلیقی نثر، شاعری، تنقید کی شناخت وغیرہ پر بعض مشاہیر ادب کے مضامین/تاثرات شامل کیے ہیں، ان مضامین کے مطالعے سے ادب اور تنقید کے تعلق سے ان کے نظریے اور مقاصد بھی سامنے آتے ہیں۔ ایک طویل ادبی مکالمہ میں موصوف نے اپنے ادبی رویے کی بڑی کشادہ فکری سے وضاحت بھی کی ہے۔ بلاشبہ اپنے انداز کی وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے یوں تو سارے مضامین پڑھنے لائق ہیں، تاہم وہ چند مضامین جن میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیت کا، ناول، افسانے، شاعری اور منظوم شاعری کے سلسلے میں کھل کر اظہار کیا ہے، ان میں 'لے سانس بھی آہستہ، تخلیقی بیانیہ کا نقطۂ اشتعال، خوشبوؤں کا جال ایک مطالعہ، ناگجا آباد میں زاہدہ حنا، شکاری آنکھوں کا شاعر سلطان اختر، آئیڈینٹٹی کارڈ اور صفدر امام قادری، کرشن چندر کا نیا پرانا کشمیر، لاک ڈاؤن کی شاعری اور بیان طرزی وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو نہایت محنت اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ شاعر اور تنقید نگار شمیم قاسمی نے اتنی اصنافِ ادب کا مطالعہ اور جائزہ پیش کیا ہے کہ یہ محسوس کرنا مشکل نہیں کہ شاعری اور ناول نگاری کی طرف ان کا ذہنی میلان رہا ہے اور ان مضامین کے تجزیے اور محاکے میں کہا جاسکتا ہے کہ قاسمی نے اپنے مخصوص تنقیدی طریقۂ کار کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تخلیقی انفراد کا اظہار کیا ہے۔ موصوف نے اپنے ایک مضمون میں نہایت بیباکی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''کسی فن پارہ یا افسانے/فکشن کی تنقید لکھنے کا میرے اندر وہ شعور نہیں ہے، وہ علمی اور مبصرانہ صلاحیت نہیں ہے، جس کی کوئی امید لگائے بیٹھا ہے، میں تو اردو افسانہ کا ایک قاری ہوں محض۔ ایک غیر مقلد قاری نہ کہ ناقد....؟'' (صفحہ 48)

اس اعتراف سے یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ قاری کی موت ابھی نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی نگاہ سے ادب و شاعری کو بے لاگ پرکھ سکتا ہے۔ شمیم قاسمی کی انکساری قابلِ داد ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جہاں ایک ذرا تھریکل زبان، شاعرانہ لہجہ، ذات کی تہہ سے اُبھرتا ہوا ان کا تجزیہ اور وہ مقامات اور اشعار جنھیں ان کے ذہن نے قبول کیا، پوری طرح ان کی تنقید میں واشگاف نظر آتے ہیں.....!

شیر شاہ کی نگری سہسرام ہو کہ سلطان اختر کی شاعری کا ''شکارستان'' طرزی ہوں کہ صفدری تنقید، عظیم آباد کا حسن ہو کہ یہاں کا ادبی، ثقافتی اور صحافتی ادب، ان کا میلان اس خطّے کے حُسن کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان یا قومی دھارے میں پیدا ہونے والے ادب سے وہ update نہیں ہیں۔ غزل وزل کی طرح تنقید و نقید سے بھی مسلسل رابطہ قائم رکھا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کا پہلا مضمون ذوقی کے ناول 'لے سانس بھی آہستہ' پر ہے جو صفحہ 9 سے 27 تک پھیلا ہوا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ناول کو پورے ارتکاز کے ساتھ مطالعے میں لایا گیا ہے۔ انھوں نے ایک اہم ناول نگار کی تخلیق پر اپنے منفرد انداز میں نگاہ ڈالی ہے۔ ناول انھیں پسند ہے لہٰذا اس کی گہرائیوں میں اُتر کر اس کے مرکزی خیال کی توصیف کی ہے۔ گلوبلائزیشن کی فتنہ انگیزیوں کے ساتھ اس کی روح میں اتر کر انھوں نے ناول کے خدوخال اور اس میں موجود انسانی سائیکی، مغربی طرزِ زندگی کے اثرات، بدلتی ہوئی قدروں اور ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کے واقعات و سانحات کو بھی زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ خاصے کامران ہیں۔ یہ صدی ناول کی صدی سے منسوب ہوگئی ہے لیکن ناول کے امتیازات و کردار اور ناول کی تشکیلی منطق پر بحث اب بھی پھیلنا چاہتی ہے۔ موصوف اخلاقیات اور مذہبی روایات کے پاسدار بھی ہیں لہٰذا اکثر مضامین میں ان کی ترجیحات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اس ناول کے اختتام پر بقول مصنف 'جلیبیا موڑ' پر محتاط ہو کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس ناول میں کلچر اور تہذیب کی صداقت کو تجزیے میں لاتے ہیں جو قاری کو برقی جھٹکے بھی دیتی ہے۔ اسی طرح 'خوشبوؤں کا جال ایک مطالعہ' میں ان کی تنقید ایک مخصوص قسم کی تمہیدی گفتگو کے بعد مختلف افسانوں کو اس کے تاریخی اور مقامی پس منظر میں رکھ کر تحریر کے حوالے کرتے ہیں۔ مدح سرائی تو ہے لیکن کہیں بے جا نہیں، وہ سیاہ کو سیاہ کہنے سے پیشتر افسانے کی خوبصورتی کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، خصوصاً عشرت ظہیر کے افسانے 'خوشبوؤں کا جال' کی معنوی وسعت اور حالاتِ حاضرہ کی صورت کو غیر جانب داری سے پیش کر دیا ہے۔ ان کا مضمون 'ناگجا آباد میں زاہدہ حنا' ایک اہم مضمون ہے اور نفسِ مضمون کے ساتھ تاریخی شہر سہسرام کی عظمتِ رفتہ کا بھی سراغ فراہم کرتا ہے۔ زاہدہ حنا اور جون ایلیا کے رشتے اور دونوں کرداروں کے ساتھ منسلک رویّے سے اردو کا قاری بڑی حد تک واقف ہے لیکن اصل بات کہانی کی معنویت اور اس کے اسلوب بیان کی ہے جس کی طرف شمیم قاسمی نے خاص توجہ دی ہے۔ اس کہانی میں ماضی کی قدروں اور اس کی پائمالی نیز تہذیبی شکست و ریخت کا فسانہ بیان ہوا ہے۔ یہاں گزرے ہوئے زمانوں کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ قاسمی ان کہانیوں کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہی سبب ہے کہ یادوں باتوں کو زاہدہ حنا اپنے انفرادی نظریہ دانش کے کینوس پر منعکس کرتی رہتی ہیں۔ ان کے یہاں حقیقت روح کی تلاش و جستجو کے ساتھ فلسفۂ حیات کی صحت مند قدروں کی بازیافت عام قاری کے بس کی بات نہیں کیوں کہ ان کے تخلیقی متن کی تفہیم اور ان کے افسانوی فسوں سے یوں سرسری گزر جانا کوئی آسان نہیں ہے۔'' (ص 67)

تقسیم ہند کے پہلے اور بعد کی سماجیاتی صورت اور اشرافیہ کے پس منظر کو مصنف نے شہریار کے اشعار سے خوب سجایا ہے۔

ساتھ ہی سلطان اختر کی شاعری کا تجزیہ، جدید شعری لفظیات اور لسانی تازگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ رونق شہری کی مخصوص لفظیات اور تراکیب، پروفیسر طرزی کی پوری عمر شعروادب کے گیسوؤں کو سنوارنے اور ان کے شعری 'کرونستان' میں پوشیدہ صداقت اور ایک خلشِ ناتمام کی کیفیات و پیغام کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کا نیا پرانا کشمیر وغیرہ کارآمد مضامین ہیں یہ مضامین ثابت کرتے ہیں کہ مخصوص ڈکشن کے شاعر شمیم قاسمی تنقید و فکر و فن کے بھی رمز آشنا ہیں۔ وہ تخلیقی فن پاروں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی شرح کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے تنقیدی رویے میں ایک نوع کا کھردراپن ہے جو ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ وہ خود تخلیق کار ہیں لہٰذا ان کی تنقید میں تخلیق کی ایک جہت بھی شامل ہے، خاص طور پر جب وہ شاعری پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں ان کی زمین کی خوشبو بھی شامل ہوگئی ہے۔ کتاب خوب صورت چھپی ہے اور سرورق بھی جاذب نظر ہے، قیمت بھی مناسب ہے اور دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

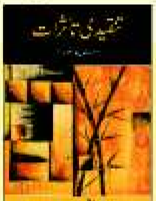

تنقیدی تاثرات (مضامین کا مجموعہ)

مصنف/ناشر: مشیر احمد

صفحات: 203، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مبصر: ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تنقید اور تخلیق ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اردو کے بہت سے ایسے ناقد ہیں، جن کے مضامین کے مجموعے نہ صرف یک موضوعی معلوم ہوتے ہیں، بلکہ اردو تنقید میں انھیں اہمیت بھی حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے اہم ناقدین کا نام درج کیا جاسکتا ہے۔ مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کا ایک بنیادی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف موضوعات پر قارئین کو ایک جگہ بہت کچھ پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اردو میں تسلسل کے ساتھ مجموعۂ مضامین شائع ہورہے ہیں، جسے قارئین پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مشیر احمد کے مضامین کا مجموعہ 'تنقیدی تاثرات' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے، جس میں کچھ ایسے مضامین ہیں، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔

'تنقیدی تاثرات' کے مصنف ڈاکٹر مشیر احمد کی اس سے پہلے کلیات شبنم گورکھپوری، خطوط غالب کے ادبی مباحث جیسی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ خطوط غالب کا ناقدین نے اپنے اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے، لیکن ادبی حوالے سے ڈاکٹر مشیر احمد نے بہت ہی تندہی سے خطوط غالب کے ادبی مباحث پر گفتگو کی ہے۔ اس حوالے سے مضامین تو ملتے ہیں، لیکن اتنی شرح و بسط کے ساتھ کوئی کتاب شاید ہی منظر عام پر آئی ہو۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن 2011 میں آیا تھا، دس سال بعد 2021 میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب کی پذیرائی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اور رفیع الدین ہاشمی جیسے نقاد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

'تنقیدی تاثرات' میں کل تیرہ مضمون شامل ہیں، اس کے علاوہ مصنف کا دو صفحے کا دیباچہ بھی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین: گورکھپور میں تحقیق و تدوین کی روایت، راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'گرم کوٹ': ایک تجزیاتی مطالعہ، خلیل الرحمٰن اعظمی کے خطوط میں خود سوانحی عنصر، سرسید تحریک کے فروغ میں محسن الملک کا کردار، رانی کیتکی کی کہانی: ایک مطالعہ، چکبست کی نثر: خطوط اور ڈراما کی روشنی میں، پروفیسر انصار اللہ نظر کی زندگی کے اہم نقوش، اردو میں مضمون نگاری کی روایت، جگر مرادآبادی کی نثری تحریریں، 'افسانہ کی تلاش' مرتبہ نیر مسعود: ایک مطالعہ، شمس الرحمٰن فاروقی کے ادبی خطوط، مکتوبات شبنم گورکھپوری، پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے متعلقین کے خطوط، ہیں۔

'تنقیدی تاثرات' میں شامل مضامین کا تعلق زیادہ تر غیر افسانوی نثر سے ہے۔ تیرہ مضمون میں سے صرف دو مضمون راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'گرم کوٹ': ایک تجزیاتی مطالعہ، رانی کیتکی کی کہانی: ایک مطالعہ، افسانوی ادب سے متعلق ہے، باقی مضامین کا تعلق غیر افسانوی تحریر سے ہے۔ ایک طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ غیر افسانوی ادب کے حوالے سے اہم مضامین شامل کتاب ہیں۔ گورکھپور میں تحقیق و تدوین کی روایت، اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس مضمون کا تعلق جہاں علمی ہے وہیں تاریخی بھی ہے۔ اس مضمون میں صاحب کتاب کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت دیکھی جاسکتی ہے، انھوں نے مدلل انداز میں اس مضمون کو تحریر کیا ہے۔

'تنقیدی تاثرات' میں ایک مضمون 'سرسید تحریک کے فروغ میں محسن الملک کا کردار' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ اس مضمون میں سرسید کے رفقا اور معاصرین کے حوالے سے ضمناً گفتگو کرتے ہوئے محسن الملک کے حوالے سے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ دونوں کے اتفاق و اختلاف کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے سرسید تحریک کے فروغ میں محسن الملک کے کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے خطوط سے ان کے سوانحی حالات کو بیان کیا گیا ہے، یہ مضمون اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ علی گڑھ سے بے پناہ محبت تھی مگر وہاں ان کے ساتھ حق تلفی ہوئی اور سازش کے تحت پروفیسر بننے سے محروم رکھا گیا۔ اس تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ خیال بہت اہم ہے:

''اس شخص کی پچیس سالہ شاندار ادبی خدمات کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں پروفیسر نہیں بنایا حالانکہ پروفیسر کی اسامی خالی تھی۔ اس کے خلاف گھٹیا سازش کی گئیں اس کی سنگین بیماری کو بہانا بنایا گیا کہ ایسا آدمی کیا پروفیسری کرسکے گا... ہم اردو کے گلے سڑے ادیب کہ اتنی طاقت بھی نہیں رکھتے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ارباب اقتدار سے پوچھیں کہ ہمارے ایک ساتھی کے ساتھ کیوں ناانصافی کی گئی؟... جس آدمی کے بدن میں ایک قطرہ خون بھی نہیں تھا وہ جب ادب کے مسئلے پر بولتا تھا تو نہایت مربوط اور ذمہ دارانہ انداز میں بولتا تھا، اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ پروفیسری کا اہل نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر خلیل الرحمٰن اعظمی کو پروفیسری مل گئی ہوتی تو وہ شاید جلد مرجاتے لیکن ہمارے دلوں میں یہ خلش تو نہ رہ جاتی اور شاید اعظمی بھی ذرا آرام سے مرتے۔''

(ہماری زبان دہلی 'تعزیتی قرارادیں' اعظمی نمبر اگست 1978، 'ہمیں کیا خبر تھی وہ مرجائے گا' ص 12)

اسی طرح سے چکبست کی نثر کے حوالے سے بطور خاص خطوط اور ڈراما کے حوالے سے جو معروضات پیش کیے گئے ہیں وہ یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر انصار اللہ نظر کی حیات و خدمات کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے، اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ادبی خطوط کے حوالے سے شامل مضمون نہ صرف دلچسپ ہے، بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ مکوبات شبنم گورکھپوری اور جگر مرادآبادی کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہے وہ یقیناً اہمیت کی حامل ہے۔

'تنقیدی تاثرات' میں شامل مضامین نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہیں، بلکہ انداز تحریر بھی جداگانہ ہے۔ نہایت معروضی انداز میں لکھے گئے مضامین شامل کتاب ہیں۔ مضمون کے آخر میں مضمون کہاں پڑھا گیا یا کہاں شائع ہوا ہے، اس کی بھی تفصیل درج کی گئی ہے۔ مضامین زمانی اعتبار سے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب یقیناً قارئین کے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں۔

تحدیث ادب

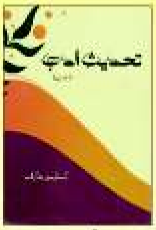

مصنف: تسلیم عارف
صفحات: 188، قیمت: 144 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: انجلا پبلی کیشنز، کولکاتا
مبصر: طلعت جہاں، کولکاتا

زیرِ تبصرہ کتاب 'تحدیثِ ادب' ڈاکٹر تسلیم عارف کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ تسلیم عارف درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان دنوں وہ ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مذکورہ کتاب سے قبل اُن کی دو کتابیں 'تسویدِ فن' (2015) اور 'سجاد ظہیر کی شعری جہات اور پگھلا نیلم' (2018) منظر عام پر آچکی ہیں۔

'تحدیثِ ادب' 188 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 16 مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے پہلے دو صفحے پر ڈاکٹر کامران غنی صبا کا 'تسلیم عارف کا تنقیدی شعور' کے عنوان سے مختصر لیکن جامع مضمون ہے۔ اس کے بعد 'اظہار' میں مصنف نے ادب میں اپنا نظریہ، کتاب لکھنے کی وجہ اور تشکر کا اظہار کیا ہے۔ متفرق نوعیت رکھنے والے یہ تمام مضامین توجہ طلب ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بیشتر ایسے مضامین ہیں، جن میں انھوں نے ایسے فن کاروں اور قلم کاروں کی خدمات کو اجاگر کیا ہے، جو کسی دوسری صنف یا دوسرے میدانِ ادب میں بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ یہ مصنف کی فکری بالیدگی کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے ان قلم کاروں کے ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی، جنھیں زمانے نے یا تو نظر انداز کر دیا، یا جو ہماری توجہ کے طلب گار رہ گئے۔

نظیر کا نام آتے ہی ہمارا ذہن اردو کا باقاعدہ پہلا نظم نگار ہونے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن اس کتاب میں مصنف نے عوامی شاعر کو بحیثیت غزل گو پیش کیا ہے۔ روحِ مضمون میں داخل ہونے کے پہلے ہی انھوں نے کہہ دیا ہے کہ:

"نظموں اور غزلوں میں ان کا لب و لہجہ بالکل جدا ہے۔ نظم میں جن موضوعات کو اکثر پیش کیا گیا ہے، ان کی تلاش نظیر کی غزلوں میں بے سود ہے یا یہ کہہ لیجیے کہ جو لذت ان کی غزلوں میں ہے، ان کی نظمیں اس لذتیت سے بالکل عاری ہیں۔"

(تحدیثِ ادب، ص 14)

ہم یہ جانتے ہیں کہ نظیر کی غزلوں کا دائرہ بہت محدود رہا ہے، عشق و عاشقی کے مضامین ان کے یہاں بھرے پڑے ہیں، جن کی طرف موصوف نے پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے لیکن ان کی عشقیہ غزلیں بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔

اکثر ہم 'دستنبو' کو غالب کا روزنامچہ سمجھتے ہیں جس میں غالب نے 1857 کے غدر کے حالات قلم بند کیے ہیں لیکن مضمون بعنوان '1857، غالب اور دستنبو' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ غالب کو سمجھنے کے لیے نہ صرف ان کے خطوط بلکہ 'دستنبو' بھی تاریخی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ دورانِ بغاوت اور اس کے بعد کے مناظر کو غالب نے بہ چشم خود دیکھا اور ان تمام حالات کو اس مختصری تصنیف میں قلم بند کر دیا ہے۔ غالب کی تنگ دستی اور پنشن کے سلسلے میں انگریزوں کے ساتھ ان کی وفاداری کے کئی سارے واقعات اس مضمون میں بحوالہ درج ہیں۔

ہمارے پہلے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف آزادیٔ ہند میں پیش پیش رہے ہیں بلکہ ان کا نثری سرمایہ بھی اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہاں تسلیم عارف نے آزاد کو نہ بطور صحافی، مکتوب نگار، نثر نگار اور نہ ہی سیاست داں کے روپ میں پیش کیا بلکہ انھیں ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔ آزاد شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے اور روایت کا پاس رکھتے ہوئے انھوں نے معیاری شاعری بھی کی ہیں۔

مضمون نگار نے پوری کتاب میں موضوعات کے انتخاب میں ایک انفرادی شان برقرار رکھا ہے۔ قاضی نذرالاسلام کی باغیانہ شاعری پر ہر کس و ناکس نے قلم اٹھایا ہے لیکن مصنف نے یہاں انھیں ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری کی جگہ ان کے ناولٹ 'شکست و فتح' پر مبسوط مضمون لکھا گیا ہے۔ مشہور شاعر و ناقد مظفر حنفی کی افسانہ نگاری کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ 'نور ظہیر کے افسانوں میں عصری مسائل' اور 'جاوید نہال حشمی کے افسانچوں کا کلائیڈوسکوپ' ان کے اہم مضامین ہیں۔ یہاں ان دو مضامین کا نام اس لیے ساتھ لیا جا رہا ہے کیونکہ مضمون کے مطالعے کے بعد ان میں کئی چیزیں مشترک نظر آئیں۔ دونوں قلم کاروں کے قلم میں بے باکی و نشتر زنی ہے، نیز سیاست کے اس دور میں بھی نور ظہیر اور جاوید نہال کی تخلیقات میں حالاتِ حاضرہ سے آنکھیں ملانے کی ہمت ہے۔

کتاب میں شامل مضمون 'کلکتے کا ایک فراموش کردہ رسالہ: ماہنامہ رہبرِ صنعت و تجارت' تسلیم عارف کی اہم تحقیقی کاوش ہے۔ ادبی رسالہ کے متعلق تو ہم سب جانتے ہیں لیکن کوئی ایسا رسالہ جو صرف کاروبار و تجارت سے متعلق معلومات فراہم کرتا تھا، اس سے بے خبری تھی۔ اس منفرد رسالے میں بے روزگاروں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے فن و ہنر سکھایا جاتا تھا۔ اس مقصد کے تحت رسالہ نے کئی اہم گوشے بھی نکالے جیسے چمڑا نمبر، کاروباری نمبر، بکری نمبر، اسپورٹس گڈس نمبر، ایکسپورٹ امپورٹ نمبر وغیرہ۔ اس کے علاوہ 'خواتین اور روزگار نمبر' جیسا خصوصی نمبر نکال کر گھر بیٹھے خواتین کو بھی کام سیکھنے کا مواقع فراہم کیا گیا۔ تسلیم عارف صاحب کا تحقیقی قلم اگر اس پر کام نہ کرتا تو ایسی منفرد نوعیت رکھنے والے رسالے کے متعلق ناآشنائی ہی رہتی۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے رسالے کو دوبارہ جاری کیا جائے تاکہ ہر ضرورت مند شخص جو کام سیکھنے اور اپنا کاروبار شروع کرنے کا مشتاق ہے، وہ اس طرح کے رسالے سے مستفیض ہو پائے اور محمد حنیف (ایڈیٹر 'رہبر صنعت و تجارت') جیسے انسان دوست کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا جائے۔

مذکورہ کتاب میں موصوف نے بقیدِ حیات شخصیت پر بھی خامہ فرسائی کی لیکن نہ ہی بے وجہ مدح سرائی سے کام لیا ہے اور نہ ہی تنقیص ان کا لہجہ رہا ہے بلکہ ان کا ایماندارانہ نقطۂ نظر رہا ہے۔ ہاں! بہ لحاظ ضرورت بے لاگ رائے دینے سے انھوں نے گریز نہیں کیا، جیسے ناولٹ 'شکست و فتح' کو موجودہ دور کے بڑے ناول نگاروں شموئل احمد اور غضنفر کے ناولوں 'ندی' اور آخر الذکر کے ناول 'کینچلی' پر بعض خصوصیت کی بنا پر برتر قرار دیا ہے۔ مذکورہ کتاب کی ایک اہمیت جس کا یہاں ذکر ضروری ہے کہ تمام مضامین اپنے آپ میں مکمل ہیں۔ موضوع سے متعلق تسلیم عارف نے تمام معلومات، نیز اپنے تجربے و مشاہدے کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ دوران مطالعہ اور بعد از مطالعہ قاری اصل متن کو بھی پڑھنے کا متمنی ضرور ہوگا۔

ڈاکٹر تسلیم عارف مطالعہ پسند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب 'تحدیث ادب' میں تنوع نظر آ رہا ہے۔ یعنی اس کتاب میں نہ صرف فکشن، نہ صرف نثری اصناف بلکہ کئی ساری اصناف سخن پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہمیں کئی سارے تخلیق کاروں کو نئے زاویے سے متعارف کرا رہی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد سنجیدہ قارئین کو مختلف نئے موضوعات ملیں گے اور تخلیق کی نئی راہیں وا ہوں گی۔

ترتیب

خالد محمود شخصیت اورادبی خدمات

مرتبین: سیفی سرونجی، استوتی اگروال

صفحات: 528، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: کریٹیو اسٹار، پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: شاداب شمیم، ڈی 35، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

پروفیسر خالد محمود خالص ادبی آدمی ہیں، پچاس سال تک انھوں نے علم و ادب کی آبیاری کی، اور خلوص و محبت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ تقریباً تمام اصناف ادب پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور سب میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، خالد محمود کو ادبی دنیا ایک ادیب، شاعر، مترجم، خاکہ نگار، انشائیہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے، ان کی تحریریں بڑی دلکش اور صاف ستھری ہوتی ہیں، ان کی نگارشات از دل خیزد بر دل ریزد کی واضح مثال ہیں۔ ایک تنقید نگار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی تنقید میں توازن کو برقرار رکھا ہے، جو دیکھا جو پڑھا اسی کی روشنی میں سپرد قلم کیا، بے جا تعریف یا تنقیص ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ خالد محمود ایک بہترین منتظم بھی ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر شعبہ بننے کے بعد انھوں نے کئی اہم کام کیے جس سے شعبے کا تعلیمی معیار بلند ہوا، اردو اکیڈمی دہلی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے بھی انھوں نے کئی اہم فیصلے کیے اور اکیڈمی سے کئی اہم کتابیں شائع کروائیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر رہتے ہوئے مکتبہ کی ترقی کے لیے بہت سے اہم فیصلے کیے۔ مکتبہ جامعہ کے تعلق سے ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے تقریباً چار سو آؤٹ آف پرنٹ قیمتی کتابوں کو ری پرنٹ کروایا۔

خالد محمود کی ہمہ جہت صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقدمہ میں سیفی سرونجی لکھتے ہیں ''خالد محمود ایک شاعر، ادیب، خاکہ نگار، ترجمہ نگار ہی نہیں، بلکہ ایک نامور نقاد بھی ہیں۔ انھوں نے سفرناموں پر اپنی مربوط و مبسوط کتاب کے علاوہ بے شمار موضوعات پر تنقیدی مضامین اور ان گنت کتابوں پر مقدمے، دیباچے، فلیپ اور تبصرے لکھے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ خالد صاحب نے شاعری سے زیادہ نثری کام کیا ہے۔ نثر میں انھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ہر صنف کا مختصر تذکرہ ہی کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔''

زیر تبصرہ کتاب 'خالد محمود شخصیت اور ادبی خدمات' پروفیسر خالد محمود کی زندگی اور ان کی اب تک کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے، اس کتاب کو سیفی سرونجی اور استوتی اگروال نے مرتب کیا ہے۔ سیفی سرونجی نے تفصیلی مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے خالد محمود کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، ان کی ادبی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کو ذیلی عناوین کے تحت بیان کیا گیا ہے، اردو زبان کے حاتم طائی' کے عنوان سے استوتی اگروال نے خالد محمود کی سخاوت اور ان سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ خالد محمود نے 'میری حیات مستعار میں درس و تدریس کے رنگ' کے تحت اپنی تدریسی اور تعلیمی خدمات کو بیان کیا ہے، صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، مکتبہ جامعہ اور دہلی اردو اکیڈمی کے ذمے دار کی حیثیت سے انھوں نے جو ترقیاتی اور فلاحی کام کیے ہیں ان کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ اس تحریر سے ان کی لگن، محنت اور اردو سے ان کی محبت اور لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب کئی حصوں میں منقسم ہے، خالد محمود مشاہیر کی نظر میں، خالد محمود بحیثیت نثر نگار، بحیثیت شاعر، بحیثیت معلم، مضامین، منظوم خراج تحسین، سپاس نامے، تین تحریریں، تنقیدی مضامین، شگفتہ خاکے، انشائیے، غزلیں، نظمیں وغیرہ عنوان کے تحت انھوں نے مختلف اصناف میں جو طبع آزمائی کی ہے اسے جگہ دی گئی ہے۔ اس کے بعد منتخب اشعار، منظوم تراجم، مناصب و اعزازات، متفرقات اور تصاویر کو شامل کتاب کیا گیا ہے، کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرتبین نے خالد محمود کی زندگی کے ہر گوشے کو کتاب میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، ان کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو اس میں شامل نہ ہو۔ 'خالد محمود مشاہیر کی نظر میں' عنوان کے تحت پروفیسر عبدالقوی دسنوی، پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا وغیرہ کی تحریریں موجود ہیں، خالد محمود کی شخصیت، ان کے تعلقات، ان کی گفتگو کا انداز، ان کی نشست و برخاست، دوستوں سے ملنے کا طور طریق، ان کی سخاوت، ان کے کالج کے دنوں کے واقعات، ان کی خودداری، ان کی خوش بیانی، ان کی تحقیق و تنقید، کتابوں سے ان کا لگاؤ، ان کا اخلاص، ان کی شاعری، ان کی طنز و مزاح نگاری، ان کی تخلیقات وغیرہ پر مشاہیر ادب نے اپنی آرا قلمبند کی ہیں۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر خالد محمود کی علمی و ادبی اہمیت مشاہیر ادب کی نظر میں کیا ہے اور لوگ ان کے کام اور ان کے صاف شفاف کردار کی کس طرح تحسین کرتے ہیں، کتاب کا یہ حصہ اس لیے اہم ہے کہ اس سے خالد محمود کی ذاتی زندگی کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

خالد محمود بحیثیت نثر نگار کے تحت بارہ ادیبوں نے ان کی ادبی نگارشات پر روشنی ڈالی ہے، پروفیسر خالد جاوید، سہیل انجم، ڈاکٹر سید حامد حسین، فرحت احساس وغیرہ نے اپنے احساسات کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے، خالد محمود کی تخلیقی نثر قاری کے ذہن کو بھٹکنے نہیں دیتی، ان کی نثر میں سلاست اور روانی ہے، ان کے مضامین، خاکے اور انشائیوں کو لوگوں نے بے حد پسند کیا ہے، ان کی تنقید بے باک ہوتی ہے۔ نپے تلے انداز میں وہ اپنی بات کہتے ہیں۔ ان کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کون سا لفظ اور جملہ کہاں کیسے اور کس طرح استعمال ہوگا۔ یہی وہ خوبی ہے جو انھیں ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

خالد محمود بحیثیت شاعر کے تحت قرۃ العین حیدر، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر اسعد بدایونی، ڈاکٹر مولا بخش، پرفیسر شہپر رسول، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر کوثر مظہری جیسے قلمکاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کی شاعری میں تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے، اس کے ساتھ اخلاقی قدریں، عظمت انسان اور حوصلہ مندی بھی ان کے اشعار کی نمایاں خوبی ہے۔ خالد محمود ویسے تو غزل کے شاعر ہیں، لیکن ان کی کئی نظمیں بھی بے حد مشہور ہیں، خاص طور پر چھ دسمبر، یوم آزادی اور مدح آدم کا شمار ان کی اہم نظموں میں ہوتا ہے، اس کتاب میں نظم اور غزل کے تحت ان کی مشہور اور منتخب نظموں اور غزلوں کو پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر خالد محمود ایک ادیب ہونے کے ساتھ ایک اچھے اور سچے معلم بھی ہیں، پڑھنا پڑھانا ان کی سرشت میں داخل ہے، جب تک وہ اسکول یا کالج میں استاد رہے ہمیشہ کلاس کی پابندی کرتے رہے، بچوں کے درمیان رہنا اور ان سے باتیں کرنا انھیں بے حد پسند ہے۔ وہ اپنے طالب علم سے شفقت سے پیش آتے ہیں، ان کی ذہنی تعمیر و تربیت میں مصروف رہتے ہیں، ان کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، وہ اپنے طالب علموں کو ہمیشہ اچھے مشورے دیتے ہیں، اپنے شاگردوں کی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں، انھیں انعامات سے نوازتے ہیں، یہ کتاب پروفیسر خالد محمود کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتی ہے اور خالد محمود پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب معاون و مددگار ثابت ہوگی۔ کتاب کا سرورق بے حد دلچسپ ہے، ہاں کچھ پروف ریڈنگ کی غلطیاں ہیں، امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ خامیاں نہیں رہیں گی۔

اردو سفر در سفر (دستاویزات کی روشنی میں)

مرتب: ڈاکٹر فاروق انصاری

صفحات: 304، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: اپلائڈ بکس، نئی دہلی

مبصر: محمد شارب ضیاء، R-10/A، تیسری منزل، نزد ہری مسجد نفیس روڈ جوگا بائی ایکسٹینشن، نئی دہلی۔ 110025

اردو زبان مختلف زمانوں میں نشیب وفراز سے گزرتی رہی اور سیاسی حرارت وبرودت سے نبرد آزما ہوتی رہی ہے۔ خصوصاً تقسیم ہند کے بعد اردو کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ اسے ایک مخصوص طبقہ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ زبان کے مسئلے کو زبان کی حیثیت سے نہیں دیکھا گیا بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ ان حالات میں اردو کے لیے کئی نازک موڑ آئے، اس کے باوجود یہ زبان زندہ ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ اس کا سہرا دراصل ان تحریکات کے سر جاتا ہے جو اردو زبان کو اس کا حق دلانے کے لیے چلائی گئیں چنانچہ وسیع جدوجہد کے بعد اردو کے آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے مختلف کمیٹیوں کی تشکیل ہوئی اور کئی اہم سفارشات پیش کی گئیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'اردو۔ سفر در سفر' (دستاویزات کی روشنی میں) اردو کی ترویج واشاعت کے لیے کی جانے والی ان ہی مساعی کی جھلک پیش کرتی ہے جو مختلف مواقع اور صورت حال میں کی گئیں، ان چیلنجز کا احاطہ کرتی ہے جن سے یہ زبان نبرد آزما رہی ہے اور ان سفارشات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتی ہے جو وقتاً فوقتاً تشکیل کی گئی کمیٹیوں نے پیش کی ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتنی سفارشات پر عمل ہوسکا اور رپورٹ کے کن مندرجات پر مزید توجہ اور تحریک کی ضرورت ہے۔

زیر نظر کتاب میں شامل مضامین میں شرح وبسط کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو، ہندی کی حریف نہیں ہے (جیسا کہ سمجھا گیا اور سمجھایا گیا) بلکہ یہ دو بہنیں ہیں جن کا وجود اسی ملک میں ہوا اور جن کی نشو ونما اسی سرزمین پر ہوئی۔ اردو، ہندی کی جگہ نہیں مانگ رہی ہے بلکہ وہ اپنے دستوری حق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ یہ کسی ایک طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ سب کی زبان ہے اور بالفرض اگر ایک طبقے کی زبان تسلیم کر بھی لی جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جمہوری ملک میں ملک کے معتد بہ شہریوں کی زبان کو نظر انداز کردیا جائے۔ مہاتما گاندھی نے جس طرح قومی زبان کے لیے 'ہندوستانی' کا نظریہ پیش کیا تھا، یعنی وہ ہندوستانی زبان جسے شمالی ہند میں سبھی بولتے اور سمجھتے ہیں، اگر اسے قبول کیا جاتا تو اردو اور ہندی کسی کے لیے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

پروفیسر فاروق انصاری نے کوشش کی ہے کہ ان تمام سفارشات کو یکجا کردیا جائے تاکہ استفادہ آسان ہو اور اردو کی ترویج واشاعت سے وابستہ افراد بسہولت رہنمائی حاصل کرسکیں۔ اس کتاب میں مختلف تحریکات کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے اردو کے تحفظ کی راہ میں پیش آنے والی دشواریوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مرتب کتاب نے ان ماہرین کی تحریروں کو شامل اشاعت کیا ہے جنھوں نے تحریکات میں عملاً حصہ ہی نہیں لیا بلکہ سرگرم رول ادا کیا۔ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، عزیز قریشی، حامد انصاری، خلیق انجم، مرزا خلیل احمد بیگ، سید شریف الحسن نقوی، اطہر فاروقی اور سید شہاب الدین کے وقیع مضامین دعوت غور وفکر بھی ہیں اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ بھی ہیں۔

مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں گلم چند نیر نے 1875 تک ہندوستان میں برطانوی حکومت کی لسانی پالیسی کا وقیع جائزہ لیا ہے۔ مظہر مہدی نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو۔ ہندی تنازعہ پر روشنی ڈالی ہے، صفدر امام قادری نے سرسید احمد خان اور ہندی۔ اردو مسئلے کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ دوسرے حصے میں گجرال کمیٹی، سید حامد کمیٹی، فاطمی کمیٹی، محمود الرحمٰن کمیٹی، آل احمد سرور کمیٹی، عزیز قریشی کمیٹی، سچر کمیٹی اور اختر الواسع کمیٹی وغیرہ کی سفارشات کا تفصیلی اور تحقیقی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ سرکاروں نے اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل ضرور کی لیکن عملی اقدامات خاطر خواہ نہیں کیے گئے۔

تیسرے حصے میں 'سرکاری سرپرستی میں اردو کا فروغ: وسائل وامکانات'، 'اردو تحریک اور مسعود حسین خاں'، 'ہندوستان کے آئین میں اردو کی حیثیت'، 'اسکولوں کے نظام میں اردو کی تعلیم'، 'ہندوستان میں اردو' جیسے تحقیقی مضامین شامل کیے گئے ہیں جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام مضامین بصیرت افروز ہیں۔ ان تحریروں سے استفادہ وقت کی ضرورت ہے۔

یقین ہے کہ یہ کتاب اردو کے تحفظ اور فروغ کی مساعی کے لیے معاون ثابت ہوگی۔ یہ کتاب زبان سے متعلق مسائل ومشکلات کو سمجھنے اور پھر انھیں حل کرنے میں راہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ اسے ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ کتاب کے مطالعے سے مسائل کا جہاں ادراک ہوتا ہے۔ ان کو حل کرانے کی رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے فکرمند اور کوشاں افراد کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

تذکرۂ سید عبدالباری

تقدیم وترتیب: خان محمد رضوان، معاون: فاطمہ تنویر

صفحات: 454، قیمت: 450 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: عشرت ظہیر، مکان نمبر A-370، فورتھ فلور، گلی نمبر 6-A ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

خان محمد رضوان بحیثیت شاعر، اور متعدد اہم وقابل قدر کتابوں کے مرتب کی حیثیت سے بھی ممتاز ومعتبر ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتابیں، ترتیب وتہذیب کی خوش سلیقگی، پر مغز مقدموں اور دلنشیں تعارف کے خلاقانہ اظہار کے اعتبار سے بھی جاذب توجہ ہوتی ہیں۔

تخلیق، ترجمہ اور ترتیب وتہذیب ادب کے مختلف زاویے اور وسیلۂ اظہار ہیں۔ تخلیق کی اہمیت اور قدر ومنزلت تو مسلم ہے۔ ترجمہ دوسری زبانوں سے رسائی اور اس کے ادب وتہذیب ومعاشرت سے آشنائی کی راہیں ہیں۔ مرتب کردہ کتابوں کی ادب میں ازحد احتیاج واہمیت ہے اور اس کے کارآمد پہلوؤں سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس عمل میں متعلقہ فنکار اور ان کی نگارشات کو دنیائے ادب کے روبرو پیش کرنا اور نئی نسل کو فن وفنکار کے مرتبہ ومقام سے متعارف کراتے ہوئے، گویا ادب شناسی کی راہوں کو آسان کرنا ہوتا ہے۔

اس امر کی انجام دہی میں دوررس اور باریک بیں زاویہ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی نظر، جو ادب وشعر کے فنی نکات سے خاصی آگاہی کی حامل بھی ہو، اور متعلقہ فنکار کے مقام ومنصب کے تعین کے جذبہ وہنر کی نزاکتوں کا بار بھی اٹھا سکے——!

پیش نظر کتاب 'تذکرۂ سید عبدالباری' کل سات ابواب پر مشتمل ہے اور ان میں شامل ان کی سوانحی تفصیلات، تعلیم وملازمت، ادبی جہات، منتخب مضامین اور مقتدر شخصیتوں کے تاثرات وخطوط سے ان کے تخلیقی شعری وتنقیدی میلان ورجحان کا بھی پتہ چلتا ہے اور ان کے ذہنی فکری اور نظریاتی ابعاد بھی منعکس ہوتے ہیں۔ خان محمد رضوان نے فرض مرتب کی ادائیگی میں 'اسلامی ادب' کے موضوع سے متعلق طویل، پر مغز اور فکر انگیز مقدمہ تحریر کیا ہے۔ خان محمد رضوان نے 'اسلامی ادب' جیسے لطیف اور حساس موضوع کو

غالباً اس لیے چھیڑا کہ سید عبدالباری، اسلامی ادب کے حامی و خوگر رہے ہیں—

'اسلامی ادب' کے مختلف پہلوؤں، امکانات، رجحانات اور مقتدر ادبا و مفکرین کے اقوال و افکار کے جلو میں موضوع سے متعلق خان محمد رضوان، مدلل اور کنونسنگ نتائج اخذ کرنے کے موثر اور لائق تحسین عمل سے گزرے ہیں۔ اس عمل میں انھوں نے میتھو ارنلڈ، کارڈ ڈینل، نارمن جودک، سید عابد علی عابد، جارج برناڈ شا، ٹی ایس ایلیٹ، رشید حسن خان، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے افکار، اور ان کی کتابوں سے نہ صرف افادہ کیا ہے، بلکہ ان سے اپنے اختلاف کے نکات کو واضح کرتے ہوئے اپنی فکر کے روشن زاویۂ نگاہ کا تعین بھی کیا ہے۔

متذکرہ مقدمہ، جو دراصل فکر انگیز مقالہ کی حیثیت کا حامل ہے، کو مرتب نے اپنے موضوع 'سید عبدالباری' کی عملی زندگی، ان کی فکر اور ان کی تحریروں کے ساتھ خوبصورتی اور چابک دستی کے ساتھ منطبق کیا ہے۔

سید عبدالباری عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنی حیات کے مختلف شعبوں میں فعال رہے، اور انھوں نے اپنی نگارشات کے ذریعے موثر نقوش بھی دنیائے ادب پر مرتسم کیے۔ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہونے کا انھیں نہ صرف اعزاز حاصل ہے، بلکہ ان کتابوں میں جن شعری، ادبی و تنقیدی موضوعات کا احاطہ کیا ہے، ان سے ان کے میلان و رجحان کی بیباکی بھی نمایاں ہے اور وہ فکر کے نت نئے در بھی وا کرتے ہیں۔

ادب Math کی طرح متعین روٹ کے ذریعے متعین نتیجہ تک پہنچنے کا عمل نہیں، انحراف و اختلاف ادب کی خصوصیت ہے۔ سید عبدالباری متنوع اور بیباکانہ مگر استدلالی طرز اظہار کے ذریعے اپنے زاویۂ نگاہ کو استحکام بہم پہنچانے پر قادر تھے۔

ترقی پسند فکر، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تعلق سے ان کے مضامین خاصے دلچسپ، فکر انگیز اور متنوع ہیں اور یہ افکار کے کئی در وا کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ اسلامی ادب کی اشاعت کے علمبردار تھے۔ ان کی دو درجن کتابوں میں ان کے شعری مجموعے 'فکر انگیز' اور 'طرب خیز' بھی جاذب توجہ ہیں—

خان محمد رضوان نے 'تذکرۂ سید عبدالباری' کی اشاعت کے ذریعے ایک اہم اور گویا لازمی ادبی فریضہ انجام دیا ہے جو نئی نسل کو شاہراہ ادب کی طرف راغب کرنے کا وسیلہ بھی ثابت ہوگا—!

فکشن

پناہ

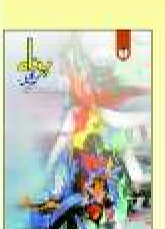

مصنف: محمود شکیل، ترتیب: خواجہ کوثر حیات

صفحات: 179، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: جی این کے پبلی کیشنز

مبصر: شکیل احمد خان

ڈائریکٹر، فیکلٹی ڈیولپمنٹ سینٹر، متسوردی شکشن سنستھا، جالنہ

اردو ادب کی ابتدا سے لے کر آج تک مراٹھواڑہ کے شاعر، ادیب اور ناقدین پوری ادبی دنیا پر اپنی چھاپ چھوڑتے آرہے ہیں۔ شاعروں میں سراج، ولی، قاضی سلیم اور بشر نواز وغیرہ، نثری اصناف میں جوگیندر پال، حمید سہروردی، یوسف ناظم وغیرہ اور تحقیق و تنقید میں ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ جیسے کئی اصحاب علم و فن نے ملکی اور عالمی سطح پر اردو دنیا کو متاثر کیا ہے۔ اس سارے پس منظر اور پیش منظر میں ایک بات بڑی عجیب ہے، ایک شخص بڑا عجیب ہے کہ ابتدا سے آج تک ادبی دنیا میں معروف و مقبول ہے پر اپنے علاقے میں تنہا اور گوشہ نشین ہے۔ اس شخص کا نام ہے محمود شکیل۔ ایسا نہیں کہ محمود شکیل اپنے علاقے میں غیر معروف ہیں، دکن کی ہر چھوٹی بڑی ادبی شخصیت ان کے نام سے واقف ہے، فکشن کی روایت پر ہونے والی ہر گفتگو میں ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لیکن نہ ان کی تحریریں بآسانی دستیاب ہیں اور نہ ہی وہ ادبی محفلوں میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ اب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'پناہ' منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے کو ترتیب دینے اور منظر عام پر لانے کے لیے محترمہ کوثر حیات صاحبہ ہم سب کے خصوصی شکریہ کی مستحق ہیں۔ خوبصورت گٹ اپ اور منفرد طرز پیشکش سے مزین اس کتاب میں 'تاثر' کے عنوان سے انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے گہرے مشاہدے اور ادب کی سنجیدہ قرات کا بین ثبوت ہے۔ اس مجموعے میں محمود شکیل کے صرف 14 افسانے شامل ہیں۔ اس لیے پوری تشفی تو نہیں ہوتی لیکن ان کے اسلوب و موضوعات کی چند جہتوں کا ادراک ہوتا ہے۔ جیسا کہ اکثر لوگوں نے بتایا ہے محمود شکیل نے 1960 کے بعد والی دہائی میں سفر شروع کیا۔ آغاز کے عنوان سے اس مجموعے کے پیش لفظ میں ارتکاز افضل لکھتے ہیں:

"... یہ اردو ادب میں وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک کی نظریاتی بنیادیں متزلزل ہونا شروع ہو چکی تھیں اور جدیدیت کی رو چل پڑی تھی... علامت نگاری، موضوع کی تہہ داری، کردار و مرکزی خیال کا ابہام اور کہانی پن سے دانستہ انحراف، اساطیر کی تلاش اور گوناگوں تہذیبی ورثے کی بازیافت ان شعرا اور افسانہ نگاروں کے موضوعات اسالیب پر اثر انداز ہونے لگے تھے... شعور کی رو کا رواج عام ہو گیا تھا... لیکن ان تمام روایتوں، ادبی تحریکوں اور فیشن ایبل ادبی موضوعات سے الگ تھلگ محمود شکیل اپنے افسانے لکھ رہے تھے۔"

اس طرح محمود شکیل کو ان کے تاریخی تناظر میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر ارتکاز افضل نے ان کے فن کی تمام جہتوں کا بصیرت افروز جائزہ لیا ہے۔ بعد ازاں 'محمود شکیل کے افسانوی کرافٹ پر ایک نظر' کے عنوان سے ڈاکٹر عتیق اللہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

"... یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنے عہد کے ادبی رجحانات سے دامن کش رہا کرتے ہیں۔ بڑی گہرائی سے انھوں نے علامت و تجرید کی معنویت کو بھی سمجھا ہے۔ علامت ہمیشہ علامت کے طور پر خود کا تعارف کرواتی ہے... وہ مکالمات میں بھی وارد ہو سکتی ہے، جزئیات میں بھی، کسی بیان کی صورت میں بھی۔ تجرید ایک داخلی عمل زیادہ ہے۔"

صرف اس مجموعے میں شامل افسانوں کے حوالے سے دیکھیں تو محمود شکیل ترقی پسند تحریک سے متاثر تو نظر نہیں آتے لیکن ہمعصر طرز اظہار سے ناواقف و نابلد بھی نہیں۔ اسی لیے ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ محمود شکیل کا بیانیہ (خصوصاً کرفیو، جالے، نیند جیسے افسانوں میں) روایتی سے جدید بیانیہ کی طرف سفر کرتا ہے۔

محمود شکیل کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ بیانیہ حمید سہروردی کے بیانیہ کی طرح شروع سے آخر تک تجریدی نہ رہتے ہوئے آسانی سے گرفت میں آجانے والے پلاٹ کے تار و پو میں اس طرح پیوست ہوتا ہے کہ افسانہ روایتی کہانی اور جدید بیانیہ کا ایک انوکھا امتزاج پیش کرتا ہے۔ جہاں کہانی واقعاتی سطح پر بھی آگے بڑھتی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی کردار کا اندرونی سناٹا، اندھیرا، کرب، کشمکش اور کنفیوژن بھی ابھر ابھر کر سامنے آنے لگتا ہے۔ بیشتر افسانوں میں یہ سناٹا، کرب، کشمکش اور کنفیوژن وجودی فکر Existential Philosophy کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور وجودیت جدیدیت کا ایک اہم عنصر ہے۔ جیسے افسانہ کرفیو ایک ایسے شخص سے متعارف کرواتا ہے جو مشینی زندگی گزار رہا ہے اور اب کرفیو کے باعث گھر میں قید ہے۔ وقت کی دستیابی اور ٹھہراؤ نے زندگی اور وجود کے بنیادی سوالات اس کے سامنے لا کھڑے کر دیے ہیں جن سے وہ جوجھ رہا ہے۔

"میری بیوی کچن سے نکل کر ہاتھوں میں چائے کا سامان اٹھائے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی میری طرف آرہی ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اگر وہ بھی مجھے نہ پہچان

پائے تو پھر کیا ہوگا؟ اپنے آپ کو میں کہاں تلاش کر پاؤں گا؟'' (کرفیو)۔

انسان کی شناخت کیا صرف اس کا وجود ہے یا آس پاس کے رشتے جن کے حوالے سے سماج اور خود فرد اپنے آپ کو پہچانتا ہے؟ اکثر افسانے اس سوال کے جواب کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ کئی افسانوں جیسے 'ان کہی بات'، 'نیند'، 'پناہ' وغیرہ کے کردار نجی خواہشوں وخوشیوں اور معاشرتی رشتوں کے دباؤ میں تال میل قائم کرنے کی کشمکش سے گزرتے رہتے ہیں۔ رشتے اور روایتی اقدار محمود شکیل اور ان کے کرداروں کے لیے مقدم ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں کہیں ان رشتوں کے بکھراؤ کے اندیشے ہیں تو کہیں ان کے ٹوٹنے کے نوحے۔

محمود شکیل کے افسانوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کھل کر وضاحت سے بات نہیں کرتے بلکہ ان کا بیانیہ قاری کو ہلکے ہلکے اشارے دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے جس سے آخر میں کہانی کا ایک پیٹرن ابھر آتا ہے۔ جیسے افسانہ جالے، نیند، ان کہی بات اور ٹوٹا ہوا آئینہ وغیرہ۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ محمود شکیل کے افسانے اپنی زمین، علاقے اور گنگا جمنی تہذیب سے جڑے ہیں، اس لیے اکثر افسانوں میں علاقے کے متوسط طبقے کی معاشرت وکلچر کی خوبصورت تصویریں نظر آتی ہیں۔

دکھتی رگ

مصنف: خالد بشیر تلگامی

صفحات: 180، قیمت: 250 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی، E-167، فورتھ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

انسانی تجربے کو نثری صورت میں کم سے کم لفظوں میں بیان کرنا افسانچہ کہلاتا ہے۔ آج اردو ادب میں افسانچہ بڑے آب وتاب کے ساتھ لکھا اور پڑھا جارہا ہے۔ سیکڑوں قلمکار افسانچہ لکھ رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نام خالد بشیر تلگامی کا بھی ہے جو اچھے افسانچہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ ان کے کئی افسانچے اخبارورسائل میں چھپ کر داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔

'دکھتی رگ' خالد بشیر تلگامی کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک نوجوان کہانی کار ہیں۔ اپنے فن کو نکھارنے اور اس کو حسن وخوبی اور تمام ضروری التزامات کے ساتھ منظر عام پر لانے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خالد بشیر تلگامی نے جس حسن اسلوبی سے سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دریا کو کوزے میں سمیٹنا یا قید کردینا جادوگری نہیں ایک فن ہے، اگر یہ فن کسی طور پر مجروح ہوتا ہے تو اس میں ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تحریر کو پڑھ کر کہیں بھی کسی بھی افسانچے میں ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے بہت ہی عمدگی کے ساتھ طویل کہانی کو مختصر انداز میں پیش کردیا ہے۔ کتاب میں تقریباً 106 افسانچے شامل ہیں جو مصنف کے تخلیقی ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ واقعی کتاب میں تمام افسانچے اپنی مثال آپ ہیں۔ بڑی سے بڑی بات کو بہت ہی سلیقے اور روانی کے ساتھ مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

صاحب کتاب اپنے افسانچہ 'تلاش' میں کہتے ہیں: ''وہ افسانچے لکھ کر اتنا مشہور ہوگیا تھا کہ لوگ چلتے پھرتے پوچھ لیتے۔ ''ارے بھائی! آج کے افسانچے کا عنوان کیا رکھا ہے آپ نے؟'' اس کا جواب ہوتا۔ ''جناب... سکون!'' کشمیر کے ہونے کی وجہ سے انھوں نے کشمیر کے درد وکرب کو اپنے افسانچوں میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جموں وکشمیر میں صنف افسانہ معتبر اور منفرد راستہ تلاش کرچکی ہے۔ جنت نشان شہر میں اب افسانہ نئے اسلوب اور نئے انداز کے ساتھ خوب لکھا جارہا ہے۔ ان کے افسانچوں میں احتجاجی آواز بھی ہے، کرب بھی اور حالات حاضرہ کی ترجمانی بھی ہے۔ افسانچے کے ذریعے معاشرہ کو پاک وصاف رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ زندگی کے کڑوے سچ کو افسانچوں کے ذریعے پیش بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانچے ذہن پر خوشگوار اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ 'دکھتی رگ' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد بشیر تلگامی افسانچہ نگاری کی لسانی، صنفی اور فنی خوبیوں اور ضرورتوں سے کماحقہٗ آگاہ ہی نہیں بلکہ اس فن کا وہ گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خالد بشیر تلگامی کے افسانوں اور افسانچوں کا کینوس بہت ہی وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے افسانچوں میں نہ صرف معاشرت، سیاست، سیادت، قیادت کے امراض کی نشاندہی کی ہے بلکہ سماج اور معاشرہ کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کا اہم فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ کتاب میں شامل ہر افسانچے کو 'دکھتی رگ' کا نام دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان کے افسانچے میں ذاتی کرب، انسانی درد، لسانی ملال، سیاسی جلال، کشمیر کے درد، قوم وملت کے غم اور ملک کے حالات ومسائل کا ذکر ہے۔

افسانچے کی کامیابی کے لیے تخلیقیت، تکمیلیت، اختتامی تاثر کا ابھر کر آنا، موضوع طاقتور ہونا، پیشکش کا جاذب اور اختتام موثر ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اور یہ سب صفات خالد بشیر تلگامی کی زیر تبصرہ کتاب 'دکھتی رگ' میں پائی جاتی ہیں۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد خوشی ہوتی ہے کہ افسانچوں کا مستقبل یقیناً بہت تابناک ہے، کیونکہ خالد بشیر تلگامی جیسے قابل اور بہترین سوچ کے حامل نوجوان قلمکار اس میدان میں موجود ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی تحریروں میں بڑی بڑی باتیں کہنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔

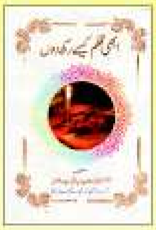

مضامین

ابھی قلم کیسے رکھ دوں

نام مصنف: سید علی حیدر رضوی

صفحات: 383، قیمت: 500 روپے

مبصر: وسیم مینائی، تارین جلال نگر، شاہجہاں پور۔ 242001 (یوپی)

'ابھی قلم کیسے رکھ دوں' جناب سید علی حیدر رضوی کے مضامین کا مجموعہ ہے جو ایک مقدمہ اور انتالیس مضامین پر مشتمل ہے۔ مصنف نے جو مقدمہ لکھا ہے اسے 'خود بینی وخود شناسی' سے موسوم کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر مجید بیدار نے 'سخن شناسی' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر مجید بیدار جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں مصنف کتاب سید علی حیدر رضوی کی تخلیقی صلاحیت پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے اور وہ اس نتیجے پر بھی پہنچتے نظر آتے ہیں کہ ایک صحافی (سید علی حیدر رضوی) باوجود یہ کہ وہ سینئر اور تجربہ کار صحافی ہیں مگر ان پر نثری تخلیقیت اس قدر غالب ہے کہ فن صحافت پیچھے چھوٹ گیا ہے اور موضوعاتی مضمون نے جگہ بنالی ہے۔ واضح کردوں کہ پروفیسر مجید بیدار نے اپنے مضمون میں مصنف کتاب کی ذاتی زندگی کے کسی پہلو کو اجاگر نہیں کیا ہے جبکہ دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔

سید علی حیدر رضوی کی تخلیقی نثر نگاری کافی مستحکم ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جو بڑے بڑے سائز کے 383 صفحات پر مشتمل ہے اپنے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: ادبیات، طنز ومزاح، شخصیات، سیاسیات۔ تمام مضامین مختلف رسائل وجرائد میں بھی وقفے وقفے سے شائع ہوچکے ہیں۔ اب اہل علم کی فرمائش پر کتابی شکل میں پیش کیے ہیں۔ سبھی مضامین مثبت اور تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ یہ بھی

جانتے ہیں کہ بیانات یا ادب میں بخیلی کو جگہ نہ دی جائے چنانچہ بڑے ہی خلوص سے طویل اور واضح بیانات سے ہر ایک مضمون کو پھیلاتے گئے ہیں۔ یہ خوبی ان ہی ادیبوں میں پائی جاتی ہے جن کی متنی لفظیات پر سخت پکڑ ہو اور نثر لکھنے میں اظہار کی برجستگی پائی جاتی ہو۔ ادبیات کے حصے میں 'ہماری اردو زبان اور اس کے ادب کا ارتقا' ایک طویل مضمون ہے اس میں اردو کی ابتدائی اور ارتقائی منازل اور لسانیات کے معانی و مطالب کو توضیح کی ہے۔ یہاں بھی انھوں نے تحقیقی ادب کو درکنار کرکے تخلیقی ادب کو جگہ دی ہے اگر وہ چاہتے تو اس میں دیگر اہل قلم حضرات کے مطبوعہ و منقولہ اقتباسات کو نقل کرکے مضمون کو اور طویل بنا دیتے مگر ایسا نہیں کیا۔ یہ خاصہ ہر ایک مضمون میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی زمرے میں دو مضمون 'اردو زبان کی ناقدری کے اسباب' اور 'کیا اردو کی حادثے میں موت ہوئی' اردو زبان و ادب کی زبوں حالی کا شکوہ ہے جن کی وجوہات پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ طنز و مزاح کے زمرے میں بارہ مضامین ہیں۔ پانچ تصوراتی انٹرویو کے ذریعے تہذیبی، معاشرتی اور ملکی قدروں کو مستحکم اور انسان سازی کو لازمی قرار دیا ہے۔ چونکہ اس طرح کے مضمون کے لیے کسی بڑی شخصیت کی تلاش تھی جو افعال و اقوال کا دھنی ہو چنانچہ مہاتما گاندھی سے بہتر انسان مصنف کو نظر ہی نہیں آیا۔ ایک انٹرویو ابلیس سے بھی کیا ہے۔ طنزیہ اسلوب کو بروئے کار لاتے ہوئے تمام مضامین لکھے گئے ہیں۔

شخصیات کے حصے میں سات مضامین ہیں جو حد درجہ سنجیدہ اور سادہ بیانی کا نمونہ ہیں۔ ان مضامین میں بھی کسی بھی طرح تحقیقی ادب ان کے تخلیقی ادب پر غالب نہیں آیا۔

غرض اس کتاب میں مشمولہ تمام مضامین بقول پروفیسر مجید بیدار "......ایسے خاکے لکھے کہ جس کی وجہ سے قلم میں موجود جادو بیانی اسلوب کی قسم کھانے پر مجبور ہو گئی۔ موضوعات اور تخلیقی نثر نگاری پر بیباکی ملمع سازی سید علی حیدر رضوی کی قلمی صلاحیت قائین سے داد خواہ ہے"۔ نثر نگاری پر حیدرآبادی لہجہ غالب ہے۔ بعض لفظی ساخت قاری کو رک کر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ زیر لب آکر معانی و مطالب کا گھونٹ پلا کر آگے بڑھنے کا اشارہ کرتی ہے۔ ایسے منجھے ہوئے قلمکار کو یہ کہنے کا پورا حق ہے کہ "ابھی قلم کیسے رکھ دوں۔"

طنز و مزاح

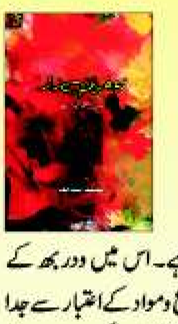

زعفران زار

مرتب: محمد اسد اللہ

صفحات: 368، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: الفاظ پبلی کیشن، ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

مبصر: شہلا پروین، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی

زیر تبصرہ کتاب 'زعفران زار' محمد اسد اللہ کی تالیف ہے۔ اس میں وِدربھ کے مختلف ادبا کی مزاحیہ نگارشات شامل ہیں۔ ہر تحریر اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے جداگانہ اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ بنیادی موضوع میں امتزاج نظر آتا ہے لیکن ہر ادیب کا انداز و بیاں ایک دوسرے سے مجموعی طور پر مختلف ہے۔ کتاب کا اولین باب 'وجود زن' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں پہلا مضمون شفیقہ فرحت کا 'بعد سبک دوشی' کے نام سے ہے، جس میں وہ بعد سبک دوشی کے قصے دہرا رہی ہیں۔ انھوں نے جہاں اس میں اپنی مصروفیات کا تذکرہ کیا ہے وہیں طنز و مزاح کی آمیزش سے اس مضمون کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس مضمون میں زندگی کے حوالے سے سنجیدہ گفت و شنید کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون سے ان کی زبان دانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ زبان و بیان کے اعتبار سے شفیقہ فرحت کا قد اونچا نہیں تاہم اپنی بات کو روزمرہ، عام فہم اور سادہ اسلوب میں ادا کرنے کا ہنر انھیں آتا ہے۔ محاورات کا بھی دلکش اور موثر طریقے سے استعمال کرتی ہیں۔ حصہ اول کے دیگر مضامین میں 'تیرا ممنون ہوں' ڈاکٹر بانو سرتاج کا 'یور آنر' ثریا صولت حسین کا اور 'مبارکبادیں' سلمی نسرین کا شامل ہیں۔ 'تیرا ممنون ہوں'' مضمون طنز و مزاح کے اعتبار سے ایک اہم تحریر ہے۔ اس مزاحیہ مضمون میں پی ایچ ڈی کے اظہار تشکر کے حوالے سے مضمون نگار نے مزاحیہ کلمات کی بھرمار کی ہے لیکن اس تحریر سے حقائق کے کئی اہم پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کو ایک ریسرچ اسکالر ہی جانتا اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ مضمون کی نوعیت مزاحیہ ہے لیکن زبان و بیان میں سادگی اور شگفتہ پن موجود ہے۔ غرض حصہ اول کے تمام مضامین مزاحیہ نوعیت رکھتے ہیں، ان میں زندگی کے مختلف تجربات و معاملات کو مزاحیہ انداز میں حوالۂ قلم کیا گیا ہے۔ ان میں ادبی لطافت اور چاشنی موجود ہے جو قاری کے لیے باعث لطف و انبساط محسوس ہوتی ہے۔

باب اول کا حصہ دوم بعنوان 'مرد میداں: طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکے' شامل ہے۔ حصہ دوم میں مختلف ادبا کے مضامین اور چند خاکہ نما مضامین شامل ہیں۔ مضامین کے عنوان کچھ اس طرح ہیں قطب الدین ایبک اور ہمارے کتب الدین، لیٹر پیڈ، مہمانوں کا سیلاب، میں کہاں کہاں نہ بھٹکا، ہمی اس شوخ کے مارے ہوئے ہیں، شگفتا، علامہ غمگین، کلام برائے کلام، نوٹ وغیرہ ہیں۔ ان مضامین میں جہاں طنز و مزاح کے عناصر موجود ہے وہیں یہ قاری کو شعوری طور پر متاثر کرنے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔

کتاب کا باب دوم 'یارانِ بے پیالہ' کے عنوان سے ہے۔ اس میں بھی مختلف ادیبوں کے مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کے عنوان کچھ اس طرح ہیں: تزک چغدی، والدین، قوالی، زوجہ گزیدہ، محلے کا سرکاری نل، آپ کے منہ میں، چچا چھکن نے آن لائن مشاعرے میں شرکت کی وغیرہ۔ یہ مضامین مختلف ادیبوں کے ہیں۔ ان میں سے ہر تحریر اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ ان میں جہاں اخلاقی باتیں موجود ہیں وہیں تخیل کی کارفرمائی سے رنگارنگ مزاحیہ عناصر پیدا کیے گئے ہیں جو قاری کے لیے باعث مسرت و انبساط بن جاتے ہیں۔

باب سوم جو کتاب کا آخری باب ہے یہ 'فردوسِ گوش' کے عنوان سے ہے جس میں ودربھ کی مزاحیہ شاعری شامل ہے۔ اس میں ودربھ سے تعلق رکھنے والے مختلف شعرا کا مزاحیہ کلام پیش کیا گیا ہے۔ ہر شاعر مزاح برتنے کا انوکھا اور اک اور سلیقہ رکھتا ہے۔ ان شعرا کے مزاحیہ کلام میں زندگی سے متعلق سنجیدہ پہلوؤں کو مزاحیہ انداز میں بیان کرنے کی عمدہ کوششیں ملتی ہے نیز اس میں شہر کے رسم و رواج، تہذیب و ثقاف، رہن سہن اور تعلیم سے بیزاری وغیرہ جیسے اہم پہلوؤں کو مزاحیہ اسلوب میں مقید کرنے کی عمدہ کوششیں کی گئی ہے۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ان تخلیق کاروں کا سرسری تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جن کے مضامین کتاب کی زینت بنے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے جہاں ان تخلیق کاروں کی تخلیقی صلاحیت اور ان کے تخیل کی پختگی سے قاری آشنا ہوتا ہے وہیں زمانے میں پنپنے والے حقائق بھی طنز و مزاحیہ اسلوب میں قاری کے سامنے آتے ہیں۔ یہ کتاب مزاحیہ ادب میں ایک عمدہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرتب نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ ان مضامین کو جمع کرکے جہاں اپنے ذوقِ ادب کا ثبوت پیش کیا وہیں قارئین کے مطالعے کی آسانی کے لیے مختلف خوبصورت تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ مختصراً زیر تبصرہ کتاب ادب کے اعلیٰ شاہکاروں میں نہ سہی، لیکن ایک عمدہ ادبی کاوش ضرور ہے، جو ہمیشہ مزاحیہ ادب میں اہمیت و معنویت کی حامل رہے گی۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

آزادیِ ہند میں اردو زبان وادب کا کردار ناقابلِ فراموش: پروفیسر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں آج 77 ویں یوم آزادی کی مناسبت سے پرچم کشائی کی تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تمام اہل وطن کو جشن آزادی کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم بھارت کا 77 واں یوم آزادی منا رہے ہیں، جو ہمارے بے لوث قائدین کی قربانیوں کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک کو آزاد

کروانے میں تمام طبقات اور مذاہب کے لوگوں کا حصہ رہا ہے اور سارے ہندوستانیوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی، جس کے نتیجے میں وطن عزیز کو آزادی وخود مختاری حاصل ہوئی۔ انھوں نے آزادی کی تحریک میں خاص طور پر اردو زبان کے کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو نے شروع سے آزادی کے متوالوں کے جوش و جذبے کو مہمیز کیا اور باشندگانِ ہند کے دلوں میں بیرونی تسلط کے خلاف انقلاب و بغاوت کے بیج بوئے جس کے نتیجے میں ملک کے ہر گوشے میں حب الوطنی وآزادی کے نعرے گونجنے لگے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے صحافیوں، شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں نے تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے قلم کی طاقت کا خوب استعمال کیا جس کی وجہ سے درجنوں صحافیوں اور شاعروں کو انگریز حکومت نے سخت سزائیں دیں، بلکہ 1857 کے انقلاب میں شرکت کی پاداش میں سزائے موت پانے والے اولین صحافی اردو کے ہی تھے۔ ان کے علاوہ 1947 تک اس زبان سے تعلق رکھنے والے نہ جانے کتنے ہی جیالوں نے گلستانِ وطن کو اپنے خون سے سیراب کیا۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آج ضرورت ہے کہ ہم نئی نسل کو اپنے قائدین کی قربانیوں سے آگاہ کریں تاکہ ہمیں آزادیِ وطن کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس ہو اور ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کا جذبہ بیدار ہوسکے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اگست 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

تعلیم کے فروغ اور قومی تعمیر میں مسلم خواتین کا کردار

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ معروف دانشور ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے 'تعلیم کے فروغ اور قومی تعمیر میں مسلم خواتین کا کردار' کے موضوع پر خطاب کیا۔ انھوں

نے فرمایا کہ مسلم خواتین کے قائدانہ کردار پر جب ہم بات کرتے ہیں تو عام خیال یہ ہوتا ہے کہ گفتگو 1947 کے بعد سے شروع ہوگی۔ حالانکہ میں نے جب اس موضوع پر مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ 1857 میں بھی ہمارے یہاں ایسی خواتین تھیں جن کی قائدانہ صلاحیتوں نے انگریزوں کے منصوبوں کو کافی حد تک بے اثر کر دیا تھا۔ اس یادگاری خطبے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئر مین جسٹس جناب بدر دریز احمد صاحب نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ بیگم عابدہ احمد ایک منصوبہ ساز شخصیت کی مالک تھیں۔ انھوں نے جو اقدام کیے ان کے نتائج کا فیضان آج تک عام ہے۔ آج کے خطبے کا موضوع اور ان کی شخصیت میں گہرا ربط ہے۔ سیدہ سیدین حمید صاحبہ نے جس انداز سے اس موضوع کے پہلوؤں کو واضح کیا ہے اس کا انھیں حق ہے۔ ان کے خانوادے میں علمی روایت کا روشن سلسلہ رہا ہے۔ سیدہ سیدین صاحبہ چونکہ خود بھی ایسے اداروں سے وابستہ رہی ہیں جو خواتین کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں لہٰذا ان کو ان مسائل کی اہمیت کا بھی اندازہ ہے اور اس کے تدارک کے لیے کیا منصوبے ہونے چاہئیں اس سے بھی واقف ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ عزت مآب فخرالدین علی احمد ہوں یا بیگم عابدہ احمد صاحبہ ان کی شخصیت اتنی پہلو دار تھی کہ انھیں کسی ایک خانے میں مقید کرنا زیادتی ہوگی۔ ان لوگوں نے ادب اور سماج دونوں کے رشتے کو بڑی ذمے داری سے نبھایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے نام سے منسوب ان خطبوں میں ہماری کوشش رہتی ہے کہ خالص ادبی مسائل سے ہٹ کر کچھ گفتگو ہو۔ سیدہ سیدین حمید صاحبہ ہر لحاظ سے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے موزوں شخصیت ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع اس خطبے میں بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ خواتین کے مسائل وہ بھی ہیں جن کو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ مسائل زیادہ اہم ہیں جن کو چھپایا جاتا ہے یا ان پر بات کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ سیدہ سیدین صاحبہ نے جس موضوع کو اٹھایا ہے میں سمجھتا ہوں اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو یادگاری خطبات کا انعقاد کرتا ہے۔ ایک فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ اور دوسرا بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبہ۔ بیگم عابدہ احمد 1982 سے 2003 تک غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیئر مین رہیں۔ آپ نے ہی اس ادارے میں غالب میوزیم اور ہم سب ڈرامہ گروپ کی بنیاد رکھی تھی۔ آج یہ ادارہ جس منزل پر ہے اس میں بیگم صاحبہ کی قربانیاں شامل ہیں۔ ہمالیہ گروپ کے صدر جناب ایس فاروق صاحب نے کہا کہ اگر کچھ لوگ عورتوں کے مسائل کا رخ موڑتے ہیں تو دانشور طبقے کو چاہیے کہ ان کے اصل مسائل کو مرکز میں لائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج کے اس لکچر سے یہ کام بحسن خوبی مکمل ہوتا ہے لیکن ایسی مزید کوششیں ہونی چاہیے۔ اس موقعے پر علم و ادب اور سماجی شعبوں سے وابستہ افراد نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2023

غالب اکیڈمی میں ماہانہ ادبی نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی میں 10 جولائی کو ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جی آر کنول نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد نے خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات پر مضمون پڑھتے ہوئے کہا کہ خواجہ حسن نظامی اردو کے صاحب طرز نثر نگار تھے، ان کی نثر میں محمد حسین آزاد کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے اور خواجہ صاحب کے بعد کے ادیبوں میں خواجہ حسن نظامی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو اردو کے مشہور و مقبول ترین انشائیہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر ہندی کی شاعرہ سنتوش کماری کی مرتبہ کتاب 'دلی درپن' کا اجرا عمل میں آیا۔ سنتوش کماری نے اپنی کتاب کے بارے میں کہا کہ اس میں اکسٹھ شاعروں کے دوہے یکجا کیے گئے ہیں، جو دلی کی ترقی کی عکاسی کرتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 جولائی 2023

شاہ ولی اللہ میموریل لکچر

نئی دھلی: مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جے این یو میں شاہ ولی اللہ میموریل لکچر کے نویں سیشن کا انعقاد عمل

میں آیا۔ اسلامی تاریخ کی اہم ترین شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ کی یاد میں منعقد اس سیشن میں پروگرام کا عنوان تھا 'مطالعہ قرآن میں مولانا حمیدالدین الفراہی کی خدمات'۔ پروفیسر شوبھا سیوسنکرن، ڈین اسکول آف لینگویجز، نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، اس کے بعد مہمان خصوصی پروفیسر محمد اسحاق صاحب ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لنگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے موضوع پر خطاب پیش کیا، جس میں انھوں نے مولانا حمیدالدین فراہی کی خدمات خصوصاً قرآن اور عربی میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی، انھوں نے بتایا کہ مولانا فراہی نے مطالعہ قرآن میں نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، قرآن کی تفسیر میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے ممتاز مفسرین میں ان کا شمار ہوتا ہے، اور انھیں اسلام کی تعبیر جدید کا بانی تصور کیا جاتا ہے، زیادہ تر ان کی کتابیں عربی زبان میں ہیں لیکن بعض سورتوں کی تفسیر انھوں نے اردو میں بھی کی ہیں، وہ اردو اور عربی زبان میں یکساں مہارت رکھتے تھے، ساتھ ہی پروفیسر اسحاق صاحب نے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ شعبۂ عربی کی ذمے داری ہے کہ وہ ان کی خدمات اور علمی ورثہ کو آگے بڑھائے اور ان پر مزید تحقیقی کام ہو۔ پروفیسر وجیندر ناتھ داس نے صدارتی خطاب میں ہندوستان میں اسلامی تہذیب اور مطالعہ قرآن میں ہندوستانی علما کی خدمات کو سراہا اور انھوں نے کہا کہ ہر عہد میں ہندوستان نے ایسی مایہ ناز شخصیات پیدا کی ہیں جنھوں نے قرآن میں اہم خدمات انجام دیں۔ واضح ہو کہ مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات جے این یو ہر سال شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر کا انعقاد کرتا ہے جس میں ملک کی کسی اہم شخصیت کی علمی و تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے، آج کے اس پروگرام میں پروفیسر رضوان الرحمٰن، چیئرپرسن مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جے این یو، پروفیسر عبیدالرحمٰن، پروفیسر خورشید عالم، پروفیسر محمد اجمل اسسٹنٹ پروفیسر زرنگار اور شعبے کے دیگر اساتذہ وطلبہ بھی موجود تھے۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا بھی سیشن تھا جس میں شرکا نے کافی دلچسپی کے ساتھ اپنے سوالات رکھے جن کا مہمان خصوصی نے تشفی بخش جواب دیا۔ شعبۂ عربی میں استاد ڈاکٹر اختر عالم نے نظامت کی ذمے داری نبھائی، پروفیسر قطب الدین نے مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے مولانا حمیدالدین فراہی کی علمی و تحقیقی خدمات پر ریسرچ کرانے میں دلچسپی ظاہر کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جولائی 2023

عہد حاضر میں ڈیجیٹل میڈیا کی اہمیت وافادیت

نئی دھلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی کی طرف سے ایک آن لائن پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان 'عہد حاضر میں ڈیجیٹل میڈیا کی اہمیت اور افادیت' تھا۔ اس آن لائن سیشن میں مقرر خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سید تقی عابدی مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب نصر ملک جب کہ صدر کی حیثیت سے پروفیسر شہاب عنایت ملک نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے عہد حاضر میں ڈیجیٹل میڈیا کی اہمیت وافادیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''جی پی ٹی اور آرٹیفیشیل انٹیلی جنس'' آج کے دور کی پیداوار ہے۔ اردو والوں کو اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ چونکہ یہ ایک سافٹ ویئر ہے۔ سرچ انجن کے پاس جتنا زیادہ مواد ہوگا، چیٹ جی پی ٹی اس کا جواب بہتر طور پر دینے کا اہل ہوگا۔ مقرر خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے توسیعی خطاب میں 'ڈیجیٹل میڈیا' کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو اس جانب خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ قدیم دور میں معلومات کے لیے میلوں کا سفر طے کرنا پڑتا تھا مگر اب سب کچھ اسکرین پر موجود ہے۔ اس لیے اردو ادب کو جدید وسائل سے مالا مال کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس تہذیبی زبان تک سب کی رسائی آسانی سے ہوسکے۔ اگر جدید وسائل کی فراہمی ہوگی تو اردو کے طالب علموں کے لیے جاب بھی مارکیٹ میں آئیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو برادری ٹکنالوجی اور پروفیشنل کورسیز کے ذریعے اردو زبان کے لیے کام کرے۔ مہمان خصوصی جناب نصر ملک نے اپنے خطاب میں ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی کاوشوں کو سراہا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 18 جنوری 2023

اتر پردیش

فروغ اردو کے دیگر ذرائع

لکھنؤ: فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام 15 جولائی کو ہندی سنستھان میں سمینار و ایوارڈ تقریب کا انعقاد ہوا۔ سمینار کا موضوع اردو فروغ کے دیگر ذرائع (ادب و صحافت کے علاوہ) تھا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر مملکت اتر پردیش دانش آزاد انصاری نے شرکت کی۔ کمیٹی کے چیئرمین سید اطہر صغیر زیدی نے کہا کہ یہ اپنی نوعیت کا ایک الگ پروگرام ہے کیونکہ ہم اس پروگرام میں ان افراد کی بات کر رہے ہیں اور انھیں ایوارڈ سے سرفراز کر رہے ہیں جو حقیقت میں بغیر کسی لالچ کے اردو کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس طرح کے افراد اپنے کام یعنی اردو کی خدمت سے غرض رکھتے ہیں یہ کسی ایوارڈ وغیرہ کے لیے کام نہیں کرتے۔ ان میں نہ کوئی ادیب ہوتا ہے، نہ شاعر، نہ صحافی اور نہ کسی کالج، یونیورسٹی یا اکادمی سے منسلک ہوتا ہے، بس وہ اپنے فن کے ذریعے اردو کے فروغ میں لگے رہتے ہیں۔ پروگرام کے کنوینر ایس این لعل نے بتایا کہ اس موقعے پر جن 12 افراد کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ان میں پتھر اور کپڑے پر اردو لکھنے والے، پروف ریڈر، اردو کمپیوٹر آپریٹر، نعت، قوالی، سوز، سلام، نوحہ اور نظامت و ڈراموں میں ڈائیلاگ کے ذریعے اردو کے فروغ میں شامل افراد ہیں۔ اس موقعے پر پروگرام کی صدارت معمر صحافی احمد ابراہیم علوی نے کی۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے اقلیتی کمیشن کے ممبر سردار پروندر سنگھ، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے سکریٹری اطہر نبی، کے ایم سی لسانی یونیورسٹی کے پروفیسر سید شفیق اشرف اشرفی شریک ہوئے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کی۔ سمینار میں جن افراد کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ان میں پتھر پر اردو لکھنے کے اعتراف میں آغا محمد حسن کو میر انیس ایوارڈ، سید حسن رضا کو سوز پڑھنے پر مرزا دبیر ایوارڈ، محترمہ سنیتا جھنگرن کو نوحہ وسلام پڑھنے پر بیگم اختر ایوارڈ، جناب انور فریدی کولکاتا کو قوالی کے لیے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی ایوارڈ، جناب شجے نقوی کو مرثیہ پڑھنے کے لیے جوش ملیح آبادی ایوارڈ، محمد خالد اعظمی ندوی کو پروف ریڈنگ و اردو کمپیوٹر آپریٹر کے لیے مولانا رابع حسنی ایوارڈ، عبدالنصیر ناصر کو اردو کے فروغ کی تحریک چلانے کے لیے علامہ محمد اقبال ایوارڈ، محترمہ کاشفی شمائل دہلی کو ٹیلی ویژن پر اردو نظامت کے لیے قرۃ العین حیدر ایوارڈ، سید سبط رضا کو کپڑے پر اردو لکھنے کے لیے سرسید احمد خاں ایوارڈ، محترمہ چندرانی مکھرجی چاند دہلی کو ڈراموں کے ذریعے فروغ اردو کے

لیے عصمت چغتائی ایوارڈ، روہت کمار میت کو اردو غزلوں کو بریل رسم الخط میں تحریر کرانے کے لیے فراق گورکھپوری ایوارڈ، وزیر حسن چندا کو کتابوں کے کور، پوسٹر وغیرہ ڈیزائن کرنے کے لیے منشی نول کشور ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ سیمنار میں فروغ اردو کے دیگر ذرائع (ادب وصحافت کے علاوہ) پر مقالہ نگاران میں ڈاکٹر سیما صدیقی، ڈاکٹر حنا کاظمی، ڈاکٹر یاسر جمال، ڈاکٹر زہبت فاطمہ، عبدالقدوس اور غلام عباس بلوری شامل تھے۔

پریس ریلیز: مسیح الدین خان، لکھنؤ، 15 جولائی 2023

شعبۂ اردو، اے ایم یو میں تین سو سالہ جشن میر

علی گڑھ: میر تقی میر ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں گوشت پوست کا انسان اپنے تمام تر جذبات واحساسات کے ساتھ نظر آتا ہے، وہ اوران کا محبوب دونوں انسانی سطح پر رہ کر، سوچتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ میر کے افکار ان

کے زمانے میں بھی اہم تھے اور آج بھی ان سے روشنی ملتی ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے شعبہ اردو کے رشید احمد صدیقی آڈیٹوریم میں سمینار میں صدارتی خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ میر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تین سو برس گزر جانے کے بعد بھی آج ان کی شاعری مقبول عام ہے۔

سابق صدر شعبہ فارسی پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا، میر ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں امکانات کی دنیا بہت وسیع ہے اور ہر وقت یہ امکان موجود رہتا ہے کہ نئے گوشوں تک رسائی حاصل کی جاسکے۔ یہ صرف اس وجہ سے ممکن ہے کہ میر نے ایسی لفظیات اور ایسے اسلوب کا استعمال کیا ہے جن میں امکانات بھرے پڑے ہیں۔

فارسی کی معروف دانشور اور سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ میر کی شاعری کی تفہیم کے لیے فارسی ضروری ہے اس لیے اہل اردو کو اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اہل اردو اور فارسی کو مل کر میر شناسی پر کام کرنا چاہیے اس سے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میر کی شاعری میں حسن اور حزن زندگی کا لازمہ ہے اور میر کی شاعری کا یہی محور ہے۔

ڈین فیکلٹی آف آرٹس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر عارف نذیر نے کہا میر کی شاعری مقبول عام ہے جس کی وجہ لسانی رچاؤ ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہندستان کی دیگر زبانوں میں بھی میر کی شاعری کا ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ استقبالیہ کلمات صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد علی جوہر نے پیش فرمائے۔ استقبالیہ کلمات کے بعد ایم اے سال آخر کی طالبہ زاہدن خاتون نے اپنی مترنم آواز میں میر کی معروف زمانہ غزل 'دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا' گا کر سنائی اور محفل کو مسحور کر دیا۔ نظامت کے فرائض دو روزہ جشن میر کے کنوینر ڈاکٹر غلام سرور نے انجام دیے۔ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سیمنار کے چھ تکنیکی سیشن منعقد کیے گئے جس میں ملک و بیرون ملک کے دانشوروں نے اپنے تحقیقی و علمی مقالے پیش کیے۔ جبکہ ایک سیشن صرف طلبا وطالبات کے لیے مختص کیا گیا تھا جس میں شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالروں نے اپنے مقالے پیش کیے تاکہ ان کی بھی تربیت ہو سکے۔

پہلے سیشن میں پروفیسر خواجہ اکرام، عارف حسن خاں، ڈاکٹر راغب اختر، ڈاکٹر احمد امتیاز، اور ڈاکٹر عرفان ندوی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس سیشن کی صدارت سید محمد اشرف اور پروفیسر خواجہ اکرام نے کی جبکہ نظامت پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے کی۔ دوسرا تکنیکی سیشن آن لائن تھا جس کی صدارت محمد حمید شاہد (پاکستان) نے کی۔ اس میں پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر علی بیات تہران یونیورسٹی ایران، سرور غزالی جرمنی، پروفیسر غلام ربانی بنگلہ دیش اور ولاء جمال عسیلی عین شمس یونیورسٹی قاہرہ مصر نے اپنے گرانقدر مقالے پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر معید الرحمٰن نے انجام دی۔ تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر علی رفاد فتیحی اور پروفیسر شہاب الدین نے کی جس میں پروفیسر علی رفاد فتیحی، پروفیسر شہاب الدین، پروفیسر نسرین بیگم، اشفاق عارفی، ڈاکٹر مامون رشید نے اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھے سیشن کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی، جس میں ڈاکٹر عمر رضا، ڈاکٹر شارق، ڈاکٹر معید الرحمٰن، ڈاکٹر معید رشیدی، ڈاکٹر سرفراز خالد، ڈاکٹر شہاب الدین اور ڈاکٹر محمد کیف فرشوری نے اپنے مقالے گوش گزار کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر امتیاز احمد نے کی۔ پانچویں سیشن کی صدارت پروفیسر عقیل احمد اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور نظامت ڈاکٹر خالد حیدر نے کی۔ جس میں پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر ابوبکر عباد، پروفیسر محمد کاظم، ڈاکٹر محمد خلیق الزماں، ڈاکٹر حامد رضا اور محمد حنیف خان نے مقالے پیش کیے۔ چھٹے سیشن کی صدارت پروفیسر طارق چھتاری اور نظامت ڈاکٹر معید الرحمٰن نے کی۔ جس میں ریحانہ حسن، یاسمین کوثر، راشد قادری، فہمیدہ علی، زرین فاطمہ، سیری سہیل، طاہر حسین، جاوید اشرف، صدام حسین، محمد ابرار، بلقیس مقبول، انجم اکرام، جعدیہ امجد اور ادیبہ صدیقی نے مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید محمد ہاشم نے جبکہ نظامت ڈاکٹر سلطان احمد نے کی۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، علی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 14 اگست 2023

جرمنی میں اردو زبان وادب

میرٹھ: اسلم سید ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اگر میں جرمن میں کسی سے مشورہ لیتا ہوں تو وہ صرف آپ کی ذات ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جب میں کیرم کا ٹورنامنٹ کرا رہا تھا تو کیرم میں بھی آپ نے دلچسپی لی، ڈرامے پر بھی آپ نے دلچسپی لی۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں علامہ اقبال آئے اور انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر علیم وغیرہ بھی آئے۔ ایسا نہیں کہ میں نے پہلی بار یہاں اردو کی بات کی۔ بنیاد تو پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ میں نے اردو شروع نہیں کی بلکہ مجھ سے پہلے یہاں اردو بولنے والے موجود تھے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب وشاعر عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیسا) کے زیر اہتمام 27/ جولائی 2023 کو منعقد 'جرمنی میں اردو زبان وادب' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فیض، سجاد ظہیر، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری وغیرہ، بہت سے اردو کے شعرا وادیب آتے رہے ہیں جن کے ساتھ ہم جلسے کرتے تھے اور آج بھی انور ظہیر، ریاض شیخ، طاہر رباب، کشور مصطفیٰ، عبدالرزاق، کاشف وغیرہ ایسے نام ہیں جو مسلسل ادبی کاموں میں

لگے ہوئے ہیں۔

اس ادب نما پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ مہمانان خصوصی کے بطور جرمنی سے پروفیسر اسلم سید (صدر رائن سندھ گلوبل کلچرل فورم، بون) اور جرمنی کے ہی ڈاکٹر ریڈز (برلن گریجویٹ اسکول مسلم کلچرس اینڈ سوسائٹی، برلن) جب کہ مہمان اعزازی کے بطور عبد الرزاق (صدر انڈین مسلم، جرمن) نے شرکت کی اور مقرر کے طور پر آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین آن لائن موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت کے فرائض سیدہ مریم الٰہی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر آصف علی نے انجام دی۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ جرمنی میں ڈراموں، مشاعروں کے علاوہ بھی اردو کی نئی بستیاں بس رہی ہیں جو اردو ادب کے فروغ میں لگی ہوئی ہیں۔ عارف نقوی اور پروفیسر اسلم سید نے جرمنی میں اردو کے فروغ میں حصہ لیا۔ اب وہاں پر اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں جو جرمنی کے لیے بہت اچھا ہے۔ پروفیسر اسلم سید نے کہا کہ جرمنی میں اردو کے لیے بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے۔ دنیا کی بین الاقوامی زبانوں میں انگریزی زیادہ بولی جاتی ہے مگر عارف نقوی نے اردو زبان کے فروغ کے لیے بہت کام کیے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ یوروپ میں اردو کے فروغ کے حوالے سے جب کوئی مقالہ لکھا جائے گا تو یقیناً اس میں عارف نقوی کا نام آئے گا۔ جرمن اپنی زبان پر بڑا فخر کرتے ہیں اور یہ خود ہی اپنی زبان کے الفاظ بھی بنا لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں اردو کو فروغ دینا عارف نقوی کا منفرد کارنامہ ہے۔ انھوں نے اردو کا ایک باغ لگانے کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر ریڈز نے کہا کہ جرمنی میں مختلف موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو پر بھی توجہ دی جاتی ہے اور بہت سے اردو اسکالر اس کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں اور اس جانب توجہ دیتے ہیں۔ لکھنؤ سے آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ جرمنی میں اردو ادب کے حوالے سے عارف نقوی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہم اسلم سید اور عارف نقوی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو کی ایسی شمع جلائی جو دور تک روشنی دیتی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ اسلم سید اور عارف نقوی کے ذریعے اردو کا یہ کارواں آگے بڑھتا رہے گا۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 27 جولائی 2023

بہار

پریم چند کی عصری معنویت

پٹنہ: پریم چند کی عصری معنویت سے کسی کو انکار نہیں مگر ضرورت ہے کہ اس میں اضافہ کیا جائے یعنی ان کی غیر معروف کہانیوں اور تحریروں کو موضوع گفتگو بنایا جائے۔

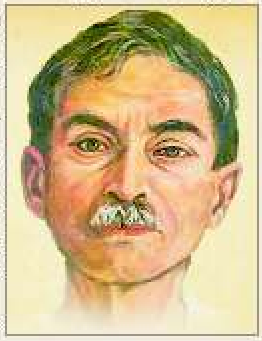

ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر قاسم خورشید نے کیا۔ وہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں پریم چند کے یوم پیدائش پر منعقد 'پریم چند کی عصری معنویت' کے موضوع پر ایک سمپوزیم سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کو اپنی فکر اور اپنی پسند کے مطابق رائے دینی چاہیے۔ مثلاً میں 'کفن' سے زیادہ 'پوس کی رات' کو پریم چند کا نمائندہ افسانہ قرار دیتا ہوں۔ دوسروں کی رائے کو دہرانا تنقید و تحقیق نہیں ہے۔ سمپوزیم کی صدرت پروفیسر توقیر عالم سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر قاسم خورشید اور اسفر فریدی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر استقبالیہ خطاب کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ پریم چند ایک عہد کا نام ہے۔ یہ ایسا روشن عہد ہے جس سے ہمارا ادب اور معاشرہ آج تک منور ہے۔ ان کی کہانیوں، ناولوں اور تحریروں کی معنویت آج کہیں زیادہ برقرار ہے۔ انھوں نے کسانوں، مزدوروں کے مسائل، فرقہ واریت، عدم تشدد، عورتوں کے مسائل اور کئی اہم موضوعات پر پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں کے حوالے سے ان کے خیالات کی عصری معنویت پر مدلل گفتگو کی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر توقیر عالم نے پریم چند کی صحافت اور صحافتی تحریروں کو موضوع بنایا اور کہا کہ پریم چند بحیثیت صحافی بھی آج کی صحافتی دنیا کے لیے مشعل راہ ہیں۔ وہ صرف کہانی کے رہنما نہیں بلکہ صحافت اور میڈیا کے بھی رہنما ہیں۔ صحافی اور کالم نگار اسفر فریدی نے پریم چند کی تحریروں میں 'عزت نفس' کی تلاش کی اور کہا کہ وہ سماج کے کسی مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس میں عظمت آدم اور عزت انسانی کو فوقیت دیتے ہیں۔ تقریب میں طلبا کی جانب سے محمد شمشیر انصاری، محمد کمیل رضا، محمد مہزاد، رفعت سلیم، شہلا پروین، عتیق الرحمٰن، محمد شہواز اور محمد رومان اختر نے بھی پریم چند کو خراج عقیدت پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر شبنم نے کی جب کہ شکریہ کے فرائض ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے انجام دیے۔ تقریب میں عظیم آباد کی اہم اور معتبر شخصیات کے علاوہ کثیر تعداد میں اردو کے ریسرچ اسکالر، اساتذہ اور طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اگست 2023

تملناڈو

پروفیسر بی شیخ علی: حیات اور خدمات

میسور: کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے پروفیسر بی شیخ علی مرحوم کی یاد میں ایک تاریخ ساز سیمینار بعنوان 'پروفیسر بی شیخ علی: حیات اور خدمات' کے موضوع پر ہوا۔ افتتاحی تقریب کی نظامت

شعبے کے اسسٹنٹ پروفیسر و سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد نصر اللہ خان نے کی۔ سیمینار کے مقالوں پر مشتمل کتاب مرتبہ ڈاکٹر نصر اللہ خان اور ان کی دوسری کتاب 'شمع فروزاں' کا اجرا بھی ہوا۔ سیمینار کی صدارت یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر شرانپاوی بلیے نے کی اور یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر کے ایل این مورتی کے علاوہ اہم آفیسرز شریک رہے۔ کلیدی خطاب ڈاکٹر ماہر منصور کا رہا۔ افتتاحی کلمات ڈین اکادمک پروفیسر این لکشمی نے پیش کیے۔ ڈاکٹر ماہر منصور نے ایک جامع کلیدی خطبہ پیش کیا۔ آپ نے مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی اور ان کی تاریخی خدمات کا احاطہ کیا۔ رجسٹرار پروفیسر کے ایل این مورتی نے شیخ علی صاحب کی خدمات کا جائزہ لیا اور کہا کہ یہ سیمینار ایک اہم شخصیت پر ہو رہا ہے اور یہ کتاب جو ابھی شائع ہوئی ہے وہ ان کے کارناموں کو مزید طلبا اور عام لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی۔ انھوں نے شعبۂ اردو کی اس کاوش کی ستائش کی اور مبارکباد پیش کی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شرانپاوی بلیے نے اس کامیاب سیمینار کے انعقاد پر اردو شعبے کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف کی شخصیت ہمہ گیر تھی، وہ دو دو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اس کے علاوہ درجنوں کتابوں کے مصنف تھے۔ روزنامہ سالار کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ان کی سماجی، تعلیمی و ملی خدمات بڑی معنی خیز ہیں۔

آخر میں اظہار تشکر کے فرائض ڈاکٹر عشرت فاطمہ نے ادا کیے۔ اس کے بعد چار سیشن میں مقالے پیش کیے گئے جن میں پروفیسر ایس مسعود سراج، پروفیسر حبیب احمد کے، پروفیسر سید خلیل احمد، پروفیسر رفعت النسا بیگم، پروفیسر سید سجاد حسین، پروفیسر کے وی نکولن، پروفیسر ایس اے ستار، پروفیسر عبدالرب استاد نے صدارت کی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر امین اللہ خان، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر امان اللہ، ڈاکٹر شکیلہ گوری خان، عبدالرحمن مصور، ڈاکٹر انو پماپول، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر محمد منظور نعمان، پروفیسر نجیبہ سلطانہ، ذبیح اللہ، ڈاکٹر نجمہ سلطانہ، ڈاکٹر سمینہ کے بی، ڈاکٹر حجاز لطیف، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر تہمیم احمد وی، ڈاکٹر حاذق ندوی، ڈاکٹر عتیق الرحمن، ڈاکٹر خدیجہ تسنیم، ڈاکٹر نجمہ سلطانہ، ڈاکٹر عمران احمد، خوشتری بیگم، عرشیہ فردوس، ذبیح اللہ، ڈاکٹر سعیدہ بیگم، حجاز لطیف، سمینہ بی نے مقالات پیش کیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد نصر اللہ خان، شموگہ، 16 جولائی 2023

پروفیسر قاضی حبیب احمد: شخصیت اور خدمات

میل وشارم: شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج (خودمختار) میل وشارم کی جانب سے ایک روزہ سمینار بعنوان پروفیسر قاضی حبیب احمد شخصیت اور خدمات کا انعقاد کیا گیا۔ کالج پرنسپل ایس اے ساجد نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے

ہوئے کہا کہ صاحب سمینار پروفیسر قاضی حبیب احمد صاحب کی اردو خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور اس علاقے میں اردو کے ہر پروگرام اور پروجیکٹ کے روح رواں آپ ہی ہوا کرتے ہیں۔ مزید کہا کہ سی عبدالحکیم کالج میل وشارم سے آپ کے کافی گہرے تعلقات ہیں بلکہ ہم تو آپ کو کالج کا ایک اہم رکن سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد مہمانوں کی شال پوشی کی گئی۔

مہمان خصوصی پروفیسر سید سجاد حسین نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب اپنے عہد کے ایک کامیاب استاد ہیں، طلبا کے دلوں میں گھر کرنے کا فن آپ کو بخوبی آتا ہے، آپ نہ صرف طلبا کے تعلیمی اور دوسرے مسائل سنتے ہیں بلکہ انھیں حل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرتے ہیں اور یہی ایک کامیاب مدرس کے اوصاف ہیں۔ مشہور قلم کار علیم صبا نویدی نے کہا کہ قاضی صاحب ایک جہاں دیدہ انسان ہیں، جب بھی کسی تحقیقی معاملے میں آپ سے تعاون طلب کیا گیا تو کبھی آپ نے مایوس نہیں کیا۔

سابق صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی پروفیسر قاسم علی خان نے قاضی صاحب کی شخصیت اور فن پر عمدہ مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی شخصیت کے تین اہم پہلو ہیں جو کہ دراصل آپ کے ترجمان ہیں۔ پروفیسر قاضی ضیاء اللہ (ریجنل ڈائرکٹر بنگلور، مانو) نے قاضی صاحب کی تدریسی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ استاد بچوں کا روحانی باپ ہوتا ہے، قاضی صاحب کا ہر شاگرد آپ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتا ہے۔ مشہور صحافی وکالم نویس جناب اعظم شاہد نے قاضی صاحب کی روزنامہ مسلمان کی چار سالہ صحافتی خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آپ زمانہ شناس، حالات کے نباض، معاشرہ وسماج کے تئیں زندہ اور دھڑکتا دل اور ان کے ذہن ودماغ کو دستک دینے والا قلم رکھتے تھے، آپ کے موضوعات میں علاقائی سیاست، ملکی حالت اور عالم اسلام کی صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مفتی شیخ کلیم اللہ عمری مدنی، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، ڈاکٹر محمد فارق باشا عمری، ڈاکٹر ایم سعید الدین، ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ، ڈاکٹر نور اللہ، ڈاکٹر امین اللہ، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری، ڈاکٹر غیاث احمد کے علاوہ دوسرے پروفیسرز، شاگرد، عقیدت مندوں نے بھی اپنے تاثرات اور مقالات پیش کیے، قاضی صاحب کی دختر محترمہ سعدیہ نے انگریزی زبان میں قاضی صاحب کی عاجزی وانکساری اور ہمت افزائی کو مختلف واقعات کی روشنی میں پیش کیا۔

قبل ازیں ممبئی سے پروفیسر ڈاکٹر کلیم ضیا کا منظوم تہنیت نامہ، مولانا نذیر احمد عمری نے اپنی مسحور کن آواز میں اور جناب علیم صبا نویدی کی آزاد نظم ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری نے سنائی جس کو شرکا نے خوب سراہا۔ صاحب سمینار قاضی حبیب احمد نے کلیدی خطاب میں سی عبدالحکیم کالج کی انتظامیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کالج سے اپنے دیرینہ وابستگی کا تذکرہ کیا، آپ نے اپنے خطاب میں ریاست تمل ناڈو میں اردو کی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کے فروغ اور ترقی کے لیے لائحہ عمل بنانے اور کوشش کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ پروگرام کے روح رواں ڈاکٹر ایس محمد یاسر نے مقالہ نگاران کی خدمت میں حبیب اردو ایوارڈ پیش کیا اور یہ تیقن دلایا کہ بہت جلد مقالات کو کتابی شکل دی جائے گی، آپ ہی کے ہدیہ تشکر سے سمینار اختتام پذیر ہوا۔ سمینار میں اردو کے محبین کے علاوہ آپ کے تلامذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد شریک رہی۔

پریس ریلیز: محمد سیفی عمری، میل وشارم، 10 جولائی 2023

کیرالہ

ترجمہ نگاری پر تین روزہ تربیتی پروگرام

کالی کٹ: ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو دنیا میں موجودہ علوم وفنون کی نشر واشاعت، کرۂ ارض کے دور دراز خطوں میں مختلف زبانیں بولنے والے انسانوں کے جذبات واحساسات، ان کی تہذیب وثقافت، رہن سہن اور کھان پان کے طور طریقوں سے دوسروں کو متعارف کرانے نیز انسانی وراثت اور اقدار کی بقا وتحفظ میں کلیدی رول ادا کرتا ہے اور اس کا ضامن بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے استاذ پروفیسر محمد قطب الدین نے شعبۂ عربی کالیکٹ یونیورسٹی، کیرالہ کے زیر اہتمام ترجمہ نگاری سے متعلق تین روزہ تربیتی پروگرام کے افتتاحی جلسے میں اپنے کلیدی خطبے میں کیا۔ پروگرام کے آغاز میں پروگرام کوآرڈینیٹر ڈاکٹر علی نوفل نے اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ صدر شعبہ اور ڈین اسکول آف لینگویجز، کالیکٹ یونیورسٹی پروفیسر محی الدین کٹی نے مہمان خصوصی پروفیسر محمد قطب الدین و دیگر شرکا کا پرتپاک استقبال کیا۔ پروفیسر محمد قطب الدین نے اپنے کلیدی خطبے میں فن ترجمہ نگاری، اس کے اصول ومبادیات، مسائل وامکانات، اہمیت وضرورت اور اس میدان میں نت نئے وسائل کے استعمال، اس کے فوائد اور نقصانات پر سیر حاصل بحث کی۔ اس پروگرام میں شعبۂ عربی کالیکٹ کے طلبہ واساتذہ ڈاکٹر ای عبدالمجید اور ڈاکٹر منیر ہدوی کے علاوہ کیرلا کے دیگر کالجز کے اساتذہ وطلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اخیر میں شعبۂ عربی کالیکٹ کے استاذ اور کالیکٹ یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار پروفیسر ٹی اے، عبدالمجید نے تمام شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 9 جولائی 2023

اعزاز و اکرام

اردو اکادمی دہلی کی سالانہ تفویض ایوارڈ تقریب

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام سالانہ تفویض

ایوارڈ تقریب میں سال 2019-20 اور 2021-22 کے لیے زبان و ادب کے مختلف گوشوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے مصنفین کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اردو اکادمی دہلی کی سالانہ ایوارڈ تقریب میں سال 2019-20 کے لیے جیلانی بانو کو 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' پیش کیا گیا جب کہ 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' سے پروفیسر شریف حسین قاسمی کو نوازا گیا۔ انھیں بطور اعزاز دو لاکھ اکیاون ہزار روپے نقد، مومنٹو، سرٹیفکٹ اور شال پیش کی گئی۔ وہیں ایوارڈ برائے تخلیقی نثر بلقیس ظفیر الحسن، ایوارڈ برائے شاعری شکیل جمالی، ایوارڈ برائے صحافت وسیم الحق، ایوارڈ برائے بچوں کا ادب ڈاکٹر عادل حیات اور ایوارڈ برائے بہترین قوال (فنونِ لطیفہ)، غلام صابر نظامی اور غلام وارث نظامی کو دیا گیا۔ گلزار 'کل ہند ایوارڈ برائے اردو زبان وادب وتہذیب' سے نوازے گئے۔

دیگر ایوارڈ یافتگان کی خدمت میں ایک لاکھ ہزار روپے نقد، مومنٹو، سرٹیفکٹ اور شال پیش کی گئی۔ 2021-22 کے ایوارڈ یافتگان میں پروفیسر عبدالستار دلوی کو 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' اور پروفیسر شمس الحق عثمانی کو 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ ان کی خدمت میں دو لاکھ اکیاون ہزار روپے نقد، مومنٹو، سرٹیفکٹ اور شال پیش کی گئی۔ ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ایوارڈ برائے تخلیقی نثر ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، ایوارڈ برائے شاعری اقبال اشہر، ایوارڈ برائے صحافت اسد رضا، ایوارڈ برائے ترجمہ پروفیسر اسد الدین، ایوارڈ برائے اردو ڈراما پروفیسر محمد کاظم اور 'کل ہند ایوارڈ برائے فروغ اردو زبان وادب وتہذیب' سے پروفیسر وسیم بریلوی کو نوازا گیا۔ ایوارڈ تقریب کی نظامت کے فرائض اطہر سعید اور ریشما فاروقی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر معززین شہر کے علاوہ اردو زبان و ادب سے وابستہ اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 جولائی 2023

انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم انعامات

نئی دھلی: اردو کی بے لوث خدمات کو تسلیم کرنا ان کے اعتراف میں ایوارڈ دینا ایک مستحسن قدم ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، آج جن شعرا کو بعد از مرگ ایوارڈ دیے جارہے ہیں وہ یقیناً ان کے مستحق ہیں اور انھوں نے شاعری کے ذریعے اردو کی بے لوث خدمت کی ہے، ان خیالات کا اظہار انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام انجمن کے بانی آنجہانی گلزار دہلوی کے 97 ویں یوم ولادت کے موقعے پر تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر نئی دہلی میں منعقد جلسہ تقسیم انعامات میں مقررین نے کیا، آج جن شعرا کو بعد از مرگ 'گلزار اردو ایوارڈ' دیے گئے ان میں شہباز ندیم ضیائی، رؤف رضا اور شمس رمزی شامل ہیں۔ انجمن کے جنرل سکریٹری رؤف رامش نے انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہر سال اردو کی بے لوث خدمات کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ انجمن کے سرپرست، سابق ممبر پارلیمنٹ اور سفارت کار م افضل نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہر اردو والے کا فرض ہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے کوشش کرے گا کیونکہ اردو کا دائرہ محدود ہوتا جارہا ہے، انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے خود اردو والوں کو کوشش کرنی چاہیے صرف سرکار کو ذمے دار قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ م افضل نے مزید کہا کہ ایسے ادیبوں، شاعروں اور اردو کی دیگر صنف میں کام کرنے والے بے لوث افراد جن کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا، انھیں ایوارڈ سے نوازے جانے کے فیصلے کی ستائش کی جانی چاہیے۔ تقریب کے مہمان خصوصی دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر صادق نے آنجہانی گلزار دہلوی کی شخصیت کو طلسماتی قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ایوارڈ کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا اور وہ بھی اس سلسلے کو مستقل تعاون کے لیے تیار ہیں، اس موقعے پر تقریب کے ایک اور مہمان خصوصی عظیم اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی خدمات کا اعتراف کرنا ہم سب کی ذمے داری اور وقت کی ضرورت بھی ہے۔ تقریب کے صدر اور تسمیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کا یہ قدم قابل تحسین ہے اور اس سے یقیناً اردو کے میدان میں خدمات انجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ بعد ازاں محفل شعر و سخن بھی منعقد کی گئی جس کی نظامت کے فرائض انجمن کے جنرل سکریٹری رؤف رامش نے انجام دیے، جن شعرا نے کلام پیش کیا ان میں متین امروہوی، منیر ہمدم، جاوید مشیری، عادل رشید، حامد علی اختر، سرور دہلوی، وارث وارثی، معین قریشی، سلیم امروہوی، عبدالرحمٰن منصور، محبوب امین، تسلیم دانش، شاکر دہلوی، ثمر بچھرایونی، طاہر سعود کرت پوری، احسن فیروز آبادی، تابش خیر آبادی، شاذ جہانی، اسلم جاوید وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی 9 جولائی 2023

پروفیسر محمد کاظم

نئی دھلی: کینیڈا میں اردو آرٹ اور ڈراما کے لیے مشہور و معروف ادارہ 'رنگ منچ' نے سالانہ ایوارڈ تقریب کا انعقاد کیا جس میں ہندوستان سے تشریف لائے اردو کے مشہور و معروف ادیب پروفیسر محمد کاظم کو سلور جبلی تقریب کے موقعے پر 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2023' سے نوازا گیا۔

واضح ہو کہ پروفیسر محمد کاظم کا خاص میدان ڈراما اور اس کی تنقید ہے۔ تقریباً بیس ڈرامے ان کی ہدایت میں پیش کیے جاچکے ہیں۔ یہ تمام ڈرامے اردو اکادمی دہلی نے آٹھ سال مسلسل اپنے اردو ڈراما فیسٹیول میں شامل کیا اور پانچ سال مسلسل ساہتیہ کلا پریشد، دہلی سرکار نے بہترین ہدایت کار اور بہترین ڈراما نگار کے خطاب سے نوازا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے متعدد ڈراما فیسٹیول میں بطور ہدایت کار شرکت کرتے

رہے ہیں۔ روزنامہ 'قومی آواز' میں پانچ سال تک ڈرامے پر ہر ہفتہ مسلسل کالم لکھتے رہے ہیں۔ ہندی اور انگریزی کے مختلف ڈراموں کو اردو میں اور اردو کے مشہور ڈراموں کو ہندی میں ترجمہ کرکے شائع کروا چکے ہیں۔ ڈرامے کی دنیا کے شہرت یافتہ، بہروپ آرٹس گروپ کے فاؤنڈر اعزازی جنرل سکریٹری ہیں۔ اس تقریب کا اہتمام ڈراما نویس، مشہور ادیب جناب جاوید دانش نے کیا تھا۔ اس تقریب میں میئر آف سٹی مسٹر کیون ایشے نے بھی شرکت کی اور پروفیسر محمد کاظم کی خدمت میں تعریفی سند کے ساتھ مومنٹو پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 جولائی 2023

ڈاکٹر مسیح الدین خان

لکھنؤ: ہیلپ یو ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب پدم شری انور جلالپوری کے 76 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر نشاط گنج واقع آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی میں منعقد ایک تقریب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کے ڈاکٹر مسیح الدین خان کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس اہم پروگرام میں بطور مہمان خصوصی اترپردیش کے سابق نائب وزیراعلیٰ پروفیسر دنیش شرما شریک ہوئے جن کے بدست یہ ایوارڈ انھیں دیا گیا۔ ڈاکٹر مسیح الدین خان کو یہ ایوارڈ مجموعی طور پر ان کی ادبی، سماجی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ ہیلپ یو ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کی جانب سے منعقد اس پروگرام میں ساز غزل، محفل داستان گوئی اور سیمینار کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 جولائی 2023

رسم اجرا

اعظم حسین اعظم کا رسالہ ادب

نئی دہلی: اردو صحافت میں دبستان لکھنؤ کا کردار درخشاں ہے۔ سید اعظم حسین اعظم نے بطور مدیر لکھنوی صحافت کو نئی جہات عطا کی تھیں۔ ان کے رسالے پر آج تحقیقی کام ہونا خوش آئند بات ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع نے جاوید اختر علی آبادی کی تحقیقی کتاب 'اعظم حسین اعظم کا رسالہ ادب' کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس تاریخی رسالے پر تحقیقی کام ہونا نہایت خوش آئند ہے۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے تسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے شرکت کی، آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے تعارفی کلمات پیش کیا۔ وہیں اعظم حسین اعظم کی صاحبزادی اور معروف افسانہ نگار سطوت زہرہ، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر شعائر اللہ خان اور ڈاکٹر الف ناظم نے کتاب پر اظہار خیال کیا۔ نظامت کے فرائض شاہنواز فیاض نے ادا کیے جب کہ اعظم حسین اعظم کے بیٹے اعظم عباس شکیل نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ اردو زبان و ادب کے معماروں کو یاد رکھنا اور ان کی فراموش کردہ کاوشوں کی حفاظت اور ترویج قابل قدر ہے۔ اس کے لیے جاوید اختر علی آبادی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آصف اعظمی نے کہا کہ بیسویں صدی کا نصف اول اردو صحافت کا روشن ترین دور ہے۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو صحافت کے طلبہ کے لیے یہ کتاب بہت مفید و معاون ہے۔ ڈاکٹر شعائر اللہ خان نے کہا کہ اعظم حسین اعظم کے اس رسالے کے قلم کاروں میں مسعود حسین رضوی ادیب، آغا حشر، امیر احمد علوی اور مرزا محمد عسکری جیسے مشاہیر اردو شامل تھے، ایسے رسالے پر تحقیقی کام گویا اس دور کی تاریخ سمیٹنا ہے۔ ڈاکٹر الف ناظم نے کہا کہ ایک فراموش شدہ رسالے کی تحقیق بہت مشکل کام ہے، اس کے لیے ڈاکٹر جاوید اختر علی آبادی کو مبارکباد دینا چاہیے۔ صاحب کتاب جاوید اختر علی آبادی نے کہا کہ رسالہ 'ادب' نہ صرف تحقیق و تنقید اور زبان و ادب کا ایک نادر مخزن تھا، بلکہ اپنے عہد کے ادب، تہذیب، سیاست اور معاشرت کا ترجمان اور عصری تقاضوں کا آئینہ دار تھا، لیکن اس میں مدفون خزائن سے اردو ادب کی تاریخ کوری ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جولائی 2023

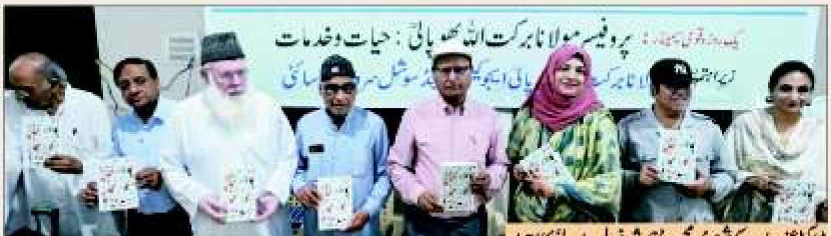

ڈاکٹر عنبر عابد کے شعری مجموعہ 'ہم شہر غزل والے' کا اجرا

ہم شہر غزل والے

بھوپال: برکت اللہ بھوپالی ایجوکیشن اینڈ سوشل سروس سوسائٹی کے زیر اہتمام بھوپال گاندھی نگر میں ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ ادبی تقریب میں ممتاز دانشوروں نے شرکت کی اور بھوپال کی ممتاز ادیبہ و شاعرہ ڈاکٹر عنبر عابد کی شاعری و فکری جہات پر مفصل انداز میں خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عنبر عابد کے شعری مجموعہ 'ہم شہر غزل والے' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ادبی تقریب میں سب سے پہلے سوسائٹی کے حاجی محمد ہارون نے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ بات ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے کہ شہر غزل بھوپال میں صرف شاعری ہی نہیں بلکہ اردو کی دیگر اصناف پر بھی بھرپور انداز میں طبع آزمائی کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر عنبر عابد نے اپنی شاعری میں صرف عوامی مسائل کی ہی ترجمانی نہیں کی ہے بلکہ وہ بھوپالی تہذیب کی بھی علمبردار ہیں۔ وہیں ممتاز ادیب پروفیسر خالد محمود نے ڈاکٹر عنبر عابدی کی فکری جہات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں بھوپال کی تہذیب و ثقافت کی جہاں ترجمانی ہوتی ہے وہیں نسائی لہجہ بھی بھرپور انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر عنبر عابد نے مولانا برکت اللہ بھوپالی ایجوکیشن سوشل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے صدر حاجی محمد ہارون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام میں شامل تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر عنبر عابد نے بتایا کہ شاعری کا فن انھیں وراثت میں ملا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جولائی 2023

مسافرانِ ادب

نئی دہلی: ادبی و ثقافتی تنظیم انجمن فروغ اردو (رجسٹرڈ) دہلی کے زیر اہتمام تسمیہ آڈیٹوریم میں معروف شاعر درد دہلوی کی تازہ تصنیف 'مسافرانِ ادب' کی رونمائی کے موقعے پر ایک کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق اور نظامت درد دہلوی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے عبدالرحمٰن ادیب اور دیگر مہمانان میں رئیس مظفرنگری، ڈاکٹر اے ایچ خان، محمد ارشاد، حاجی عبدالستار اور معروف گلوکار غلام صابر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر بارہمولا، کشمیر کے سابق ڈی ایس پی رشید کانپوری اور فارسی کے سابق مدرس محسن عظیم کی خدمت میں 'سید رشید احمد میموریل ایوارڈ 2023 برائے خدمت ادب' پیش کیا گیا۔ مسافران ادب کے بارے میں درد دہلوی نے کہا کہ اس کتاب میں 103 شاعروں سے لیا

گیا انٹرویو اور ان کی غزلیں شامل ہیں، نیز گزشتہ چھ حصوں میں شامل شاعروں کے نام موبائل نمبر کے ساتھ درج کردیے گئے ہیں۔ ایوارڈ یافتگان کے بارے میں کہا کہ رشید کانپوری نے تقریباً بیس اردو کتب کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ محسن عظیم فارسی زبان کے ٹیچر رہنے کے باوجود اردو زبان سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی مرتب کردہ کتاب 'عظیم سیمابی عروض' منظر عام پر آئی ہے۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 جولائی 2023

تاریخ مراد آباد

مراد آباد :مراد آباد کی عظمت و شہرت صرف پیتل کی صنعت سے نہیں ہے بلکہ زبان و ادب، تہذیب وتمدن کے مرکز کے طور پر بھی اس شہر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ معصوم مرادآبادی کی کتاب 'تاریخ مراد آباد' تہذیب وثقافت اور زبان و ادب کے حوالے سے مراد آباد پر

دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے ممتاز صحافی وادیب معصوم مرادآبادی کی تازہ ترین کتاب 'تاریخ مراد آباد' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''معصوم مرادآبادی نے یوں تو اس سے پہلے بھی بہت گراں قدر علمی کام کیے ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی جنم بھومی سے ان کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت اور تاریخی کارنامہ ہے۔''

مرادآباد کے تاریخی ہیوٹ مسلم انٹر کالج میں تقریب رونمائی کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے کہا کہ ''معصوم مرادآبادی نے 'تاریخ مراد آباد' مرتب کرکے فرض کفایہ ادا کیا ہے، کیونکہ ابھی تک کسی نے مراد آباد کی تاریخ کو باقاعدہ مرتب ومدوّن کرکے کتابی صورت میں پیش نہیں کیا ہے۔''

صاحب کتاب معصوم مرادآبادی نے اس موقعے پر کہا کہ ''یہ کتاب میری چالیس سالہ محنت وکاوش کا نچوڑ ہے۔ یہ دراصل اس روشن تاریخ کو محفوظ کرنے کی ادنیٰ کوشش ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری ڈاکٹر مولانا یاسین عثمانی نے کہا کہ ''یہ کتاب معصوم مرادآبادی کا ایسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے انھیں روہیل کھنڈ کے مؤرخین میں نمایاں جگہ ملے گی۔''

ممتاز شاعر منصور عثمانی نے اپنے شہر کی تاریخ کو مدون اور محفوظ کرنے کے لیے معصوم مرادآبادی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ معصوم مرادآبادی جو کام کرتے ہیں، اس میں سلیقہ اور محنت شاقہ کو دخل ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر محمد آصف حسین نے کہا کہ ''معصوم مرادآبادی نے اپنی کتاب میں تاریخ کے مختلف گوشوں کو جس سلیقے اور عمدگی کے ساتھ یکجا کیا ہے، اس سے مستقبل کے محقق کو آسانی فراہم ہوگی اور اس سے مرادآباد کی تاریخ پر تحقیق کی نئی راہیں ہموار ہوں گی'' اس موقع پر انجمن ترقی اردو اترپردیش کے صدر ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے 'تاریخ مراد آباد' کو روہیل کھنڈ کے باذوق لوگوں کے لیے ایک تحفہ قرار دیا۔

تقریب اجرا کی نظامت سینئر صحافی سید محمد ہاشم نے نہایت خوبصورتی سے انجام دی۔ تقریب کا اہتمام مرادآباد ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے کیا تھا۔ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر راحت زماں خاں' استقبالیہ کمیٹی کے صدر الحاج مرزا ارشد بیگ اور سکریٹری زاہد پرویز صدیقی نے مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس باوقار تقریب میں کثیر تعداد میں دہلی، مرادآباد، امروہہ اور رامپور کی نمائندہ شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جولائی 2023

لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب

نئی دھلی: اردو کی معروف افسانہ نگار نعیمہ جعفری پاشا کی کتاب 'لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب، تہذیبی فرہنگ' کی رسم اجرا انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے کانفرنس ہال میں عمل میں آئی۔ تقریب اجرا میں مشہور فلم اداکارہ شرمیلا ٹیگور، سابق مرکزی وزیر اور راجیہ سبھا کے رکن کپل سبل اور پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض نظام الدین محمد پاشا نے انجام دیے۔ نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ یہ کتاب ایک تہذیبی فرہنگ ہے جو اس کے نام سے ظاہر ہے، ہماری زبان اردو نہ صرف ایک بولنے کا ذریعہ ہے بلکہ ایک مکمل تہذیب بھی ہے۔ ہر لفظ، ہر اصطلاح، ہر محاورہ اور ہر ضرب المثل کے پیچھے رنگا رنگ گنگا جمنی تہذیب چھپی ہوئی ہے جو ہمیں دوسری کسی زبان میں ملنی مشکل ہے۔ نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ یہ کتاب 1057 صفحات پر مشتمل ہے جس کو 24 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کپل سبل نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی زبان ہے۔ یہ کسی مخصوص ریاست کی زبان نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو بھی برقرار رہتی۔ میرے والد پاکستان کے لاہور میں پریکٹس کرتے تھے۔ وہاں ان کے دوست پاکستانی مسلم بھائی تھے، مقدمہ، بحثیں اور ایف آئی آر سب اردو میں ہوتی تھیں، ان کی اردو بھی بہت اچھی تھی۔ شرمیلا ٹیگور نے کہا کہ میری پیدائش ایک بنگالی خاندان میں ہوئی، میری بنیادی تعلیم بھی بنگالی زبان میں ہوئی ہے، مجھے اردو زبان نہیں آتی، لیکن میں نے اردو کے بڑے رائٹرس اور نغمہ نویسوں کے ساتھ کام کیا ہے، میرے سسرال میں اردو تہذیب تھی، اس حوالے سے بڑے خوشگوار اور دلچسپ واقعات میں نے تجربہ کیے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ مجھے اردو زبان نہیں آتی، لیکن مجھے یہاں بلایا گیا اور محبت سے نوازا گیا۔ میں اس کے لیے نعیمہ جعفری اور تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی ذمے داری سب کی ہے، سب لوگ اپنے حصے کی ذمے داری اگر ادا کریں تو اردو زبان کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا جاسکتا ہے، میں اس کتاب کی مصنفہ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ طلبا اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔ اختر الواسع نے کہا کہ نعیمہ جعفری پاشا نے جو کام کیا ہے وہ غیر معمولی ہے، انھوں نے جو کتاب لکھی ہے اتنی

ضخیم ہے کہ اٹھائے نہیں بنتی۔ انھوں نے مزید کہا کہ جہاں تک سوال اردو زبان کے زوال کا ہے، تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زوال زبانوں کا نہیں ہوتا بلکہ معاشروں کا ہوتا ہے اور اسی زوال کے نتیجے میں زبانیں پیچھے ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد، پروفیسر خواجہ شاہد، پروفیسر خالد محمود، سہیل انجم، حقانی القاسمی سمیت بڑی تعداد میں علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جولائی 2023

خالد محمود: شخصیت اور ادبی کارنامے

سرونج: انتساب پبلی کیشنز اور سد بھاؤنا منچ کی جانب سے سرونج میں سیفی سرونجی اور استوتی اگروال کی مرتب کردہ کتاب 'خالد محمود: شخصیت اور ادبی کارنامے' کی رسم رونمائی

پروفیسر اختر الواسع کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ آپ نے صدارت کے فرائض بھی انجام دیے اور کہا کہ اہل سرونج نے یہ جلسہ منعقد کر کے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ قدر بردہ بعدِ مردہ۔ کیونکہ اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کی زندگی میں ہی قدر کی جانی چاہیے جس کی مثال خالد محمود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرونج کی شہرت و مقبولیت میں سہ ماہی 'انتساب' کا بڑا رول رہا ہے۔ سرونج گنگا جمنی تہذیب کا سنگم ہے جہاں سیفی سرونجی اور اتل اگروال رہتے ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے جذباتی ہو کر کہا کہ میں اس شاندار تقریب کے لیے انتساب پبلی کیشنز کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں تو اردو پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا، لوگ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے پیسے خرچ کرتے ہیں، ہمیں اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اُلٹے پیسے ملے۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ خالد محمود ایک زندہ لیجنڈ ہیں۔ میں سرونج کی سرزمین کو سلام کرتا ہوں جہاں خالد صاحب پیدا ہوئے۔ میں سیفی سرونجی کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ استوتی اگروال جیسی نئی نسل تیار کر رہے ہیں۔ مفتی رحیم اللہ نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے گھروں میں اولادوں کا نام خالد محمود رکھیں۔ مہمانِ ذی وقار پروفیسر طاہرہ عباسی نے کہا کہ خالد محمود کی زندگی میں پروفیسر تسنیم فاطمہ کا بڑا رول ہے، اقبال مسعود نے بھی اس بات کی تائید کی اور مزید کہا کہ اس درخت کو تسنیم نے ہی ہر طوفان سے بچایا ہے۔ سیفی سرونجی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ خالد صاحب ہر دلعزیز شخصیت ہیں اور میں نے بھی اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ استوتی اگروال نے مہمانوں کا تعارف کروا کر تقریب کی شروعات کی اور خالد محمود کو اردو زبان کا حاتم طائی کہہ کر مخاطب کیا۔ نظامت کے فرائض بدر واسطی نے انجام دیے، گلدستے اور شالیں عبدالصبور خاں، راجیو جین اور فرحان خاں نے پیش کیں۔ پروفیسر حسان، ظفر صہبائی، ضیا فاروقی، مرضیہ عارف، حسام الدین فاروقی، پروفیسر ارجمند بانو، رضوان الدین فاروقی، شان فخری، غازی ولی، ظفر سرونجی اور عروج احمد نے بھی اظہار خیال کیا۔ شاعروں میں اعظم، نفیسہ سلطانہ، سہیل نسیم، سلیمان آذر، اسعد ہاشمی نے خالد محمود پر نظمیں پڑھیں۔ ان کے علاوہ نظر محمود، قمر علی، سراج احمد، عظیم اثر اور پروین صبا نے بھی حصہ لیا۔

پریس ریلیز: استوتی اگروال، سرونج، 9 جولائی 2023

منتخب مضامین

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سوشل سائنس فیکلٹی کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر سیدہ نرجس فاطمہ کی کتاب 'منتخب مضامین' کی رسم اجرا عمل میں آئی جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے متعلق اساتذہ نے حصہ لیا اور کتاب کے مشتملات اور دیگر اوصاف پر تبادلہ خیال کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ کے بانی ڈائرکٹر پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے ڈاکٹر نرجس فاطمہ کو کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں شامل بیشتر مضامین اردو ادب کی اہم صنف جمالیاتی تنقید اور فلسفیانہ مطالعہ پر مبنی ہیں جو ڈاکٹر نرجس فاطمہ کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کے متنوع موضوعات پر جمالیاتی عناصر کو نشان زد کرتی ہوئی ڈاکٹر فاطمہ کی تحریریں دراصل ادبی مطالعات میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر قاضی جمال حسین نے کتاب میں شامل مضامین پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب سے متعلق موضوعات کا جمالیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ اپنے آپ میں ایک مشکل کام ہے کیونکہ لوگ عموماً جمالیاتی اور تاثراتی مطالعہ میں فرق نہیں کر پاتے جب کہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ مہمان ذی وقار، شعبہ اردو کے پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ ڈاکٹر نرجس فاطمہ کی کتاب نئے افکار سے مملو مضامین پر مشتمل فلسفیانہ اور جمالیاتی نظریات کی عکاس ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر فاطمہ کا تعلق ایک نہایت ہی علم نواز خانوادے سے ہے اور انھوں نے اسی علمی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے 2009 میں جمالیاتی تنقید کے موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کیا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 18 جولائی 2023

جنتیں مشتاق ہیں

لکھنؤ: گزشتہ روز ادارہ علم و ادب کے صدر ڈاکٹر شیدا اعظمی کا مجموعہ سلام 'جنتیں مشتاق ہیں' کا اجرا بدست طورج زیدی، چیئرمین فخرالدین علی احمد کمیٹی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی سابق ایڈیٹر نیا دور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نظامت اتا اعظمی نے کی، مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر ثروت تقی جوائنٹ سکریٹری ادارۂ ہذا اور اظہار تشکر ڈاکٹر شیدا اعظمی کے ذریعے ہوا۔ مذکورہ پروگرام علی رضا باقر صاحب کے مکان کے احاطہ مرزا علی خاں میں منعقد ہوا۔ خطبہ صدارت طورج زیدی نے دیا اور مولانا حیدر عباس، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور قمر احسن صاحب نے تقریر فرمائی۔ جرار اکبرآبادی اور ڈاکٹر محمود محمد آبادی نے سلام پڑھا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 جولائی 2023

تتلی پھول سائرہ

نئی دہلی: سوچنا بھون دہلی میں آجکل کے مدیر حسن ضیا کے ہاتھوں 'تتلی پھول سائرہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت ممتاز افسانہ نگار خورشید حیات نے کی۔ نرگس سلطانہ مہمان خصوصی رہیں۔ اس تقریب کے موقعے پر حسن ضیا نے کہا کہ سائرہ عظیم ایک معتبر و توانا آواز ہیں۔ ان کے لہجے کی تازگی اور چاشنی ان کے قاری کو متاثر کرتی ہے۔ وہ نہایت سادگی اور پرکاری کے ساتھ اشعار کہتی ہیں۔ خورشید حیات نے سائرہ عظیم کی شاعری پر بات کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اردو ادب کو معتبر لہجہ دیا ہے۔ انھوں نے بہت جلد اردو ادب میں اپنا مقام بنایا ہے۔ نرگس سلطانہ نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ سائرہ عظیم کی شاعری میں دل کشی و جاذبیت ہے۔ اردو کے رسائل و جرائد میں وہ برابر چھپتی رہتی ہیں۔ اردو

غزل کے ممتاز شاعر و ناقد عمران عظیم نے محترمہ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شاعری پر سائرہ عظیم کو زبردست قدرت ہے۔ وہ عصر حاضر کے تمام مسائل پر اپنی نظر رکھتی ہیں اور ان تمام موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بناتی ہیں۔ معروف شاعر ساحر داؤدنگری نے کہا کہ سائرہ عظیم نے اردو دنیا میں اپنا مقام ہی نہیں بنایا بلکہ شاعری کی نئی پرتیں کھولی ہیں۔ ان کے شعری جذبات و احساسات میں ان کے قاری کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کی شعری قدرت کو دیکھتے ہوئے میں ان کے روشن مستقبل کے لیے دعاگو ہوں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جولائی 2023

این امریکن میو

پانی پت / نوح: دخترِ میوات نے ملک اور اپنے گاؤں میوات کا نام امریکہ میں روشن کرکے ایک مثال قائم کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم نائی ننگلہ میوات کی دختر انیسہ رحیم کی تصنیف کردہ کتاب 'این امریکن میو' کا امریکہ میں اجرا ہوا ہے۔ مصنفہ انیسہ رحیم میو کے ذریعے ڈاکٹر عبدالرحیم کی حیات و خدمات پر لکھی گئی (An American Meo) ایک اہم کتاب ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالرحیم نائی ننگلہ بلاک نگینہ مقیم حال امریکہ فلوریڈا میں امراض قلب کے ماہر ڈاکٹر ہیں اور 1975 سے امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ مصنفہ انیسہ رحیم میو اپنی کتاب میں نقل کرتی ہیں کہ میں نے اپنی کتاب کے ذریعے میوات میں آباد اپنے آباواجداد کی تاریخ اور میواتی ثقافت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی تصنیف و تالیف میں کئی سال لگ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کا مرکزی محور نثر، شاعری اور خاندانی تاریخ، یادداشت، مادر وطن کی حقیقی اور تمثیلی تصاویر کا ایک ملا جلا سنگم ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس سے ایم بی بی ایس کرنے والے پہلے میو ایم بی بی ایس اور ایم ایس سرجن ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر رحیم اس ادارہ سے ایم ڈی کرنے امریکہ گئے تھے کہ ڈگری مکمل کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آکر اپنی خدمات انجام دیں گے، لیکن جذبۂ انسانیت نے انھیں امریکہ میں رہنے پر مجبور کردیا۔ چند سال پہلے عبدالرحیم کے بیٹے شکیب رحیم میو نے دنیا کی ٹاپ یونیورسٹی ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جولائی 2023

ٹھہرے ہوئے لمحے

نئی دھلی: ڈاکٹر صغیر اشرف کی کتاب 'ٹھہرے ہوئے لمحے' کی محفل رونمائی 23 جولائی بروز سنیچر، ہوٹل ریور ویو، ابوالفضل انکلیو میں آواز چیریٹیبل ٹرسٹ رجسٹرڈ اور مظہر فاؤنڈیشن رجسٹرڈ، دہلی کے بینر تلے ہوا جس کی صدارت پروفیسر ندیم احمد،

ڈاکٹر ابرار رحمانی اور ڈاکٹر ذکی طارق صاحبان نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر صغیر اشرف اور مہمان ذی وقار ڈاکٹر محمد خالد شریک ہوئے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں عشرت ظہیر، حقانی القاسمی اور عبدالباری صدیقی خاص ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد عارف نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر محمد زاہد احسن فلاحی نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔

عشرت ظہیر نے مقالہ پیش کرتے ہوئے غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ صغیر اشرف نے اردو کے ساتھ ہندی میں کام کرکے اردو اور ہندی سے دلی محبت کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ اپنے اصل ہندوستانی ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ حقانی القاسمی نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب ابھی تک حلقہ دیوار و در سے باہر نہیں نکلے ہیں، ہماری زبان و تہذیب جب تک Intra Muros میں رہے گی ہماری زبان اور تہذیب کی شناخت کا حلقہ تنگ سے تنگ ہوتا جائے گا۔ ہمارے غالب، میر اور مومن میں ہی محصور نہیں رہنا چاہیے، کالی داس، شیکسپیئر، کیٹس، نطشے، ناظم حکمت، پابلو نرودا، سعدی، حافظ اور رومی سے بھی رابطہ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کی خاندانی قربت اور Perceptional distance پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پوری دنیا کی روحانی زبان ایک ہے۔ ہماری سانسوں اور دھڑکنوں کی زبان بھی ایک ہے۔ زبان صرف اپنے جذبات و احساسات کا صرف ایک ذریعہ ہے، مذہب اور عقیدے سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ ہمیں دنیا کے خوبصورت لفظوں اور کومل شبدوں کو اپنے اظہار کا حصہ بنانا چاہیے۔ ہمیں ان لفظوں کو بھی زندہ رکھنا ہوگا جن سے ہمیں زندگی ملتی ہے۔ انھوں نے صغیر اشرف کی ہندی میں چھپی کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں اتراکھنڈ کے ادبی اور ثقافتی حوالے سے جو تحریریں ہیں وہ بیش قیمت ہیں۔ عبدالباری قاسمی نے صغیر اشرف کی کتاب کے مشمولات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس میں ہندی حلقے کو اردو ادیبوں سے متعارف کرانے کی ایک اچھی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے ہمارا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوگا اور ہندی والے بھی ہماری تخلیقی اور ادبی ثروت سے آگاہ ہوں گے۔

مجلس صدارت سے ڈاکٹر ذکی طارق نے کہا کہ صغیر اشرف بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں، یہ کتاب بے حد عمدہ اور معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کہا کہ صغیر اشرف کی یہ کتاب بھی خوب تر ہے، جس کے لیے میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد خالد نے کہا کہ صغیر اشرف صاحب کی شخصیت متنوع اور کثیر الجہات ہے۔ ان کی یہ کتاب بیحد معلوماتی اور کارآمد ہے۔ پروفیسر ندیم احمد نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صغیر اشرف کی ذات اور ان کی تخلیق میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ ان کی ذات کتابی ذات ہے۔ انھوں نے کتاب میں جو کچھ بھی لکھا ہے میں وہ سب کچھ ان کی شخصیت میں پاتا ہوں۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید حسن نے بخوبی نبھائے اور ڈاکٹر خان محمد رضوان نے اظہار تشکر کیا۔

پریس ریلیز: خان محمد رضوان، دہلی، 10 اگست 2023

وفیات

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

نئی دھلی: پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا 12 اگست کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 81 برس تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ تین درجن سے زائد اہم کتابوں کے مصنف پروفیسر الطاف احمد اعظمی 2 جولائی 1942 کو اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم

اور عربی زبان کی تعلیم مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ سے حاصل کی تھی۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے طب یونانی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ جامعہ ہمدرد میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اور سوشل سائنس کے ڈین بھی رہے۔ جامعہ ہمدرد سے شائع ہونے والے جرنل کے بھی ایڈیٹر رہے۔ وہ انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی، نئی دہلی کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن بھی رہے۔ پروفیسر الطاف اعظمی کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو پر یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ تحریر و تقریر دونوں پر ملکہ رکھتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن حکیم کی تفسیر 'میزان القرآن' ہے جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ انھیں شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ ان کے تین شعری مجموعے 'فغان نیم شب'، 'زنجیر غزل' اور 'چراغ شب گزیدہ' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ انھوں نے 'تفہیم سرسید' اور 'تصانیف سرسید' بھی تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ 'تصانیف شبلی پر ایک نظر'، 'شبلی بحیثیت ادیب و نقاد' بھی ترتیب دیں۔ 'طب یونانی اور اردو زبان' کے موضوع پر بھی ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے تمام عمر تصنیف و تالیف کے کاموں میں بسر کی۔ وہ انتہائی خوش اخلاق اور کم گو طبیعت کے مالک تھے۔ علامہ اقبال پر ان کی کتابوں میں 'اقبال کے بنیادی افکار'، 'اقبال اور وحدۃ الوجود'، 'خطبات اقبال: ایک مطالعہ' قابل ذکر ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز عشا بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی، جس میں بڑی تعداد میں سوگواروں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اگست 2023

سید محمد فضل المتین چشتی

سنگاریڈی: سلسلۂ چشت اور تصوف و طریقت کی بزرگ شخصیت پیر طریقت حضرت صاحب زادہ میاں سید محمد فضل المتین معینی چشتی گدی نشین خواجہ غریب نواز اجمیر شریف نے مختصر سی علالت کے بعد 24 جولائی بروز سوموار کی ابتدائی ساعتوں میں

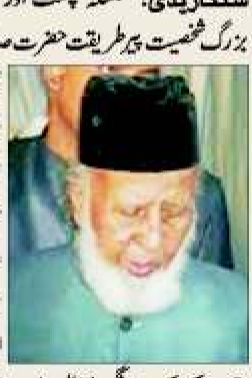

اجمیر کے ایک خانگی ہاسپٹل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت کی نماز جنازہ بعد نماز فجر شاہ جہانی مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین چار یار قبرستان احاطہ بارگاہ عالیہ حضور خواجہ غریب نواز اجمیر شریف میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں۔

سید فضل المتین اردو کے معروف شاعر اور ادیب تھے۔ علم و ادب انھیں ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے نثر و نظم میں خامہ فرسائی کی ہے۔ سہ ماہی 'نخلستان' جے پور اور ماہنامہ 'بارگاہ' اجمیر اور دیگر اخبارات و رسائل سے ان کی ادارتی وابستگی رہی ہے۔ 'کلام' کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی اودے پور سے 1973 میں شائع ہوا تھا۔ ان کی ایک کتاب 'موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر' حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا کلام ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔

سید فضل المتین کے سانحہ ارتحال کی خبر عام ہوتے ہی اجمیر شریف اور حیدرآباد میں غم کی لہر پھیل گئی۔ حیدرآباد کے علاوہ تلنگانہ، آندھرا پردیش، مغربی بنگال، کرناٹک، اترپردیش، دہلی اور برصغیر ہند کے مختلف مقامات پر آپ کے مریدین اور معتقدین کی کثیر تعداد موجود ہے۔ آپ کے سانحہ ارتحال پر حیدرآباد اور تلنگانہ کے مشائخین عظام نے تعزیت پیش کی اور کہا کہ حضرت کا انتقال اہل خانقاہ اور اہل علم کے لیے عظیم نقصان ہے۔ حضرت علم کا خزینہ تھے اور بہت ہی سادہ زندگی گزاری ہے۔

روزنامہ 'سماج سدھ' اور دیگر ذرائع سے

ظہیر الدین علی خان

حیدرآباد: روزنامہ سیاست کے مینیجنگ ایڈیٹر ظہیر الدین علی خان کا حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب 8 اگست کو انتقال ہو گیا۔ جناب ظہیر الدین علی خان ولد جناب محمد بشیر الدین خان مرحوم کی عمر 63 برس تھی۔ وہ جناب زاہد علی خان ایڈیٹر

روزنامہ سیاست کے خالہ زاد بھائی تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ فرزندان جناب اصغر علی خان اور جناب فخر علی خان شامل ہیں۔ جناب ظہیر الدین علی خان نے گزشتہ 30 برسوں میں سماجی، ملی اور علمی شعبہ جات میں غیر معمولی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی شناخت بنائی۔ انتقال کی اطلاع نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئی اور سماجی، سیاسی، مذہبی اور ادبی شعبہ جات سے وابستہ اہم شخصیتوں نے جناب زاہد علی خان اور جناب عامر علی خان سے رابطہ قائم کرتے ہوئے گہرے دکھ اور صدمے کا اظہار کیا۔ جناب ظہیر الدین علی خان نے جناب عابد علی خان مرحوم اور جناب زاہد علی خان کی سرپرستی و رہنمائی میں سماج بالخصوص ملت اسلامیہ کے غریب مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ سیاست ٹکنالوجیز لمیٹڈ کے ڈائرکٹر، عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ، ادبی ٹرسٹ اور سیاست ملت فنڈ کے سکریٹری تھے۔ عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کے ذریعے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اردو دانی اور زبان دانی کے امتحانات کے ذریعے 6 لاکھ سے زائد افراد کو اردو سے ہم آہنگ کیا۔ ملت کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مؤثر روزگار کی رہنمائی کے لیے کال سنٹر ٹریننگ کا اہتمام کیا جس میں نئے اور پرانے شہر کے ہزاروں نوجوانوں نے تربیت حاصل کرتے ہوئے ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ملازمت حاصل کی۔ مسلم نوجوانوں کی پولیس میں بھرتی کے لیے تربیت کے سلسلے میں جناب زاہد علی خان کی نگرانی میں جناب ظہیر الدین علی خان نے ماہرین کے ذریعے جسمانی تربیت اور تعلیمی قابلیت کو پروان چڑھانے کا کام انجام دیا۔ سرکاری ٹیچرس کی پوسٹوں پر تقرری کے لیے امتحانات کی تیاری کا اہتمام کیا گیا۔ ٹیچرس ٹریننگ کے ذریعے تقریباً 11 ہزار لڑکے، لڑکیوں کو سرکاری ملازمت حاصل ہوئی۔ مسلم طلبہ و طالبات کو ایم بی بی ایس میں داخلوں کی ٹریننگ کا سیاست نے اہتمام کیا جس کے نتیجے میں سیکڑوں طلبہ کو ایم بی بی ایس میں مفت نشست حاصل ہوئی۔ جناب ظہیر الدین علی خان نے شہر کے سلم علاقوں میں میڈیکل کیمپس کا اہتمام کیا اور غریب طلبہ و طالبات کو اسکالرشپ فراہم کی گئی۔ 4 لاکھ سے زائد طلبہ و طالبات کو سیاست ملت فنڈ سے اسکالرشپ جاری کی گئی۔ مسلم خاندانوں میں لڑکیوں کی شادی کے مسئلہ کو آسان بنانے کے لیے 2007 سے رشتوں کا دوبدو پروگرام شروع کیا گیا جس کے ذریعے ہزاروں لڑکیوں کے رشتے طے ہوئے۔ ان فلاحی سرگرمیوں میں فیض عام ٹرسٹ کا تعاون حاصل رہا۔ 2010 میں ادارہ سیاست نے مسلم لاوارث نعشوں کی تجہیز و تکفین کی غیر معمولی ذمے داری قبول کی جس میں جناب ظہیر الدین علی خان کا اہم رول رہا۔ ملت کے مختلف مسائل کی یکسوئی کے لیے مائناریٹی ڈیولپمنٹ فورم بھی جناب ظہیر الدین علی خان کی نگرانی میں چلایا جاتا رہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2023

پروفیسر غلام حسین

اجین / لکھنؤ: پروفیسر محمود الٰہی کے لائق شاگرد، مادھو کالج اجین کے صدر شعبہ اردو پروفیسر غلام حسین کا 14 اگست کو دن میں گیارہ بجے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین آبائی وطن ضلع بستی (یوپی) میں ہوئی۔ پروفیسر غلام حسین 19 فروری کو صوبہ اترپردیش کے موضع رنگریز پور، ضلع سدھارتھ نگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالہدیٰ گڑریہا، بلرامپور میں حاصل کی۔ بی این ڈگری کالج بستی سے بی اے کیا، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں گورکھپور یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ جز وقتی طور پر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں تین برسوں تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1994 میں ایم پی پبلک سروس کمیشن کے ذریعے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تقرر عمل میں آیا۔ پروفیسر غلام حسین نے اپنے استاد پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں خواجہ احمد عباس پر تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا یہ مقالہ 2003 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں انتخاب میر سوز، ادراک ادب، محمود ذکی: حیات و خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ زیرِ طبع کتابوں میں مالوہ میں اردو ادب اور عمیق حنفی ایک مطالعہ، اعتبارِ نظر، شجر سایہ داران کے نام شامل ہیں۔ ان کے تقریباً 40 سے زائد مضامین اردو کے مؤقر رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی نگرانی میں 20 طالب علموں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کو اترپردیش اردو اکیڈمی اور مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے اعزازات بھی مل چکے ہیں۔

پروفیسر غلام حسین نہایت سادہ مزاج تھے، عہدہ، دولت، اور شہرت کا غرور ان کے اندر دور دور تک نہیں تھا۔ جس احترام سے وہ اپنے بزرگوں سے ملتے تھے، اسی شفقت سے اپنے چھوٹوں سے بھی پیش آتے تھے۔ وہ سب کو یکساں عزت دیتے تھے۔ قاضی عدیل عباسی سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور ایک عرصے تک دورانِ تعلیم انھوں نے قاضی صاحب کے یہاں قیام بھی کیا۔ قاضی عدیل عباسی، غلام حسین کی علم دوستی اور ان کی ذہانت کے قائل تھے اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا بہت ترقی کرے گا۔ پروفیسر غلام حسین نے اپنے پیچھے ایک بھرا پُرا کنبہ چھوڑا ہے۔ ان کی شریکِ حیات کے علاوہ ڈاکٹر محمد ذاکر اور محمد نادر کے علاوہ بانو نامی ایک بیٹی ہے۔ انھوں نے اپنا رشتہ ہمیشہ اپنے وطن سے برقرار رکھا۔ اجین میں مستقل رہائش کے باوجود وہ ہر موقعے پر اپنے وطن آیا جایا کرتے تھے اور وطن کے لوگ ان کی شخصیت کی سادگی کے قائل تھے۔ مرحوم کے عزیز دوست ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر انفارمیشن حکومت اترپردیش، ادبی نشیمن لکھنؤ کے مدیر ڈاکٹر سلیم احمد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی، روزنامہ 'آگ' کے ایڈیٹر وصی اللہ حسینی وغیرہ نے ان کے انتقال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

* مرحوم کا ماہنامہ اردو دنیا سے بھی بہت گہرا لگاؤ تھا۔ اردو دنیا اگست 2023 کے شمارے میں ان کا مضمون 'سرزمین اجین سے اردو زبان و ادب کی بھینی بھینی خوشبو' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 15 اگست 2023 اور دیگر ذرائع سے

شبیر آصف

مالیگاؤں: صنعتی شہر کے مشہور معلم و شاعر شبیر آصف انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 76 برس تھی۔ یکم اگست کی صبح انتقال کی اطلاع عام ہوئی۔ اسی روز رات ساڑھے 9 بجے بڑا قبرستان میں انھیں سپرد خاک کردیا گیا۔ پسماندگان میں 5 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ اہلیہ کا انتقال 2 سال قبل ہوا تھا۔ مرحوم کے بڑے بیٹے ماسٹر راشد اختر اشرفی نے انقلاب کو بتایا کہ میرے والد کی پیدائش 30 جولائی 1947 کو شہر ناسک میں ہوئی۔ 20 سال ناسک میں رہنے کے بعد وہ مالیگاؤں منتقل ہوئے۔ یہیں سے معلمی کی سند حاصل کی اور 1968 میں میونسپل اردو اسکول سے وابستہ ہوئے۔ 2005 میں بطور ہیڈ ماسٹر خدمات انجام دیتے ہوئے سبکدوشی اختیار کی۔ معروف محقق و ناقد اور شبیر آصف کے شعری سفر پر مفصل روداد قلم بند کرنے والے ڈاکٹر مشاہد حسین رضوی نے کہا کہ شبیر صاحب کو عمر کی ابتدائی منزلوں سے ہی شعر و ادب سے شغف تھا۔ 1990 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'مٹی کے حوالے' منظرِ عام پر آیا۔ 2012 میں 'مسافر خواب لکھتا ہے' اور اسی سال ثلاثی مجموعہ 'یہ دیکھو میرے زخم ہیں' قارئین تک پہنچے۔ ان کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے مہاراشٹر ششو دھن منڈل پونے، بھترا فاؤنڈیشن ناسک، مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور ادارہ شامنامہ مالیگاؤں نے انھیں اعزازات تفویض کیے۔ شبیر آصف کی کتابیں غالب اور شکیب جلالی، کتاب نعت زیرِ ترتیب ہیں۔ اس سانحہ ارتحال پر شہر کے ادبی حلقے میں سوز و غم کا ماحول ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 2 اگست 2023

سمیرا حیدر

رائچور: کرناٹک کے شہر رائچور کے نامور افسانہ نگار سمیرا حیدر 23 جولائی کو وفات پاگئیں۔ ان کا اصل نام سیدہ نصرت فاطمہ، قلمی نام سمیرا حیدر تھا۔ 12 دسمبر 1962 کو کشتگی، رائچور کرناٹک میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام سید حسن رضی حیدر اور والدہ کا نام فاطمۃ الزہرا تھا۔ انھوں نے اردو میں ایم اے کیا۔ پہلی تخلیق بیدر میں 1978 میں شائع ہوئی۔ سمیرا حیدر اردو کی ایک اہم خاتون افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ کے ساتھ ساتھ آپ نے تنقیدی مضامین، تاریخی اور علمی نوعیت کے کئی مضامین و مقالات لکھے۔ ان کی تحریریں معروف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوچکی ہیں، جن میں شمع، بانو، شاعر، آجکل، سہ ماہی استعارہ، بزم ادب، اذکار اور سبق کے علاوہ منصف، اعتماد، سیاست، سہارا اور انقلاب جیسے مزید کئی مقامی اور بین الاقوامی اخبار قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے کئی افسانے پنجابی اور ہندی زبان میں ترجمہ ہوچکے ہیں۔ چند افسانے آکاشوانی ریڈیو سے نشر ہوئے، معروف ماہنامہ 'شاعر' نے اہتمام سے موصوفہ کی فکر و شخصیت پر گوشہ شائع کیا۔ آپ کرناٹک اردو اکادمی کی رکن بھی رہیں، کئی سمیناروں اور ادبی جلسوں میں شرکت کی، نیز بطور گیسٹ لیکچرر کئی علمی و ادبی اداروں میں مدعو کی گئیں۔ سمیرا حیدر کے پانچ افسانوی مجموعے گہن، خواب، کلیاں، قرمزی رشتے، ذرا ہٹ کے، دل مضطرب اور ریت کے پل زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر خوب داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ انھیں کرناٹک اردو اکادمی اور انجمن اردو گلبرگہ سے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ وہ معروف

شاعر سید محمد ناظم (ناظم لیلی) کی اہلیہ تھیں۔ سمیرا حیدر کے انتقال پر ملال پر جناب محمد اعظم شاہد، ڈاکٹر انیس صدیقی، ڈاکٹر فرزانہ فرح، ڈاکٹر چاند اکبر نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

سلمیٰ صنم بنگلور، گھومتا آئینہ اور دیگر ذرائع سے

عبدالحئی انصاری

ممبئی: روزنامہ انقلاب کے سابق سینئر رکن عبدالحئی انصاری کا طویل علالت کے بعد 15 جولائی کی شب 3 بج کر 27 منٹ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 62 سال تھی۔ 15 جولائی کو ہی ظہر کی نماز کے بعد ان کی تدفین اولیس قرنی قبرستان چارکوب ناکہ میں عمل میں آئی۔

نماز جنازہ مفتی محمد انصاری قاسمی نے پڑھائی۔ عبدالحئی انصاری کے پسماندگان میں بیوہ تین بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ تجہیز و تکفین میں اردو، ہندی اور مراٹھی اخبارات کے نمائندے، سابق اور موجودہ رفقائے انقلاب، علما، اساتذہ اور سماجی و سیاسی شخصیات موجود تھیں۔ عبدالحئی انصاری (جونپوری) منڈیاہوں کے رہنے والے مولوی محمد یعقوب کے فرزند تھے۔ وہ بہترین صلاحیت کے حامل مختلف خوبیوں کے مالک اور انتہائی خلیق و ملنسار انسان تھے۔ انھوں نے روزنامہ انقلاب میں 36 سال سے زائد عرصے تک خدمات انجام دیں۔ وہ ابتدا میں شعبۂ کتابت سے وابستہ ہوئے اور خطاطی کے شعبے میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ فن خطاطی میں زود نویسی اور عمدہ خط ان کی نمایاں شناخت تھی۔ اس کے بعد رپورٹنگ کے شعبے میں کئی برس تک خدمات انجام دیتے رہے۔ انقلاب سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انھوں نے خود کو کسی نہ کسی طرح مصروف رکھا اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاتے رہے۔ دریں اثنا عربی کے ماہر خطاطوں خلیق، الاسدی، محمود احمد شیخ اور غیاث الدین مظاہری کی رہنمائی اور ان کے ترغیب دلانے پر عبدالحئی انصاری نے قرآن کریم کی کتابت شروع کی اور متعدد ملاقاتوں کے دوران بتایا بلکہ دکھایا کہ وہ 18 ویں پارہ کی کتابت کر رہے ہیں لیکن شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسی دوران ان کو پیٹ کا مرض لاحق ہوا اور خوراک روز بروز کم ہوتی گئی۔ کچھ عرصے بعد طبی تشخیص میں پتہ چلا کہ آنت میں کینسر ہوگیا ہے اور وہ کافی پھیل گیا ہے۔ ماہر معالجین کی نگرانی میں اس موذی مرض کا علاج شروع ہوا اور کیموتھیراپی ہوتی رہی لیکن افاقہ نہیں ہوا بلکہ صحت گرتی گئی اور اس درجہ کمزوری بڑھ گئی کہ اٹھنا بیٹھنا محال ہوگیا، بالآخر وقت موعود آن پہنچا۔ عبدالحئی انصاری سیاسی و سماجی طور پر فعال شخصیت تھے۔ منترالیہ کی صحافیوں کی کمیٹی کے بھی رکن منتخب کیے گئے تھے۔ انھیں خوش نویسی کا ایوارڈ آنجہانی وزیر اعلیٰ شنکر راؤ چوہان کے ہاتھوں دیا گیا تھا جب کہ سابق وزیر اعلیٰ پرتھوی راج چوہان کے ہاتھوں صحافت کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ عبدالحئی انصاری ریاستی سطح کے ان ایوارڈس کے علاوہ دیگر اداروں کی جانب سے بھی کئی یوارڈس اور اعزازات سے نوازے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2023

سید یوسف روش

حیدرآباد: نامور شاعر و ادیب جناب سید یوسف روش ایم ٹیک ریٹائرڈ آفیسر آئی ڈی پی ایل ولد سید داؤد مرحوم کا 14 جولائی کو صبح 8 بجے بعمر 80 سال مختصر سی علالت کے بعد رہائش گاہ ملک پیٹ میں انتقال ہوگیا۔ ان کے کئی شاگرد تھے۔ انھوں نے اب تک 400 مشاعرے پڑھے۔ ان کی کئی اردو انجمنوں سے وابستگی تھی۔ 20 سے زیادہ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ انھیں بزم انوار ادب رائے بریلی کے نعتیہ مشاعرہ میں سندِ اعزاز دی گئی تھی اور دوسری کئی انجمنوں سے ابھی انعامات مل چکے تھے۔ حال ہی میں انھیں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی نے کارنامہ حیات ایوارڈ دیا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر میم قاف سلیم، حیدرآباد، 14 جولائی 2023

اختر ملتانی نجیب آبادی

نجیب آباد/ نورپور: نجیب آباد کی معروف شخصیت استاذ شاعر اختر ملتانی (80) کا مختصر علالت کے بعد 10 اگست کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم صوم وصلوۃ کے پابند و نیک انسان تھے۔ بعد نماز ظہر آبائی قبرستان نجیب آباد میں سپرد خاک کردیا گیا۔ مرحوم کا شعری مجموعہ کلام 'آبشار فکر و سخن' منظر عام پر آنے کے بعد بہت مقبول ہوا۔ مرحوم اختر ملتانی محمد الیاس ماہر منڈاوری کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال پر حلقہ نجیب آباد کے ممبر اسمبلی تسلیم احمد، چیئرمین نجیب آباد انجینئر معظم خاں سمیت دیگر شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اگست 2023

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل میں جشن آزادی

उर्दू दुनिया, मासिक, सितम्बर-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०९
URDU DUNIYA Monthly, September-2023, Vol.25, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/08/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6